طالبانائزیشن

افغانستان سے فاٹا، سوات اور پاکستان تک

عقیل یوسف زئی

طالبانائزیشن

افغانستان سے فاٹا،سوات اور پاکستان تک

8893

عقیل یوسف زئی

نگارشات

Talibanaozation Afganistan Say
Aqeel Yousaf Zai
0 000000385039
350.00 Rs

SAEED BOOK BANK
Leading Importers, Exporters, Distributors, Booksellers & Publishers of Pakistan
F-7 Jinnah Super Market, Islamabad-Pakistan.
Tel: 92-51-2651656-9, Fax: 92-51-2651660
E-mail : info@saeedbookbank.com
Web : www.saeedbookbank.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: طالبانائزیشن
مصنف: عقیل یوسف زئی
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
Ph:0092-42-37322892 Fax:37354205
مطبع: حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
سال اشاعت: 2012ء
قیمت: -/350 روپے

انتساب

سازشوں کا شکار

اپنی دھرتی کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کے نام

فہرست

● ..... کچھ اس کتاب کے بارے 7

● ..... سنگین خطرات کی نشاندہی کی بروقت کاوش 11

● ..... ایک رائے 18

● ..... خوف اور مصلحت سے بے پروا تحریر 22

● ..... مجھے شرمندگی ہے 25

● ..... ایک طویل سازش کا نتیجہ 29

باب 1: پاک افغان پالیسی اور انتہاپسندی 37

باب 2: عسکریت پسند گروپ اور اُن کی لیڈرشپ 59

● ..... حقانی گروپ 60

● ..... تحریک طالبان پاکستان (بیت اللہ محسود) 62

● ..... جنوبی وزیرستان 64

● ..... شمالی وزیرستان 64

● ..... مقامی طالبان تحریک (شمالی وزیرستان) 65

● ..... مہدی ملیشیا، حیدری طالبان 66

● ..... لشکر اسلام 67

● ..... انصار الاسلام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر 67

● ..... تحریک نفاذ شریعت محمدی ملاکنڈ ڈویژن 68

● ..... کشمیری گروپ 68

● ..... علمائے کرام کے نام پیغام 71

باب 3: ملک میں طالبان کی تعداد اور مخصوص علاقے 75

● ..... اورکزئی ایجنسی 79

●.....کرم ایجنسی	79
●.....خیبر ایجنسی	80
●.....مہمند ایجنسی	81
●.....باجوڑ ایجنسی	81
باب 4: قبائلی علاقوں میں موجود غیر ملکی تنظیمیں	83
باب 5: طالبان کے مالی اور دفاعی وسائل	89
باب 6: انتہاپسندی: ریاستی اور سیاسی قوتوں کی کوتاہیاں	97
باب 7: فاٹا کی پسماندگی...عسکریت پسندی کا بنیادی سبب	107
●.....فاٹا میں تعلیمی صورتحال	108
●.....وفاقی بجٹ میں فاٹا کے لیے مختص حصہ	110
●.....فاٹا میں روزگار کے مواقع	110
●.....فاٹا میں صحت کی صورتحال	111
●.....فاٹا میں انتظامی اور عدالتی نظام	111
●.....فاٹا کے عوام کی ملکی سیاسی نظام میں نمائندگی	111
باب 8: طالبان بمقابلہ اے این پی	119
باب 9: سرحد کے اضلاع میں طالبان نیٹ ورک اور اس کی کارروائیاں	127
●.....شانگلہ	132
●.....کوہاٹ	132
●.....ہنگو	133
●.....بنوں	133
●.....چترال	134
باب 10: افغانی اور پاکستانی طالبان کا تقابلی جائزہ	139

باب 11: فنون لطیفہ پر پابندیوں سے طالبانائزیشن کی ابتدا	151
باب 12: مذہبی انتہاپسندی اور جہادی میڈیا	157
باب 13: تشدد کے ماحول میں اے این پی کا عدم تشدد کا فلسفہ	167
باب 14: نیٹو سپلائی لائن پر حملے اور حکومت کی ناکامی	175
باب 15: سوات کا جنگی میدان اور تورا بورا گروپ	183
باب 16: پیوچار ٹریننگ کیمپ کا پس منظر اور کردار	193
باب 17: مولانا صوفی محمد سے مولانا فضل اللہ تک	201
باب 18: فورسز کی پالیسی اور آپریشن پر تحفظات کا اظہار	209
باب 19: 2008ء سوات کی تاریخ میں بدترین تباہی کا سال	217
باب 20: سوات امن معاہدہ اور پارلیمنٹ کی منظوری	221
باب 21: جو دینی جماعتیں بھی نہ کرسکیں وہ سیکولر پارٹیوں نے کردیا	233
● .....اعلان نامہ	238
باب 22: سابقہ امن معاہدوں کا انجام اور سوات ڈیل پر ردعمل	241
باب 23: افضل خان کے بارے اے این پی کا منفی رویہ	249
باب 24: امریکہ کی نئی افغان پالیسی اور پاکستان	257
باب 25: ڈرون حملے اور اہم افراد کی ہلاکتیں	269
باب 26: پاکستان کو میدان جنگ بنانے کی تیاری	277
باب 27: کاؤنٹر پالیسی۔اسباب، کردار اور نتائج	289

کچھ اس کتاب کے بارے

وسطی ایشیا میں موجود تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کے ساتھ معدنیات کے خزانہ پر قبضہ کرنے اور امریکی مفادات کو یقینی بنانے کے لیے سوویت یونین کے خلاف افغانستان کی زمین پر پاکستان کی غیرعلانیہ سرپرستی میں جس جنگ کا آغاز ہوا تھا اس نے بے شمار عسکری تنظیموں کو جنم دیا تھا جو نائن الیون کے جواز میں افغانستان پر امریکی قبضہ کے بعد لوٹ کر واپس آ گئیں اور اب یہی تنظیمیں ہیں جنھوں نے نہ صرف پاکستان، خطے اور دنیا کے لیے تشویشناک صورتحال پیدا کر دی ہے بلکہ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد کو اپنی انتہاپسند سرگرمیوں کا مرکز بناتے ہوئے اس علاقے کے علاوہ پاکستان کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگا دیے ہیں۔

پاکستان کی سات قبائلی ایجنسیاں جو براہ راست ابھی تک مرکز کے زیر کنٹرول ہیں ایک زمانہ تک سوویت یونین کے خلاف جنگ کا بیس کیمپ رہی ہیں۔ یہی وہ قبائلی علاقے تھے جہاں نہ صرف مقامی بلکہ غیرملکی "مجاہدین" کے لیے بھی محفوظ پناہ گاہیں اور تربیتی مراکز موجود تھے۔ مزید یہ کہ ان مجاہدین کو اس طویل جنگ میں مقامی ثقافتی اور تہذیبی رشتوں کا سہارا بھی مل چکا تھا۔ چنانچہ ایک نقطۂ نظر میں افغانستان پر امریکی قبضہ کے بعد ان مجاہدین کا جنھیں اب "دہشت گرد" قرار دیا جا چکا تھا اپنے بیس کیمپ کی طرف آنا فطری تھا۔ لیکن اب ان تنظیموں، جنگجو گروہوں نے صوبہ سرحد کے متعدد اضلاع خصوصاً بندوبستی اضلاع کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جبکہ ان کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی قوت و طاقت اور ممکنہ اہداف نے پاکستان کی ریاست، حکومت اور عوام کے علاوہ پورے خطے کو اندیشہ ہائے گوناگوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ فاٹا اور سوات میں طالبان کی مزاحمت، ان کے ممکنہ اہداف، کامیابیوں، فوجی

آپریشن کی ناکامی، غیر حقیقی سیاسی حکمت عملی کے باعث طالبانائزیشن کے کچھ اہم اور بنیادی نکات کو ریاستی اقدامات اور انتظامی امور میں شامل کیے جانے پر بہت سارے ایسے سوالات سامنے آ گئے ہیں جن کا جواب 1978ء سے لے کر 2008ء تک کے عرصہ میں علاقائی اور عالمی تناظر میں آنے والی تبدیلیوں اور ترجیحات کا سائنسی اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جس کے لیے ماضی کے اقدامات اور حال میں ابھرنے والے اثرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

طالبان کی تحریک کی ابتداء جنوبی افغانستان میں قندھار سے ہوئی تھی جو کوئٹہ اور چمن (بلوچستان) سے نزدیک ترین تھے چنانچہ فطری طور پر اس کا رخ بلوچستان یا پھر بلوچستان کے پشتون علاقوں کی طرف ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے اثرات اور عملی مظاہر قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد سے ہوتے ہوئے بند بستی علاقوں تک پھیل چکے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر تو یہ بھی ہے کہ چونکہ طالبان پشتون علاقوں میں موجود مکتبۂ دیوبند کے مدرسوں کے تعلیم یافتہ تھے اور ان کا زیادہ مضبوط رشتہ اس طرف تھا لہٰذا انہوں نے بھی اسی جانب رخ کیا۔ دوسرا یہ کہ یہی علاقے ''بیس کیمپ'' تھے اور یہاں ان کی جڑیں بھی موجود تھیں اس لیے ان کا اس طرف رخ کرنا جنگجویانہ حکمت عملی کا حصہ تھا۔ لیکن یہ خیال زمینی حقائق اور سائنسی تجزیہ کے مطابق صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں بلوچستان کو جہاں پہلے ہی قوم پرست تحریکیں مخصوص مقاصد کے لیے برسرِ پیکار تھیں محفوظ رکھنے کے لیے قبائلی علاقوں میں دھکیلا گیا تھا......جواب ''کامیابیوں کے جلو'' میں بلوچستان کی پشتون بیلٹ، جنوبی پنجاب، کشمیر اور سندھ کے بعض علاقوں کو اپنے اہداف بنانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

یہ صورتحال کس نے بنائی، کیوں بنائی، کون اس کا ذمہ دار ہے؟ سیاسی اور حکومتی ادارے کہاں غفلت کا شکار ہوئے؟ عالمی قوتوں کا کردار اور مقاصد کیا ہیں؟ پاکستان، صوبہ سرحد خصوصاً فاٹا میں کیا ہونے والا ہے......اس کتاب میں ان ایشوز کو دلائل، حقائق اور اعداد و شمار کی صورت میں اکٹھا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے ایک مکمل تصویر کا جائزہ لے سکیں اور انتہاپسندی کے اسباب سے لے کر مستقبل کے اہداف تک ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ ہو سکے۔ مختلف ابواب میں ان تمام ایشوز کو علیحدہ علیحدہ کیا گیا ہے تاکہ ان

سے عسکریت پسندی اور طالبانائزیشن کے پس منظر، وجوہات اور نتائج کو ممکنہ صورتحال میں زیادہ سے زیادہ سمجھا جا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ ٹھوس معلومات، رپورٹس اور تجزیوں کی بنیاد پر اس ایشو کو اکٹھا کرنے کو ممکن بنایا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ان سیاسی اور حکومتی غلطیوں کی بھی پہلی دفعہ تحریری نشاندہی کی گئی ہے جو اس سے پہلے نہیں ہوئی اگرچہ اس مختصر کتاب کا ہر موضوع الگ کتاب کا متقاضی ہے تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ مختصر مگر جامع انداز میں انتہا پسندی اور اس سے منسلک دیگر اہم ایشوز کو بھی ٹھوس بنیادوں پر زیر بحث لایا جائے تاکہ پڑھنے والے کو ان ایشوز سے متعلق تمام معلومات اکٹھی مل جائیں۔

اس موضوع اور ایشو پر اس سے قبل انگریزی، اردو اور پشتو زبان میں متعدد کتابیں مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس کتاب میں افغانستان کے طالبان کے بجائے پاکستان کے طالبان، ان کے نیٹ ورک، کارروائیوں اور اہداف کو فوکس کیا گیا ہے۔ موجودہ علاقائی اور عالمی تناظر میں اس ایشو کی اہمیت اور اس سے متعلق ضروری معلومات کو نظر انداز اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ اس ایشو میں پاکستان کے کروڑوں عوام کی نہ صرف دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے بلکہ ان کو اپنی قومی سلامتی کی فکر بھی لاحق ہو گئی ہے۔ دوسری تصانیف بہت بڑے صحافیوں، تجزیہ نگاروں اور ماہرین نے لکھی ہیں۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ سب غیر مقامی تھے بلکہ اکثر کا تعلق امریکا اور یورپ سے تھا۔ مقامی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کتاب میں معلومات کے علاوہ ایک کارکن صحافی کے ذاتی مشاہدے کے باعث شاید بعض اچھا مواد قارئین کو مل سکے۔

اس تناظر میں اپنے استاد اور معروف تجزیہ نگار جناب اکرم شیخ کا شکریہ ادا کرنا ناگزیر سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ مواد اکٹھا کرنے اور ان کو کتابی شکل دینے کی میری خواہش کی حوصلہ افزائی کر کے اس مشکل، پیچیدہ اور کسی حد تک خطرناک کام کو ممکن بنانے میں میری بھرپور رہنمائی اور معاونت کی۔

جناب اکرم شیخ نے نہ صرف مختلف ایشوز کے انتخاب کے دوران میری رہنمائی کی بلکہ انہوں نے مسودے کی تیاری کے بعد متعدد نقائص کی نشاندہی کرنے کے علاوہ بعض اہم

ایشوز کی معلومات میں اپنے طور پر اضافہ کر کے میری کمزوریوں اور کم علمی پر پردہ ڈال دیا۔ انہوں نے ایشوز کے انتخاب، نامکمل معلومات کی تکمیل، ابواب کی ترتیب اور گرامر کی تصیح کے علاوہ اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ یہ کتاب نگارشات جیسے معتبر ادارے کے پلیٹ فارم سے شائع ہو۔ مجھے واقعتاً خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یہ کتاب نگارشات کے ذریعے قارئین تک پہنچے گی۔ اس سلسلے میں میں اس معتبر ادارے کی انتظامیہ کا اس لیے شکرگزار ہوں کہ اس ادارے کی شہرت اور مؤثر نیٹ ورک کے ذریعے مجھ جیسے نووارد کی اس کاوش کو پذیرائی مل جائے گی اور یہ بہت سے قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

اس کتاب میں یقیناً بہت غلطیاں اور کمزوریاں ہوں گی کیونکہ اتنے اہم ایشو کے ساتھ انصاف کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کی بنیادی وجہ میری ناتجربہ کاری کے علاوہ وہ پیچیدگیاں ہیں جو کہ دہشت گردی، انتہاپسندی اور طالبانائزیشن کے علاوہ عالمی اور علاقائی کرداروں کی دوغلی پالیسیوں کے باعث ایک بڑے مسئلے کی صورت اختیار کرگئی ہیں۔ اس کے باوجود اہم معاملات کو کسی نہ کسی حد تک قارئین کے سامنے لانے کی کوشش سے یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ ان کو کتاب پڑھنے کے بعد زیادہ مایوسی نہیں ہوگی۔

جناب اکرم شیخ اور نگارشات کی انتظامیہ کے علاوہ میں اس کاوش کے سلسلے میں جن دوسرے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ان میں پشاور کے نامور صحافی سلیم صافی، ناصر داوڑ اور فریداللہ خان کے علاوہ لاہور کے محقق صفدر سیال، ڈچ پریس ایجنسی (ڈی پی اے) کے کنٹری بیورو چیف ندیم سرور اور میری شریک حیات شاذمہ شامل ہیں۔ صحافی دوستوں نے معلومات کی فراہمی میں معاونت کی جبکہ میری اہلیہ نے دو ماہ تک مجھے دوسرے معاملات کی ذمہ داریوں سے مبرا رکھ کر مجھے پرسکون ماحول فراہم کیا۔

عقیل یوسف زئی۔ پشاور

سنگین خطرات کی نشاندہی کی بروقت کاوش

پاکستان میں جاری انتہاپسندی اور سیاسی بے چینی کا افغانستان کے حالات سے براہ راست تعلق رہا ہے۔ ہماری سیاسی، عسکری قیادت اور دانشوروں نے ہر دور میں افغانستان کی محض اس بنیاد پر مخالفت کی کہ افغانستان نے قیام پاکستان کے بعد اقوام متحدہ میں اس کی رکنیت کی مزاحمت کی تھی۔ ہم نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ افغانستان نے کن خدشات کو بنیاد بنا کر یہ طرز عمل اختیار کیا تھا؟ قیام پاکستان کے لیے ہونے والی جدوجہد کے دوران مسلم قیادت نے دوسری قوتوں سے تو قریبی روابط رکھ کر ان کو اعتماد میں لینے کی پالیسی اپنائی مگر انہوں نے افغانستان جیسے اس قریبی ملک پر کوئی توجہ نہیں دی جو نہ صرف ہمارا پڑوسی تھا بلکہ سرحد کے دونوں جانب کروڑوں پشتونوں کی موجودگی کے تناظر میں اس کی اہمیت اور کردار کو بھی نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس ضمن میں میری ذاتی رائے میں قائداعظم محمد علی جناح، خان عبدالغفار خان اور دوسرے مسلم لیڈروں نے افغان قیادت کو اعتماد میں لینے کی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی جس کے باعث افغانستان میں اس نئی ریاست کے بارے میں اس کے قیام سے قبل ہی شکوک و شبہات پیدا ہوگئے ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ پاکستان نے ابتداء ہی سے افغانستان کے بارے میں منفی اور یکطرفہ رویہ اپنا کر اس کی آزاد حیثیت اور مقام کو کبھی دل سے تسلیم ہی نہیں کیا حالانکہ افغانستان نہ صرف ایک اہم ترین ملک تھا بلکہ روس کا پڑوسی ہونے کی وجہ سے اس کو عالمی سطح پر ایک اہم جغرافیائی اور سیاسی مقام بھی حاصل تھا۔ انگریزوں نے نئی ریاست

افغانستان کے درمیان جان بوجھ کر بعض معاملات ایسے چھوڑے تھے جن سے دونوں ممالک کے درمیان مستقبل میں محاذ آرائی کا راستہ ہموار ہوسکتا تھا۔ اس ضمن میں سرحد کے دونوں اطراف قیام پذیر پشتونوں کو چار حصوں میں تقسیم کیے رکھنا اور قبائلی علاقہ جات کے بفرزون کے سٹیٹس کو برقرار رکھنا سرفہرست تھا۔ یہ دو ایسے ایشوز تھے جن سے انگریز اور اس کے بعد امریکہ کے مستقبل کے بعض بنیادی مفادات وابستہ تھے۔ قبائلی علاقہ جات میں انگریز کے رائج کردہ نظام کو برقرار رکھنا ہی قبائل کی پسماندگی کا بڑا سبب بن گیا چنانچہ اس عمل کے باعث محض پاکستان کے مراعات یافتہ قبائلی ملکان ہی کو مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرکے عوام اور ریاستی اداروں کے درمیان اعتماد اور رابطے کا ماحول بری طرح متاثر ہوکر رہ گیا۔ اعتماد کے اس فقدان نے بعدازاں پاکستان اور 75 لاکھ قبائلی عوام کو ایک دوسرے سے دور کرکے ان قوتوں کے داخلے کو آسان بنایا جو قبائل کی اسلام پسندی کو ذہن میں رکھ کر اپنے مقاصد کے لیے ان کی سرزمین کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ افغانستان میں روسی مداخلت کے وقت ان قبائلی عوام کی متوقع مزاحمت ہی کا سبب تھا کہ روس نے پاکستان کے اندر گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر قبائل کی رکاوٹ اور ان کے علاقوں کی جغرافیائی ساخت درمیان میں حائل نہ ہوتی تو پاکستان میں روس کا داخلہ یقینی تھا۔ افسوس کہ پاکستان، امریکہ اور دوسرے روس مخالف ممالک نے قبائل کی اس اہمیت، کردار، مزاحمت اور قربانی کا نہ تو اعتراف کیا اور نہ ہی روس کی واپسی کے بعد پشتونوں خصوصاً قبائل کے حالات زندگی بہتر بنانے پر کوئی توجہ دی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو استعمال کرکے اس بفرزون کے سٹیٹس سے بھرپور فائدہ اٹھا کر برسوں قبل کی اپنی پالیسی اور پلاننگ کو درست تو ثابت کیا تاہم اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اگر افغانستان اور پاکستان کے پشتونوں کے حقوق اور وسائل کو نظرانداز کرنے کی پالیسی برقرار رکھی گئی تو اس سے نہ صرف یہ کہ پاکستان ایک خطرناک بحران سے دوچار ہوگا بلکہ علاقے میں امریکی مفادات بھی خطرے میں پڑ جائیں گے۔ آج امریکہ اور پاکستان سمیت اس کے دوسرے اتحادی اپنی اسی غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور مستقبل کا منظرنامہ بہت سے خطرناک امکانات کی عکاسی کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ ان خطرناک امکانات میں پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں میں تبدیلی کا خطرہ بھی موجود ہے۔ اگر پاکستان نے افغانستان کو ایک آزاد

۔اور خودمختار ریاست تسلیم کرتے ہوئے اس کے ساتھ برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار کیے ہوتے تو آج یہ خطہ تباہی سے دوچار ہونے کے بجائے ایک ترقی یافتہ علاقے کا نقشہ پیش کر رہا ہوتا۔ ہم نے روس اور افغانستان کی دشمنی میں برطانیہ اور امریکہ کے مفادات کا تحفظ کر کے اپنی سلامتی اور خودداری خود ہی داؤ پر لگانے کی پالیسیاں بنائیں۔

میں ذاتی طور پر اس مؤقف کا مخالف ہوں کہ دونوں جانب کے پشتونوں کو قریب لانے کے بجائے ایک دوسرے سے دور کیا گیا حالانکہ پنجابی اشرافیہ نے پنجاب کی سرائیکی قومیت کو محض اس وجہ سے اپنے قریب رکھا کہ ان کی قربت سے اشرافیہ کے اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ دونوں قوموں میں کوئی چیز مشترک نہ تھی۔ آج اگر افغانستان کے شمال میں پاکستان کی مخالفت کا ایک بڑا عنصر موجود ہے تو اس کی ذمہ داری بھی ہمارے حکمرانوں اور ریاستی اداروں پر عائد ہوتی ہے۔ ہم نے افغان جہاد کے دوران شمال کے لیڈروں خصوصاً پروفیسر ربانی اور احمد شاہ مسعود کو اپنے رویے کے باعث اپنے ہی ہاتھوں خود سے دور کیا۔ آج پاکستان کی تقسیم کی جو سازشیں کی جارہی ہیں ماضی میں یہ پالیسی امریکہ نے افغانستان میں بھی چلائی تاہم گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود ہی وہ لیڈر تھے جنہوں نے اس سازش کو ناکام بنایا۔ دونوں ممالک کے توڑنے کا پلان امریکہ کی پالیسی کی ترجیحات میں نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کے امکانات بھی موجود ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ دونوں ممالک کی قیادت کو اس صورتحال کا نہ تو کوئی احساس ہے اور نہ ہی امریکہ سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

میں نے بےنظیر بھٹو شہید کے دور حکومت میں افغان قیادت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کے خاتمے اور مصالحت کے لیے بذات خود ایک کوشش کی تھی۔ تاہم مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میری یہ کوشش پاکستانی پالیسی سازوں کے رویے کے باعث ناکامی سے دوچار ہوئی۔ یہ مجاہدین کے کابل میں داخلے کے بعد کی بات ہے۔ بےنظیر بھٹو شہید نے گلبدین حکمت یار اور دوسرے لیڈروں سے بات چیت کے لیے اپنے وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی کے بجائے قاضی حسین احمد کو افغانستان بھیجنے کا پلان بنایا تھا۔ جس کا ہمارے وزیر خارجہ کو بہت دکھ تھا۔ میں نے بی بی سے رابطہ کر کے ان پر زور دیا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں

میں نے ان کو بتایا کہ میں نہ صرف ذاتی تعلق کی بنیاد پر افغان لیڈرشپ سے خود بات کروں گا بلکہ سردار آصف احمد علی کے دورے کی کامیابی کی ضمانت بھی دیتا ہوں۔ اس ضمن میں جب میں نے گلبدین حکمت یار سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے کہا کہ پاکستانی وزیرخارجہ نے ان کو دہشت گرد کہہ کر اپنی آمد یا رابطے کا امکان ہی ختم کر دیا ہے۔ اس کے باوجود میرے اصرار پر وہ معاملات سلجھانے کے لیے سردار آصف کے دورے کے لیے تیار ہو گئے جبکہ احمد شاہ مسعود نے بھی ہمارے ارادے کا خیرمقدم کیا۔ ہم نے دورے کی تاریخ رکھی تاہم اسلام آباد چھوڑنے کے شیڈول سے چند گھنٹے قبل سردار آصف احمد علی نے کابل کا دورہ کرنے سے انکار کر کے مؤقف اپنایا کہ وہ افغانستان میں جاری جنگ کے باعث اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ اس طرزعمل نے مجھے افغان لیڈرشپ کے سامنے شرمندہ ہونے کے علاوہ پاکستان کے رویہ سے بھی بہت مایوس کیا۔ مجھے ان لوگوں کے نام بھی معلوم ہیں جنہوں نے اس دورے کے خلاف سازش کی۔ اس ایک واقعہ سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ افغانستان کی سیاسی قیادت نے ہمیشہ مثبت اور ہمارے اداروں نے منفی کردار ادا کیا اور یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہا۔

ریاستی اداروں کے علاوہ پاکستان کی سیاسی قیادت نے بھی اس سلسلے میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ خان عبدالولی خان وہ لیڈر تھے جنہوں نے برسوں قبل آج کی صورتحال کی نشاندہی کی تھی۔ مگر انہوں نے اپنے کردار کو محض نشاندہی کی حد تک محدود رکھا۔ وہ اگر چاہتے تو دونوں ممالک کو قریب لانے اور پشتونوں کے اتحاد کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کر سکتے تھے۔ اے این پی کی قیادت نے افغان جنگ کے دوران اپنے ہم خیال افغان بھائیوں کا بھی وہ خیال نہیں کیا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ جبکہ افغانوں نے اس پارٹی اور باچاخان کی فیملی کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھ کر اس خاندان کا بہت خیال رکھا تھا۔

امریکہ اور پاکستان کی افغان دشمن پالیسی اب ان ممالک کے لیے گلے کا پھندا ثابت ہو رہی ہے۔ افغانستان سے امریکہ مخالف قوتوں کا سلسلہ فاٹا تک اور فاٹا سے صوبہ سرحد سے ہوتے ہوئے پورے پاکستان تک پھیلنے کا خطرہ اب حقیقت کی صورت اختیار کر گیا ہے اور اگر پنجاب کی سیاسی لیڈرشپ، بیوروکریسی اور دانشوروں نے اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے افغانستان اور کروڑوں پشتونوں کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظرثانی کر کے بنیادی

تبدیلیاں نہیں کیں تو اس کے جو خطرناک نتائج برآمد ہوں گے ان کی ذمہ داری انہی قوتوں پر عائد ہوگی۔ یہ محض مفروضہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ سرحدیں کبھی مستقل نہیں رہتیں ہمیں تو بدقسمتی سے ماضی میں بنگلہ دیش کی شکل میں عملاً اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔

قبائل کے بارے میں میری رائے اور معلومات کا حاصل یہ ہے کہ امریکہ نے روس، چین اور ایران پر دباؤ بڑھانے اور سنٹرل ایشین تک اپنی رسائی کو یقینی بنانے کے لیے قبائلی خطے کو اپنے مستقل اڈے میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کے ہر ممکن آپشن پر عمل کر کے آگے بڑھ رہا ہے۔

پاکستان میں جاری کشیدگی اور دہشت گردی کو اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ افغانستان میں امریکہ کے خلاف جاری مزاحمت کے باعث امریکہ کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ قبائلی خطے کو اپنا اگلا ہدف کے طور پر یقینی بنانے کی کوشش کرے اور اگر پاکستان نے پشتونوں خصوصاً قبائل کو اعتماد میں لے کر افغانستان کے ساتھ بھی اپنے تعلقات بہتر نہیں بنائے تو امریکہ کے لیے اپنا یہ منصوبہ مکمل کرنا یقینی ہوجائے گا۔ میں متعدد سیاسی اور حکومتی شخصیات کو مشورہ دیتا آیا ہوں کہ وہ قبائل کو قومی دھارے میں شامل کر کے سات قبائلی ایجنسیوں پر مشتمل الگ صوبے کے قیام کو ممکن بنائیں۔ ایسا کرنے سے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا دفاعی نظام مضبوط ہوجائے گا بلکہ ان عناصر کی بھی حوصلہ شکنی ممکن ہو سکے گی جو اپنے اپنے ایجنڈوں کی تکمیل کے لیے طالبانائزیشن کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی محرومیوں کی آڑ میں قبائلی عوام اور پشتونوں کی ایک بڑی اکثریت کی ہمدردیاں حاصل کر کے پاکستان کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اسفندیار ولی، محمود خان اچکزئی، قاضی حسین احمد، عمران خان، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا سمیع الحق اور دوسرے پشتون لیڈروں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس نازک موڑ پر اپنے اختلافات بھلا کر خطے میں امن اور استحکام لانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں ورنہ یہ خطہ ایک بڑے خطرے سے دوچار ہوجائے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ عقیل یوسف زئی نے اپنی اس کتاب میں ان تمام اسباب کو بہت جامع انداز میں قلمبند کر کے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے جو کہ خطے میں انتہاپسندی کا باعث

بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے غیر جانبداری سے سیاسی قیادت، ریاستی اداروں اور بعض گروپوں کے علاوہ عالمی کرداروں کے عزائم اور اہداف کو بھی بڑی حد تک واضح کر دیا ہے۔ یقیناً بہت سے لوگ اس کتاب کے بعد ممکنہ ردعمل کے طور پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے دکھائی دیں گے۔ اسی لیے کچھ عرصہ قبل جب انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ پاکستانی طالبان، ان کی آئیڈیالوجی، اہداف اور کارروائیوں پر مشتمل مواد ایک کتابی شکل میں تحریر کرنا چاہتے ہیں تو میں نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ بہت سی چیزیں واضح نہیں ہیں اور بہت سی چیزوں کے نتائج آنا ابھی باقی ہے اس لیے وہ فی الحال انتظار کریں تاہم وہ دلیل دے رہے تھے کہ اس موضوع پر نہ صرف اس کے پاس تحقیق کی بنیاد پر بہت سا مواد موجود ہے بلکہ وہ اس کتاب کی اشاعت کو سیاسی بے چینی، عدم استحکام اور خوف کے شکار قارئین، سیاستدانوں اور قلمکاروں کے لیے بھی کسی نہ کسی حد تک ضروری سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جن ایشوز پر کام کیا ہے ان پر پوری دنیا کی نظریں ہیں۔ بے شمار لوگ ان معاملات پر لکھتے آئے ہیں اور لکھ بھی رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عقیل یوسف زئی دوسروں کے برعکس اہم واقعات، فیصلوں، سازشوں، غلطیوں اور ناکامیوں کے عینی شاہد بھی ہیں۔ وہ چونکہ پندرہ سال سے جرنلزم کے ساتھ وابستہ ہیں اس لیے بہت سے واقعات سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ وہ تجزیے اور تبصرے کے اہل بھی رہے ہیں۔

جن موضوعات پر انہوں نے لکھا ہے وہ حساس بھی ہیں، توجہ طلب بھی اور خطرناک بھی۔ اس کے باوجود ان موضوعات سے متعلق معلومات کی اہمیت کو نہ تو نظرانداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اصل حقائق اور اسباب پر مزید چشم پوشی اختیار کی جا سکتی ہے۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے طالبان یا ایسی دوسری قوتوں پر ابھی تک غیر جانبدارانہ طریقے سے اس سطح کا کام نہیں ہوا۔ جس کی ضرورت تھی۔ تجزیہ نگار یا تو طالبان کی مخالفت کرتے ہیں یا ان کی حمایت۔ عقیل یوسف زئی نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی فریق کے ساتھ بے انصافی ہو نہ ہی کسی کی حق تلفی یا کردارکشی ہو۔ وہ معلومات، حقائق اور واقعات کی بنیاد پر مختلف قوتوں کے درمیان مفاہمت یا مزاحمت کے اسباب کو سامنے لانے کی کوشش میں ہیں۔ انہوں نے عالمی اور علاقائی طاقتوں اور کرداروں کو بھی ممکنہ حد تک موضوع بحث بناتے

ہوئے ان کے مقاصد اور اہداف کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عقیل یوسف زئی کی یہ کاوش اس اہم ایشو پر بہت سے سوالات کے جواب دینے کا سبب بنے گی۔

یہ کتاب ان لوگوں کے لیے یقیناً معلومات اور دلچسپی کی حامل ہوگی جو دوسرے شہروں یا ملکوں میں بیٹھ کر افغانستان، فاٹا، صوبہ سرحد، مزاحمتی گروپوں، سیاسی عدم استحکام اور عوامی محرومیوں پر ذاتی مشاہدے کی ضرورت سے محروم ہوتے ہوئے ان ایشوز پر لکھتے آئے ہیں یا لکھ رہے ہیں۔ امید ہے اس کتاب سے بہت سے لوگوں کی معلومات میں نیا اضافہ ہوگا۔

رحمت شاہ آفریدی

ایڈیٹر انچیف روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ، فرنٹیئر پبلی کیشنز

ایک رائے

انسانی حقوق کی جنگ لڑنے کی عالمی شہرت رکھنے والے ممالک نے اپنی ضروریات کی پروردہ دانش کے نتیجے میں تیار ہونے والی یک رخی پالیسیوں سے عسکریت اور انتہاپسندی کو ایک سیاسی نظریہ بنا دیا ہے۔ سو اس نظریے نے انسانی حقوق کی ترکیب کو ایک لطیفہ یا ٹھٹھا بنا دیا ہے۔ ہم ان حقوق کی فہرست کیا گنوائیں جو دہشت گردی کے خلاف اس اندھی اور بہری جنگ کی نذر ہو گئے ہیں۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اس جنگ کے دوسرے میدان یعنی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے میں رہنے والوں کا جینا اب ان کا استحقاق نہیں رہا بلکہ اسے عسکریت پسندوں، طالبان یا انتہا پسندوں کی ایک بخشش یا دین ہی سمجھا جائے کہ وہ جب چاہیں ریاست کو ناکام بنانے کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ سو اس جنگ نے صرف عام آدمی کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس جنگ میں شامل عام ریاستوں کی استعداد کو بھی بے پردہ و بے ستر کر دیا ہے۔

پاکستان میں طالبانائزیشن کا عمل کسی نہ کسی شکل میں دراصل اسی روز شروع ہو گیا تھا جب ریاست نے سیاسی انتہاپسندی کو قانون کا درجہ دے کر اپنی مخالفت کو کسی جمہوری عنصر کے طور پر تسلیم کرنے کے بجائے مخالفین کو غدار اور کافر کہنے کا انتخاب کیا۔ اگر پاکستان کے قیام کے ابتدائی ڈیڑھ ماہ میں خدائی خدمت گاروں کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ نہ کیا جاتا اور مخالفین کو کچل دینے کی پالیسی نہ اپنائی جاتی تو انتہاپسندی جو طالبانیت کی جڑ ہے کبھی ریاست پر حاوی نہ ہوتی۔ متاسفاً جب بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بانیان پاکستان کے اس رویے

اور پاکستان کے شروع دنوں کی اس مثال پر غور کیا تو انہیں پروڈا اور ایبڈو کے ''قوانین'' جاری کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔ پاکستان کا المیہ یہ رہا کہ یہاں ابتدائی دنوں سے ہی انتہاپسندی ریاستی فیصلوں پر غالب آ گئی، نمائندہ حکومتوں اور نمائندہ آئین کی عدم موجودگی نے اہم ترین فیصلوں کا اختیار چند ہاتھوں میں مرتکز کر دیا۔ اور پھر انتہاپسندی پوری قوت اور سرعت سے ریاستی پالیسیوں کا حصہ بن گئی۔ ون یونٹ کا قیام، 1956ء کا دستور (دستور؟) پہلا مارشل لا، 1962ء کا آئین (آئین؟) صدارتی انتخاب اور پاکستان ٹوٹنے کا سانحہ انتہاپسندی اور فسطائیت نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی کو کون اعتدال کا مفہوم پہنا سکتا ہے؟ افسوس کہ اس عمل میں عدلیہ نے ریاست کی وہ بے مثال سرپرستی کی کہ جس سے المیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، سپریم کورٹ نے نیپ اور خدائی خدمت گاروں پر ریاستی الزامات کی تصدیق کرتے ہوئے پابندی لگائی اور حیدرآباد میں ایک ''جمہوری'' دور میں ان ''غداروں'' پر بند کمرے میں مقدمہ آغاز ہوا، میڈیا تو پہلے ہی ایوبی دور کی بربریت کا شکار ہو کر پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کی سولی پر لٹکا ہوا تھا، پاکستان کے الیکشن کمیشن کی مہارت تامہ 1977ء کے انتخابات میں کھل کر سامنے آئی اور پاکستان کے عوام کو اخبارات کے ذریعے یہ خبر بھی ملی کہ ''قائد عوام کو بلا مقابلہ منتخب کر لیا گیا'' اور پھر ان تمام انتہاپسندیوں کا ظہور 5 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق کی شکل میں ہو گیا۔ اور ہمیں یہ لکھتے ہوئے کسی تردید کا خوف نہیں کہ اگرچہ اس سیاہ دور کی تاریکی جمہوریت کی ادھ کھلی کلی کی شکل میں ایک مدہم سی روشنی میں آج تبدیل ہو چکی ہے مگر دو باتوں کا ابد تک علاج نہیں ہو سکتا پہلا المیہ تو صحافیوں کا ہے کہ اہل صحافت کے دل سے اب بھی اس دور کی انتہاپسندی کا پیدا کردہ خوف خارج نہیں ہوا اب بھی صحافی مذہبی موضوعات اور مذہب سے متعلق قوانین اور قانون سازی پر لکھتے ہوئے تحریری لکنت کے دوروں کا شکار ہو جاتے ہیں اور دوسرا المیہ یہی ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ یعنی مذہب کے نام پر خون!!!

برادرم عقیل یوسف زئی نے جن موضوعات میں اس کتاب کی تقسیم کی ہے اسے مسئلے کے سمجھنے کے لیے مددگار سمجھا جا سکتا ہے جن ابواب سے ہمیں آگاہ کیا گیا ہے وہ باقاعدہ ایک صف در صف یا پرت در پرت ترتیب فراہم کرتے ہیں، اچھا خاصا اندازہ ہوتا ہے کہ اس

مسئلے کی ابتدا سے ہی اس اہم موضوع کو برتنے کی کوشش کی گئی ہے اور ملاکنڈ کے امن معاہدے اور نظام عدل ریگولیشنز تک کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے کردار کے حوالے سے بھی تفصیل اس کتاب کا حصہ ہے، میڈیا کا کردار اور پاکستان کی افغان پالیسی سے جنم لینے والی خرابیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت پختون صوبے کی حکمران جماعت عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کے رویے اور پالیسی اور خان لالہ خان محمد افضل خان کے بارے میں بھی مصنف کی ذاتی رائے اس کتاب میں شامل ہے۔ اے این پی نے اپنے طور پر سوات اور ملاکنڈ کی بے سکونی کے خاتمے کے لیے کیا کیا ہے اس پر کسی اختلافی رائے کے مدلل جواب کے لیے مخالفانہ دلائل کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اے این پی نے نظام عدل کے نام پر شریعت کا مطالبہ کرنے والوں کو کوئی دھوکہ نہیں دیا پہلے سے موجود عدالتی نظام کا کوئی نیا نام رکھ کر کوئی فریب نہیں دیا بلکہ تحریک شریعت کے رہنماؤں کے ساتھ مل کر ایسے نظام قانون و عدل کی بنیاد رکھی جس نے شورش زدہ علاقے میں امن کی روح پھونکنے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک تو اس معاہدے پر ہر فریق ایک دوسرے سے زیادہ خوش ہے اور مطمئن بھی۔ سوات اور ملاکنڈ کے عوام امن کی ہر قیمت ادا کرنے پر راضی ہیں۔ سو اس قانون نے جو قانون سے بڑھ کر قیام امن کی ضمانت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے عمومی قبولیت بھی حاصل کر لی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان کی قومی اسمبلی نے اس نظام عدل ریگولیشن کی منظوری دے کر اس کی نمائندہ حیثیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اور ہمارے کتاب کے مصنف کو تو یہ معلوم ہی ہونا چاہیے کہ مزاحمت والی کیفیت صوبائی حکومت کو شدت سے سوات ہی میں درپیش ہے۔ دیگر جن اضلاع کی بات کی گئی ہے وہاں ایسی حالت نہیں اور نہ ہی وہاں ان سطور کے لکھنے تک طالبان نے عدالتی نظام کی اصلاح یا نظام عدل کے نفاذ کی کوئی بات کی ہے۔ سوات میں طالبان کا اس نظام عدل کے نفاذ پر اطمینان اور مسرت سیز فائر کا اعلان وغیرہ اس بات کی تصدیق بھی کرتے ہیں کہ سوات کے طالبان اور ملک کے دیگر حصوں کے طالبان کے ایجنڈوں میں مماثلت نہیں۔

اس کتاب کی اشاعت تحقیق کے نئے در وا کرے گی۔ تاہم سول بیوروکریسی کو نظرانداز کیا گیا ہے حالانکہ ان کے کردار کے حوالے سے تحقیق بھی اس کتاب کا حصہ ہونا

چاہیے تھا۔ زیادہ ضرورت اس امر کی تھی کہ مذہبی جماعتوں کو بحیثیت ایک علیحدہ باب اور طالبانائزیشن اور انتہاپسندانہ رویوں کی پرداخت میں ان کے کردار پر مفصل بحث کی جاتی مگر اس جانب بھی توجہ نظر نہیں آئی۔

مجموعی طور پر موضوع کی بیباکی اور اس پر سوات اور پشاور کے ایک صحافی کا قلم اٹھانا تحسین لازم کا حقدار ہے۔ خدا کرے کہ یہ کتاب اس پورے قضیے کی تشریح میں ممد ثابت ہو۔

زلان مومند

روزنامہ ''آج''۔ پشاور

خوف اور مصلحت سے بے پروا تحریر

ہمارے صوبے کے پشتون صحافیوں میں جنہوں نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتداء ہی سے اردو میں نام بنایا اور ان کو باقاعدگی اور دلچسپی سے پڑھا جاتا رہا، عقیل یوسف زئی اپنے منفرد انداز، جرأت، بے باکی اور لسانی اسلوب کے حوالے سے ان میں سرفہرست ہیں۔ ویسے تو اس صوبے میں متعدد دوسرے کالم نگار اور صحافی بھی موجود ہیں تاہم میں بطور قاری عقیل یوسف زئی اور ان کے ہم عصر دوست سلیم صافی کو باقاعدگی سے پڑھتا آیا ہوں۔ دونوں ایک جیسی جرأت، قلمی کاٹ اور تیزی کے حامل ہیں اور یہی چیزیں ان دونوں کو کم عمری کے باوجود دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

عقیل یوسف زئی کا سیاسی وژن بالکل واضح ہے۔ ایک معروف صحافی کی حیثیت سے وہ اس خطے کے بہت سے معتبر سیاسی لیڈروں اور حکمرانوں کے کافی قریب رہے ہیں۔ وہ ان کے بارے میں کسی کو خاطر میں لائے بغیر بہت کچھ کہتا اور لکھتا رہا ہے جو کہ ان کی ایک اور انفرادیت سمجھی جاسکتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ان کی اپنی رائے، معلومات اور صحافتی، سیاسی وژن کے اظہار کو کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے وہ کبھی کبھی جانبدار بھی بن جاتے ہیں تاہم یہ جانبداری معلومات اور دلائل کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ان کی بعض تحریریں پڑھنے کے بعد قاری اس دعوے کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے۔''

حالات حاضرہ کا تجزیہ کرنے، اس کا پس منظر بتانے اور مستقبل کے حالات کی نشاندہی کرنے میں عقیل یوسف زئی کو کمال کی مہارت حاصل ہے۔ وہ واضح اور جرأتمندانہ

انداز میں اپنی تحریروں کے ذریعے پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں اترنے اور الگ جگہ بنانے کا گر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال، سیاسی، جغرافیائی اور سماجی مسائل، تبدیلیوں کے ادراک، مہذب طنز کے بروقت استعمال، سیاسی، عالمی اور علاقائی تناظر میں اٹھنے والی شورشوں، مستقبل کی پیشگوئی کرنے اور بہت کچھ جانچنے جیسی قلمی اور علمی صلاحیتیں عقیل میں موجود ہیں۔ میری ذاتی رائے میں ان خصوصیات کے ب: مانہ طالب علمی میں سیاسی تنظیموں، کتابوں اور اخبارات کے ساتھ ان کی مسلسل وابستگی کارفر ہے۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی معروف صحافی کو تجزیہ نگاری یا مضمون نگاری کے مواقع بھی مل جائیں۔ عقیل کو یہ مواقع ملتے رہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بہت کچھ لکھ کر ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر الگ شناخت بناتے گئے۔ ان کی کالم نگاری میں جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ ان کی معلومات اور سیاسی بصیرت ہے۔ وہ ذاتی زندگی اور گفتگو میں بھی ایسے ہی خیالات جذبات اور دلائل کا کسی خوف یا مصلحت کے بغیر اظہار کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر بعض تلخیوں اور اختلاف رائے کے باوجود پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں جگہ بنالیتی ہے۔ وہ سیاست، سیاسی تاریخ، ثقافت اور حالات حاضرہ پر بہت اچھا لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی طرح میں ان کو مختلف اخبارات میں پڑھتا بھی رہا ہوں اور ان کو اپنے میگزین ''لیکوال'' میں چھاپتا بھی رہا ہوں۔ وہ اس بات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کی تحریروں کا ردعمل کیا ہوگا۔ اپنی معلومات اور سیاسی بصیرت کی بنیاد پر جو ٹھیک لگتا ہے لکھ دیتے ہیں اور یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی بعض پیشگوئیاں درست ثابت ہو کر صحافتی وژن کو آگے بڑھاتی رہی ہیں۔ اپنی مٹی، عوام، ثقافت اور روشن خیالی سے محبت کرنے والے عقیل یوسف زئی خطے خصوصاً پشتون قوم پرست سیاست انتہاپسندی اور افغانستان پر کچھ زیادہ ہی لکھنے کے عادی ہیں۔ اسی حوالے سے سیاسی لیڈرشپ سے لے کر عام قاری تک سب ان کے معترف ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ ایسا تجزیہ کردیتے ہیں کہ الہامی کیفیت کا تصور بن جاتا ہے اور وہ والی حالت ہوجاتی ہے کہ:

''وہ شہر کے لوگوں میں پیغمبر تھا نہ ولی تھا
مگر جو کچھ کہا وہ ہو کے رہا''

انتہاپسندی نے اس خطے خصوصاً پشتون سرزمین کو کشت و خون کی جس وادی میں دھکیل دیا ہے۔ اس کے اسباب، ذمہ داران اور کرداروں کو سامنے لانا وقت کا تقاضا اور امن پسند لوگوں کا مطالبہ ہے۔ یقیناً بہت سے تجزیہ نگار اور صحافی اس ایشو پر لکھ رہے ہیں اور بہت سی کتابیں شائع بھی ہو جائیں گی۔ تاہم عقیل یوسف زئی نے کسی خطرے، خوف اور مصلحت کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے پیشے سے انصاف کر کے جس طریقے سے ان ایشوز پر قلم اٹھایا ہے وہ شاید ہی کسی اور کے بس کی بات ہو کیونکہ اکثر لوگ کہیں نہ کہیں جڑے اور پھنسے ہوتے ہیں۔ اردو زبان کی یہ کتاب اس حوالے سے بھی اہم ثابت ہوگی کہ اس کے ذریعے دوسرے صوبوں کے قارئین مستفید ہوسکیں گے اور مقتدر قوتوں کو بھی متعدد اہم واقعات، اسباب اور نتائج کا ادراک ہو سکے گا۔ میری خواہش ہوگی کہ اردو کے بعد اس کتاب کو پشتو اور انگریزی زبان میں بھی شائع کیا جائے تاکہ دوسروں کو بھی معلومات کی فراہمی ممکن ہو۔

نورالبشر نوید

چیف ایڈیٹر ماہنامہ لیکوال، شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار

✦ ..... ✦ ..... ✦

مجھے شرمندگی ہے

اس تاریخی صداقت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ:

دنیا میں سب سے زیادہ جنگیں مذہب کے نام پر ہوئیں اور سب سے زیادہ انسانوں کا خون بھی مذہب کو ہتھیار بنا کر بہایا گیا......حالانکہ یہ محض ہوس اقتدار، غلبہ و تسلط کا جنون اور زیادہ سے زیادہ علاقوں کو زیر کرنے اور رکھنے کی وحشت تھی۔

یہ انسان کی وحشت و بربریت کا ایک رویہ ہے۔

اور شاید......اسی لیے فرشتوں نے کہا تھا۔ یہ زمین پر جا کر فساد پیدا کرے گا۔

لیکن، رب ذوالجلال نے کہا تھا:

''جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔''

اور پھر ...... یوں بھی ہوا کہ...... پہلا اختلاف سامنے آیا۔ بلکہ کسی کو قادر مطلق کے روبرو انکار کی جرأت ہوئی۔ اور اس کو ہمیشہ کے لیے دھتکار دیا گیا۔

یہ روز ازل کا مقدمہ ہے۔ جس پر مشرق وسطی کے تینوں بڑے مذاہب متفق ہیں۔

آج یہ قصہ معروضی صورتحال میں پھر سے تازہ ہوگیا ہے۔ انسان کی وحشت ایک نئے روپ میں دنیا کے سامنے ہے۔

☆..............☆..............☆

یہ زیادہ دور کی بات نہیں۔ جب سوویت یونین کے خلاف جنگ میں مذہب کو

ہتھیار بنایا گیا۔ اوراس جنگ کو'جہاد' کا نام بھی پینٹا گون میں ہی دیا گیا تھا.....اور جس میں دنیا بھر سے 'مجاہدین' ہتھیاروں کی گھن گرج اور ڈالروں کی چمک سے اکٹھے کیے گئے تھے۔

ہم بھی شامل ہوئے کہ.....کفر کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ حکمرانوں اور حکومتوں کے ساتھ.....کئی جماعتیں، کئی گروہ، کئی تنظیمیں اور ہزاروں مدرسے میدان میں اتر آئے۔ اللہ اکبر، کے نعرے فضاؤں کو چیرنے لگے۔

یہ جنگ ختم ہوگئی۔ دشمن بھاگ گیا۔ ہم جیت گئے۔ لیکن پھر.....ہم نے آپس میں لڑنا شروع کردیا۔

کس نے زیادہ خون بہایا تھا اور کون سب سے زیادہ اقتدار کا حقدار تھا۔ اب کی بار 'کافر' نہیں مسلمان ہی ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔ ہر کوئی یہی دعویٰ کرتا تھا وہ 'جہاد' کر رہا ہے۔ 'غلبہ اسلام' کے لیے.....نعرے اللہ اکبر کے تھے، مگر انسان کی وحشت سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

☆..............☆..............☆

یہ تو.....ابھی کل کی بات ہے۔ عراق اور افغانستان پر آگ اور بارود برسانے کے لیے انجیل مقدس کا سہارا لیا گیا تھا اور اس جنگ کو صلیبی جنگوں کا متبادل بھی قرار دیا تھا تاکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو مقدس روپ دیا جائے۔

امریکہ کے پادریوں اور مذہبی رہنماؤں نے دعائیں بھی کی تھیں۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ سکندر اعظم دنیا فتح کرنے نکلا تھا تو اس نے بھی پروہتوں اور پجاریوں کو اس مشن کی کامیابی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ مگر.....مبارک ہیں وہ لوگ جنھوں نے انکار کردیا.....اور اس انکار سے انسانی خون بہنے سے روکنے کی کوشش کی۔ حالانکہ.....وہ ناکام رہے۔ مگر تاریخ میں زندہ ہوگئے۔ کہ

طاقت اور وحشت نے ان کی ایک نہیں سنی۔

عراق پر حملہ کے وقت، پوری دنیا میں احتجاج ہوا۔ انسانی صداؤں سے آسمان لرزتا رہا۔ لیکن، طاقت اور وحشت نے کسی کی پروانہیں کی۔ اور ہتھیاروں کو آزمانا.....ضروری سمجھا۔

انسانی خون.....گلیوں بازاروں اور سڑکوں پر بہتا رہا ہے

☆..............☆..............☆

پاکستان کے قبائلی علاقوں میں شریعت کے نفاذ کا مطالبہ ہے اور اس کے لیے 'جہاد' ہو رہا ہے۔ پندرہ سے پچیس سال کے نوجوان جنت الفردوس کی خواہش میں خودکش حملہ آوروں کے روپ میں خود کو بھی موت کے حوالے کرتے ہیں۔ ان کے جسموں کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ نعشیں بھی شناخت کے قابل نہیں رہتیں۔ ٹانگیں کہیں، بازو کہیں اور سر کہیں۔ مگر شوق شہادت میں، وہ درجنوں مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ 'قربان' کر دیتے ہیں۔ بے گناہ معصوم انسانوں کو ہمیشہ کے لیے مفلوج اور اپاہج بنا دیتے ہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔

وہ جو مخالفت کرتے ہیں یا ان کے اس جہاد سے متفق نہیں ہیں۔ انہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر۔ زمین پر گرا کر۔ جانوروں کی طرح ذبح کر دیا جاتا ہے۔ ان پر ''تکبیر'' پڑھنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ''تکبیر'' کے بغیر جانور 'حرام' ہو جاتا ہے۔

اور پھر......اس عمل کے دوران میں......ایک 'عالم دین' بھی موجود ہوتا ہے جو 'قرآن پاک' کی تلاوت بھی کرتا جاتا ہے......''اللہ اکبر''۔

یہ......کون سا مذہب ہے۔ کون سا اسلام ہے؟؟ اور یہ کیسے مسلمان ہیں؟

اسلام تو امن و آشتی اور محبت کا درس دیتا ہے۔ اس لیے تو اس کو 'سلامتی کا مذہب' قرار دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ......نہ تو یہ مذہب ہے اور نہ ہی مذہب کا پیغام!! نہ رحمت اللعالمین ﷺ کی سنت!

یہ تو انسانی وحشت اور بربریت کی بدترین مثالیں ہیں۔ اور شاید یہی طالبانائزیشن ہے۔ اگر نہیں بھی تو اس کو طالبانائزیشن ہی کیا جائے گا۔ کیونکہ اسلام تو اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام تو ہر انسان کو زندہ رہنے کا پورا حق دیتا ہے۔ اور ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے۔ تو پھر......یہ کون سا اسلام ہے؟؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

☆..............☆..............☆

یہ وہ منظر نامہ ہے جس میں عقیل یوسف زئی نے 'طالبانائزیشن' کو اس کتاب میں اکٹھا کیا ہے جس میں بہت سارے حقائق، اعداد وشمار کے شواہد کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے تمام حسیات اکٹھی ہوجاتی ہیں انسان بہت کچھ سوچنے لگتا ہے اور پھر......اپنے آپ کو آئینے کے روبرو کرکے شرم سے پانی پانی ہوجاتا اور اپنا مکروہ چہرہ دیکھ کر خود سے ہی ڈرنے لگتا ہے۔

اگر......یہی انسان ہے، جس نے طالبان کا روپ دھار لیا ہے اور قبائلی علاقوں کو خونی تجربہ گاہ بنا رہا ہے۔ قرآن کی تلاوت بھی کرتا ہے اور انسانوں کو جانوروں کی طرح ذبح بھی کرتا ہے۔

قرآن کی تلاوت تو پتھروں کو بھی موم کردیتی ہے......مگر یہ کیسے انسان ہیں؟
اگر یہی انسان ہے
تو......لعنت ہے ایسے انسان پر۔
میں کسی اور کی بات نہیں کرتا۔ لیکن مجھے اپنے انسان ہونے پر شرمندگی ہے۔
(شیخو)

✦.....✦.....✦

ایک طویل سازش کا نتیجہ

پاکستان میں بنیاد پرستی کی جڑیں گہری اور مضبوط بھی ہیں اور تاریخ کے اندر تک گھسی ہوئی ہیں۔تحریک پاکستان میں اگرچہ اسلامی نظام کے نفاذ کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور وہ جو...... پاکستان کا مطلب کیا، لاالہ الا اللہ......ہے وہ سیالکوٹ کے ایک شاعر اصغر سودائی کا خیال تھا۔ یوں بھی اگر کسی تحریک کا سائنسی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر تحریک کا بنیادی مقصد کامیابی کا حصول ہوتا ہے اور اس کے لیے جس عوامی تحریک اور فعالیت کی ضرورت ہوتی ہے اس میں ہر امکان کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مذہب بھی ایک ایسا امکان تھا جس کو جزوی سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اگر قائداعظم محمد علی جناح کا مقصد ایک مذہبی ریاست بنانا ہوتا تو وہ کبھی بھی مسلم لیگ کا منشور بنوانے کے لیے کیمونسٹ رہنما کی خدمات حاصل نہ کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس منشور کو مسلم لیگ میں شامل نوابزادوں، زمینداروں اور جاگیرداروں نے قبول نہیں کیا۔ اور پھر......وہ اپنی پہلی کابینہ میں کسی غیر مسلم کو اپنا وزیر قانون نہ بناتے اور نہ ہی گیارہ اگست کی تقریر میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کے لیے شخصی اور مذہبی آزادیوں کا پیغام دیتے اور نہ ہی مساوات پر مبنی معاشرے کی تشکیل کو اولین ترجیح قرار دیتے۔

تحریک پاکستان کے حوالے سے ایک اور دلچسپ تاریخی حقیقت تو یہ بھی ہے کہ......وہ جماعتیں جو آج پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی سب سے بڑی دعویدار ہیں۔

جے یو آئی، جو اس وقت جمعیت العلمائے ہند ہوا کرتی تھی، جماعت اسلامی، خاکسار تحریک اور مجلس احرار چاروں جماعتیں پاکستان کی تخلیق کے خلاف تھیں۔ مجلس احرار تو تاریخ کے صفحات میں گم ہوچکی ہے جبکہ خاکسار تحریک علامہ مشرقی کے فرزند ارجمند حمیدالدین مشرقی اور ان کے چند ساتھیوں کو سیاسی سہارا دیئے ہوئے ہے۔ جماعت اسلامی اگر قائداعظم کو کافر اعظم اور پاکستان کو ناپاکستان کہا کرتی تھی تو جے یو آئی کے اکابرین اس لحاظ سے تشکر کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ وہ...... پاکستان بنانے کے گناہ میں شامل نہیں ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ 1946ء کے انتخابات کے بعد جب پاکستان کی تخلیق لازم ٹھہری تھی پنجاب کے وہ جاگیردار جو یونینسٹ پارٹی کا حصہ تھے اور وہ مسلم لیگ کی مخالفت بھی محض اس بنا پر کرتے چلے آرہے تھے کہ انہیں اس تبدیلی کا ادراک ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ کانگریس سے بھی دور تھے کہ کانگریس نے جاگیرداری اور بڑی زمینداریاں ختم کرنے کا اعلان کررکھا تھا جو انہوں نے ہندوستان میں تقسیم کے فوراً بعد کر بھی دیں چنانچہ بہت سارے زمیندار اور جاگیردار مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور پاکستان بننے کے بعد جوق در جوق مسلم لیگ کا حصہ بن گئے اور انہوں نے مذہبی عناصر کی سرپرستی بھی شروع کردی۔ کیونکہ مذہبی تشریحات میں جائیداد جاگیروں اور ملکیت کو انفرادی آزادی اور خدائے بزرگ و برتر کی عطا قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وہ سرپرستی تھی جس میں قرارداد مقاصد پاس ہوئی جس کو بعد میں ضیاء الحق نے آئین کا حصہ بنا دیا اور پھر جاگیرداروں کی روایتی سازشوں کے ذریعے ہی تحریک ختم نبوت شروع ہوئی جس کا بنیادی مقصد خواجہ ناظم الدین کے اقتدار تک رسائی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا۔

بہرحال یہی وہ دواہم ترین عوامل تھے جنہوں نے پاکستان کے تصور کو مبہم بنا کر اس کی سمت ہی تبدیل کرکے رکھ دی۔ اس تناظر میں ایک اور اہم واقعہ کی نشاندہی بھی تاریخی پس منظر میں ضروری ہے۔ وہ یہ کہ...... پاکستان کی تاریخ میں نظریہ پاکستان کا لفظ پہلی دفعہ ایوب خان کی اسمبلی میں جماعت اسلامی کے ایک رکن نے استعمال کیا تھا جس پر صدر فضل الٰہی چودھری جو اس وقت اسمبلی کے رکن تھے انہوں نے شدید احتجاج کیا تھا لیکن اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ پاکستان کے حکمرانوں نے بھی مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ ایوب

خان نے محکمہ اوقاف بنایا اور اس میں ملاؤں کو مسجدوں اور مزاروں کا نگران بنا دیا۔ یحییٰ خان نے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ بنائے اور اس کے وزیر اطلاعات نوابزادہ شیر علی خان نے فوج کو ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کا محافظ قرار دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کو اسلامی فلاحی جمہوری ریاست کا نام دیا اور پھر احمدیوں کو غیر مسلم بھی قرار دیا۔ اور جب 77ء میں ان کے خلاف تحریک چلی جس کو دینی سیاسی جماعتوں نے ہائی جیک کر کے ''نظام مصطفیٰ'' کا نام دیا تھا تو بھٹو صاحب نے اس دباؤ کے اثر سے نکلنے کے لیے جمعہ کی چھٹی کے اعلان کے ساتھ شراب وغیرہ پر بھی پابندی عائد کر دی...... حالانکہ ''پاکستان قومی اتحاد'' میں عوامی نیشنل پارٹی اور تحریک استقلال جیسی ترقی پسند اور سیکولر جماعتیں بھی شامل تھیں۔ لیکن ...... پاکستان میں سب سے بڑی خرابی مذہب کے نام پر ضیاء الحق دور میں ہوئی جب ایک طرف تو نظام مصطفیٰ کے نفاذ پر مجلس شوریٰ، شریعت کورٹس اور شریعت کونسل جیسے ادارے بنائے گئے اور پھر افغانستان میں امریکی مفادات کی تکمیل کے نام پر ''جہاد'' کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہی وہ عرصہ تھا جب ایک طرف تو افغان مجاہدین کی سرپرستی کی گئی تو دوسری طرف اس جہاد کے لیے ''خام مال'' کی فراہمی کے لیے دینی سیاسی جماعتوں اور ان کے مدرسوں کو حکومتی اور ریاستی تعاون فراہم کیا گیا۔

بات یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتی۔ ضیاء الحق کے زمانہ میں ہی ایک طرف تو ''قرارداد مقاصد'' کو آئین کا حصہ بنا کر کسی بھی غیر اسلامی قانون کی منظوری کا راستہ بند کیا گیا تو دوسری طرف تعلیمی نصاب سے تاریخ کو نکال کر مطالعہ پاکستان کا مضمون شامل کر دیا گیا جس کے تمام دھارے نہ صرف مذہب کی طرف جاتے تھے بلکہ یہ ثابت کر دیا گیا کہ تحریک پاکستان مذہب کے نام پر شروع ہوئی تھی اور اس کا واحد مقصد پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانا تھا۔ چنانچہ یہی وہ عرصہ تھا جس میں سینکڑوں کی تعداد میں دینی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں اور ان میں کچھ ایسی بھی تھیں جن کے باقاعدہ عسکری ونگز بھی موجود تھے جنہوں نے اپنے اپنے نظریاتی غلبے کے لیے مخالفین کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جس کا ایک فطری اور سائنسی نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ دینی سیاسی جماعتوں کے کارکن مسلح ہو کر نظریاتی تسلط کی جدوجہد کا حصہ بنتے گئے۔ مزید یہ کہ افغانستان سے سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد جو مجاہدین اور عسکری تنظیمیں

پاکستان پلٹ کر آئیں تو وہ بھی نظریاتی تسلط کے اس کھیل کا حصہ بن گئیں۔ جس کے نتیجہ میں پاکستان کے اندر فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔

ستم تو یہ بھی ہے کہ ضیاء الحق کا پھیلایا ہوا یہ زہر پاکستان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا جس کا بعد میں آنے والی حکومتیں بھی تریاق نہیں کر سکیں۔ کیونکہ وہ تو محض اقتدار پر براجمان تھیں پالیسی سازی میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ان کی حیثیت روبوٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ بلکہ یوں بھی ہوا کہ جہاں بھی ان حکومتوں نے اپنی حدود سے تجاوز کی کوشش کی انہیں برطرف کر کے گھروں کو بھیج دیا گیا۔

یوں اگر......اس تناظر میں دیکھا جائے تو ضیاء الحق کی موت کے بعد بھی کوئی بڑی معاشرتی تبدیلی نہیں آئی یہ وہی معاشرہ ہے جو ضیاء الحق کے ساڑھے گیارہ سال کے دور میں مخصوص مقاصد کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے زہریلے کانٹے پہلے سے بھی زہریلے اور نوکیلے ہو چکے ہیں جو ہر مسافر کو زخم زخم کرتے رہتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب بھی دراصل ان زخموں میں سے ایک زخم کی کہانی ہے۔ جو پشتون ایریاز میں نئے عنوان کے ساتھ سامنے آرہی ہے اس کہانی کا عنوان ہے ''طالبانائزیشن'' یا پھر اسلام کے نام پر قبائلی نظام کا نفاذ۔ وہ قبائلی نظام جو صدیوں پہلے جہالت اور دقیانوسیت کی وجہ سے اپنی موت آپ مر چکا تھا یا پھر بتدریج آہستہ آہستہ موت کی دہلیز پر آن کھڑا ہوا تھا۔

اکیسویں صدی میں جب دنیا چاند ستاروں کو تسخیر کر چکی ہے۔ علم کی کئی جہتیں دریافت ہو چکی ہیں۔ اخلاقیات کے نئے معیار قائم ہو رہے ہیں، انسان کو انسانیت کے حوالے سے دیکھا اور پرکھا جا رہا ہے۔ طالبان کیا چاہتے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ یا کس قسم کے معاشرے کی تخلیق میں مصروف ہیں؟

لڑکیاں تعلیم حاصل نہیں کر سکتیں، عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا جائز نہیں۔ محرم کے ساتھ ہی باپردہ ہو کر گھر سے باہر نکلا جا سکتا ہے۔ اب یہ محرم کون ہو سکتا ہے، کون نہیں ہو سکتا؟ یہ ایک اور سوالیہ نشان ہے کیونکہ ہر فرقے کی اپنی فقہ اور تفسیر ہے! شوہر، بھائی اور باپ کے سوا کوئی محرم نہیں۔ سب نامحرم ہیں۔ حتیٰ کہ سسر بھی جو باپ کا درجہ رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ سوات میں ایک سترہ سالہ لڑکی کو محض اس بنا پر سرعام کوڑے مار کر ذلیل و رسوا کیا گیا

کہ وہ سسر کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ اگر چہ اس کی کہانی بھی کچھ اور ہے۔ لڑکی کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک نیچی ذات کے لڑکے سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ یہ لڑکا طالبان میں شامل ہو گیا اور اس نے بدلہ لینے کے لیے لڑکی پر بدکاری کا الزام لگا دیا۔ جس پر نہ کوئی عدالت لگی اور نہ ہی چار شرعی گواہیاں طلب کی گئیں لیکن اس کو تین نامحرموں نے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ لیا اور ایک نامحرم نے اس کی پیٹھ پر شرعی قوانین کی پاسداری اور سربلندی کے لیے کوڑے برسائے...... یہ اسلام تو نہیں۔ مگر طالبان اس کے نفاذ پر فخر بھی کرتے ہیں اور اس کے نفاذ کی جدوجہد میں بھی مصروف ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سرحد کی صوبائی حکومت جو سیکولر پس منظر رکھتی ہے اس نے بھی امن کی خاطر اس ''نظام عدل'' کے نفاذ کا معاہدہ کرتے ہوئے سوات اور مالاکنڈ ڈویژن کو ''طالبان'' کے حوالے کر دیا ہے اور یہ طالبان اس ''نظام عدل'' کو مزید وسعت دینے کے خواہشمند بھی ہیں اور اس کے لیے انہوں نے منصوبہ بندی بھی کر رکھی ہے۔

بات یہیں پر ہی ختم نہیں ہوتی......طالبان مجرموں کو جانوروں کی طرح ذبح کرنے کو بھی ''اسلام'' ہی کا نام دیتے اور پھر اس کی تشہیر بھی کرتے ہیں۔ ایک شخص کے ہاتھ اور ٹانگیں باندھی جاتی ہیں پھر اللہ اکبر کی صداؤں میں اس کے گلے پر چھری چلائی جاتی ہے تو ایک باریش شخص قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتا ہے۔

یہ رحمت العالمینؐ کا اسلام ہرگز نہیں، ہم اس موقع پر اسلامی عدل و انصاف کے معیارات پر بحث کرنا چاہتے ہیں اور نہ سزاؤں کے انتہائی عمل کی ضرورت اور اس کے تعین پر کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی عدل و انصاف کب لاگو ہوتا ہے اس کا تذکرہ بھی ضروری نہیں کیونکہ یہ کام علمائے کرام نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ سنت رسولؐ کا پابند شخص ہی اس پر بات کر سکتا ہے۔

یہ سنت رسولؐ کیا ہے؟ داڑھی رکھنا، ٹخنوں سے اوپر شلواریں باندھنا، نماز پڑھنا، روزے رکھنا۔ اور بس......یہی سنت رسولؐ ہے اور یہی اسلام کا مقصد۔ یعنی عبادات!! رہے ''معاملات''؟؟؟ تو وہ سب کچھ چھوڑ دیجئے......یہی کچھ طالبان چاہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو داڑھیاں رکھوانا اور نماز پڑھوانا چاہتے ہیں۔ مولانا مودودی مرحوم نے کہا تھا: ''اسلام میں داڑھی ہے داڑھی میں اسلام نہیں۔''

بہر حال ...... یہی وہ طالبان ہیں جنہیں پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کے لیے ریاستی اور حکومتی سرپرستی میں پروان چڑھایا اور ان کو ''مجاہدین اسلام'' بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا نے بھی اپنے ''روسی دشمن'' کو شکست دینے کے لیے ان کی بھرپور مدد کی۔ انہیں اسلحہ، دولت اور طاقت سے لیس کیا۔ اب یہی وہ طالبان ہیں جو نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے لیے بھی خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی ریاست کے اندر ایک ریاست قائم کر کے حکومت کی رٹ کو چیلنج کر رکھا ہے۔ پاکستان کی فوج جو دنیا کی بہترین تربیت یافتہ افواج میں شمار ہوتی ہے چھ سال سے طویل جدوجہد کے باوجود ان پر قابو پانے میں ناکام نظر آتی ہے تو دوسری طرف امریکہ اور یورپ کی متحدہ افواج جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہو کر پاکستان کے تعاون سے آخری معرکہ کے لیے تیاری کر رہی ہیں۔

یہی وہ طالبان ہیں......جنہوں نے ایک طرف تو پاکستان کی ریاستی مشینری کو خوف اور دہشت میں مبتلا کر دیا ہے تو دوسری طرف بم دھماکوں اور خودکش حملوں کے ذریعے عوام کو بھی خوف و ہراس کے شکنجوں میں جکڑ دیا ہے۔ پاکستان کی سلامتی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس تو اس بات کا بھی ہے کہ...... پاکستان میں موجود بعض دینی عناصر مذہب کے غلبہ کے لیے ان کی حمایت بھی کرتے ہیں اور جب کوئی بڑی فوجی کارروائی ہوتی ہے تو اس پر خواتین اور بچوں کی ہلاکت کو جواز بنا کر احتجاج اور واویلا بھی کرتے ہیں۔ یہ وہی عناصر ہیں جنہیں فوجی حکومتوں میں سرپرستی اور تعاون بھی فراہم کیا جاتا رہا ہے۔

آج......صورتحال انتہائی گمبھیر اور خطرناک ہو چکی ہے۔ پاکستان کا کوئی شہر طالبان اور طالبانائزیشن سے محفوظ دکھائی نہیں دیتا۔ تو دوسری طرف وہ علاقے جو معاشی اور معاشرتی لحاظ سے پسماندہ ہیں وہاں طالبان کی پذیرائی اور قبولیت کے فکری رجحانات کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے خصوصاً جنوبی پنجاب کے اضلاع جہاں مختلف عسکری تنظیمیں اور ان کے مدرسے موجود ہیں۔

یہ کتاب دراصل ایسے ہی عوامل و محرکات اور تاریخی پس منظر کا احاطہ بھی کرتی ہے جس میں طالبان کا ظہور ہوا اور پھر طالبانائزیشن کے لیے جدوجہد کا سامان پیدا ہوا۔ اس کتاب میں ان مقامات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جہاں طالبان نے اپنے مضبوط نیٹ ورک بنا

رکھے ہیں اور اس میں بہت سارے اعداد و شمار بھی پیش کیے گئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی منظر عام پر نہیں آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ...... عقیل یوسف زئی نے اس کتاب کے لیے دیوانگی کے ساتھ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بڑی محنت سے کام کیا ہے۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ...... یہ کام کوئی دیوانہ ہی کر سکتا تھا۔ عقل و ہوش والے تو قدم قدم پر مصلحتوں کا شکار ہو کر خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

امید ہے کہ...... عقیل یوسف زئی کی یہ پہلی کتاب اہل فکر و دانش میں نہ صرف خصوصی مقام حاصل کرے گی بلکہ اس مسئلہ کی گمبھیرتا کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔

اکرم شیخ

4اپریل2009ء

615-E گلشن راوی، لاہور

+ ..... + ... +

باب 1

پاک افغان پالیسی اور انتہا پسندی

افغانستان میں ظاہر شاہ حکومت کا خاتمہ اور پھر سردار داؤد کے قتل نے ایک طرف تو امریکہ کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تو دوسری طرف سوویت یونین بھی ان پریشانیوں سے محفوظ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں پے درپے انقلاب برپا ہوئے حفیظ اللہ امین، نور محمد ترکئی اور پھر ببرک کارمل۔ کئی حکومتیں وجود میں آئیں۔ ببرک کارمل کو سوویت یونین کی مکمل سرپرستی اور تعاون حاصل تھا۔

ادھر ایک اور تلخ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ...... پاکستان میں 77ء میں جو 'اسلامی نظام' آیا تھا یا پھر جس کو نظام مصطفیٰ کے نام پر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک کے طور پر استعمال کیا گیا تھا اس کو امریکہ کی مکمل آشیر باد اور تعاون حاصل تھا جس کی تفصیل میں جانا، اپنے مخصوص ہدف سے دور ہو سکتا ہے لیکن اس کی افادیت اس تناظر میں اہمیت کی حامل تھی کیونکہ ایسے شواہد اور رپورٹیں سامنے آچکی ہیں امریکی ادارے سوویت یونین کے اندر ابھرنے والے داخلی معاشی اور سیاسی تضادات سے تبدیلی کی بو سونگھ چکے تھے اور انہیں یقین تھا کہ سوویت یونین زیادہ دیر متحد رہنا مشکل ہو گیا ہے اسی تناظر میں ہی پاکستان میں 77ء کی تحریک کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ایک 'رجعت پسند' جرنیل کو سرپرستی اور تعاون فراہم کیا گیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی جب ایران میں گیارہ فروری 79ء کو امام خمینی کی قیادت میں عوامی انقلاب نے شاہ ایران کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو دنیا کے دوسرے بڑے ''پٹرو

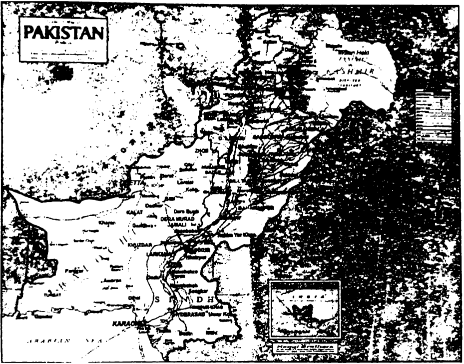
PAKISTAN
KALAT
DERA MURAD
JAMALI
Dera Bugti
Kohlu
Loralai
ZHOB
KHUZDAR
Panjgur
Turbat
S I N D H
HYDERABAD
KARACHI
ARABIAN SEA

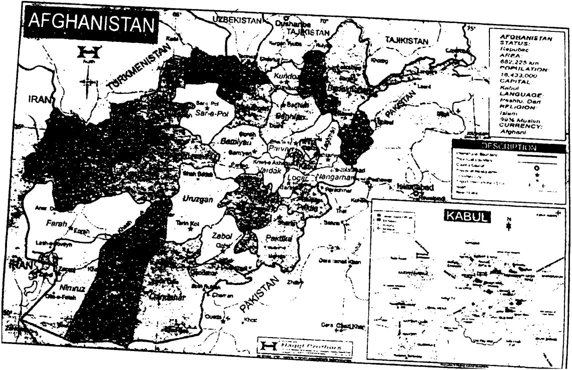
AFGHANISTAN
UZBEKISTAN
Dushanbe
TAJIKISTAN
TAJIKISTAN
TURKMENISTAN
IRAN
IRAN
PAKISTAN
PAKISTAN
Sar-e-Pol
Kundoz
Baghlan
Bamiyan
Parvan
Vardak
Logar
Nangarhar
Laghman
Uruzgan
Zabol
Paktika
Farah
Nimruz
Kandahar
Tarin Kol
Islamabad
AFGHANISTAN
STATUS:
Republic
AREA:
652,225 km
POPULATION:
16,433,000
CAPITAL:
Kabul
LANGUAGE:
Pashtu, Dari
RELIGION:
Islam
99% Muslim
CURRENCY:
Afghani
DESCRIPTION
KABUL

Two Revolutions in Pakistan's neighboring Countries

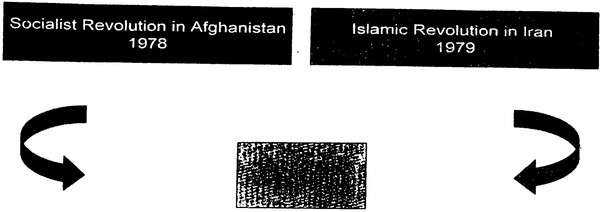

Two Political Triangle of Cold War in South & Central Asia.

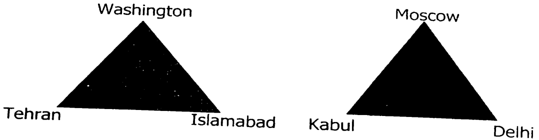

1: Socialist Revolution in Afghanistan (1978): Anti- American, Pro-Soviet
2: Islamic Revolution in Iran (1979) : Anti- American

Politico-Religious cobweb for Afghan Refugees

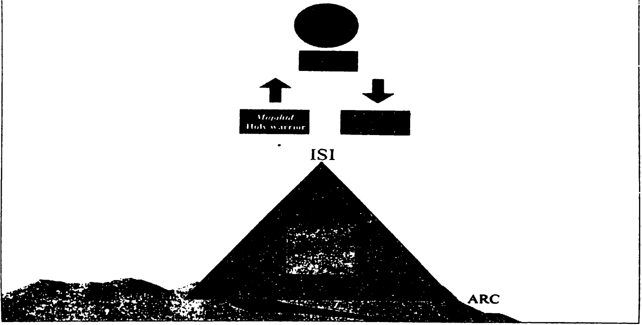

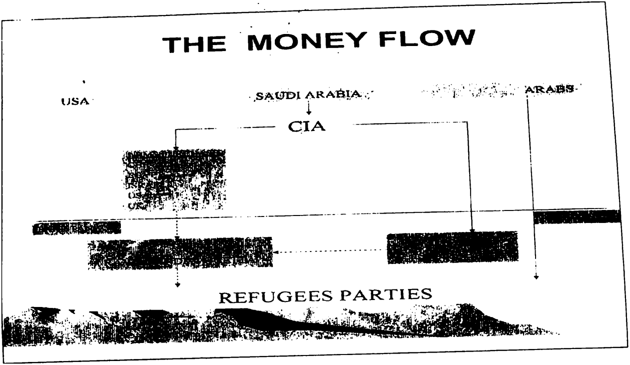
THE MONEY FLOW
USA
SAUDI ARABIA
ARABS
CIA
[redacted]
[redacted]
[redacted]
[redacted]
[redacted]
REFUGEES PARTIES

پمپ'' پر مخالفین کے قبضہ نے امریکہ کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ یہ وہ موقع تھا جب سوویت یونین کی سرحد پر واقع افغانستان میں بائیں بازو کے لوگ حکمران تھے اور وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ وہ موقع تھا جب جنرل ضیاء الحق کے افغانستان کے ان مختلف گروپوں سے رابطے ہو چکے تھے جنہیں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں سردار داؤد کو اس کی حدود میں رکھنے کے لیے تیار کیا گیا تھا...... یاد رہے کہ یہ جماعت اسلامی کی ذیلی شاخ کے گلبدین حکمت یار ہی تھے جنہیں جنرل نصیراللہ بابر نے دریافت کیا اور اس کو تربیت بھی دی جس کے بعد گلبدین نے کابل میں جا کر بم دھماکہ کیا تھا۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں سردار داؤد پاکستان آ کر ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے میز پر مذاکرات کے لیے بیٹھے تھے۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان دوطرفہ تعاون کے کچھ معاہدے بھی ہوئے تھے۔ سوویت یونین تک شاہراہیں تعمیر کرنے کا ایک معاہدہ بھی تھا وہ شاہراہ جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اس شاہراہ کی تعمیر کے لیے شاہ ایران نے سرمایہ فراہم کرنے کی یقین دہانی کروائی تھی......بہرحال جنرل ضیاء الحق کی امیدیں اس وقت بر آئیں جب سوویت فوجیں بائیں بازو کے انقلاب کو تحفظ دینے کے لیے افغانستان میں داخل ہوئیں۔ ایک نقطۂ نظر میں یہ بھی موجود ہے کہ سی آئی اے کے نیٹ ورک نے اپنا کام دکھایا اور سوویت یونین کو اپنی فوجیں افغانستان میں بھیجنے کی ترغیب فراہم کی تاکہ اسے یہاں لاکر جال میں پھنسایا جائے۔ کیونکہ مغربی مفکرین 1837ء اور 1878ء میں انگریزوں کی پسپائی سے آج بھی یہ نتائج اخذ کرتے ہیں کہ افغانستان کو مخصوص جغرافیائی صورتحال اور تہذیبی روایات کی موجودگی میں فتح کرنا ممکن نہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ انگریزوں کو مزاحمت کا سامنا پشتون قبائلی علاقوں میں ہی کرنا پڑ گیا اور ان کی یہاں سے ہی ہندوستان کی طرف واپسی ہوگئی تھی۔ یہی علاقے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں کامیاب ہتھیار کے طور پر استعمال کیے گئے اور یہی وہ علاقے ہیں جو آجکل شدید ترین شورش کا شکار ہیں۔

جنرل ضیاء الحق بھی خوش تھے کہ اب انہیں اقتدار کو تحفظ دینے میں کوئی خاصی مشکل نہیں ہوگی اور وہ 'سٹریٹجک ڈیپتھ' کے نام پر ایسی پالیسی کے خواہشمند تھے جس کا دفاع آج بھی آئی ایس آئی کے سابق ڈائریکٹر جنرل اور افغانستان کی پہلی جنگ کے خودساختہ مجاہد

جنرل حمید گل بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سوویت یونین بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ افغانستان آیا جس کے باعث ہماری سرحدیں غیر محفوظ ہوگئی تھیں اگر اس کا راستہ افغانستان میں ہی نہ روکا جاتا تو وہ اگلے مرحلے میں پاکستان کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن ادھر ایک اور حقیقت تو یہ ہے کہ 1980ء کے انتخابات میں ری پبلکن پارٹی کامیاب ہوئی تھی۔ 20 جنوری 1981ء کو صدر ریگن نے امریکہ کے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اس کا سب سے پہلا مہمان بننے کا شرف جنرل ضیاءالحق کو ہی حاصل ہوا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب پاکستان کے لیے چار ارب ڈالر کی نقد امداد کے ساتھ فوجی تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی گئی اور افغانستان میں بھرپور جہاد شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔

یہ وہ موقع تھا جب افغانستان سے مہاجرین کی آمد شروع ہوچکی تھی انہی میں سے درجن بھر جنگجو تنظیمیں بنائی گئیں اور انہیں فطری جنگجو صلاحیتوں کے ساتھ باقاعدہ تربیت بھی فراہم کی گئی تا کہ وہ افغانستان میں جا کر سوویت فوجوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں کرسکیں۔ 1984ء تک ان جہادی تنظیموں کی تعداد دو درجن کے قریب ہوگئی تھی جنہیں تمام مالی امداد سی آئی اے اور پھر اس کے توسط سے آئی ایس آئی کے ذریعے ملتی تھی۔ دلچسپ بات تو یہ بھی ہے کہ جب بعض تنظیموں نے اپنی کامیاب کارروائیوں کے بدلے میں کم رقوم کا شکوہ کرنا شروع کردیا تو سی آئی اے نے ان تنظیموں میں چھانٹی کا عمل شروع کیا اور پھر صرف سات عسکری تنظیموں کو تسلیم کرتے ہوئے دیگر تنظیموں کو یا تو ان کو ختم کرنے یا پھر کسی دیگر تنظیم میں ضم ہونے کا مشورہ دیا۔

اس دوران میں پاکستان کے دیگر اسلامی حکومتوں کے ساتھ بھی رابطے قائم ہوچکے تھے جو اسے مالی تعاون کے ساتھ سیاسی حمایت بھی فراہم کرتے تھے ان میں سعودی عرب پیش پیش تھا جہاں سے اسامہ بن لادن کی قیادت میں ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین بھی آئے یہی وہ دور تھا جب اسلام آباد سی آئی اے کے بہت بڑے اڈوں میں سے ایک بن چکا تھا اور بقول مشہور صحافی باب وڈورڈ سی آئی اے کے سربراہ ولیم کیسی ہر مہینے جنرل ضیاءالحق سے ملاقات کرنے اور افغان جہاد پر تبادلہ خیال کرنے آیا کرتے تھے۔ تو دوسری طرف پشاور عرب اور دیگر اسلامی ملکوں کے مجاہدین کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اس افغان جہاد کے علمبردار

عبداللہ عزام اور اسامہ بن لادن تھے جبکہ ان کے علاوہ بے شمار عربوں نے پشاور میں ڈیرے ڈال کر نہ صرف افغانیوں بلکہ پاکستانیوں کو بھی جہاد میں شمولیت پر آمادہ کیا بلکہ مذہب کے نام پر کروڑوں اور اربوں روپے کے فنڈز بھی اکٹھے کیے۔ پشاور کا یونیورسٹی روڈ جو حیات آباد تک چلا جاتا ہے ان لوگوں کی سرگرمیوں کا خصوصی مرکز بن چکا تھا اس سڑک پر مجاہدین کے درجنوں ادارے قائم ہوگئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لاکھوں لوگ جذبہ جہاد کے ساتھ ذاتی اور مالی مفادات کے تحت ان اداروں اور تنظیموں سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس کا ایک اور نتیجہ کچھ اس شکل میں بھی سامنے آیا کہ 1973ء تک دینی مدرسوں کی تعداد جو صرف پانچ ہزار تھی وہ 1986ء تک بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ ان میں مکتبۂ دیوبند جو اس جہاد میں سب سے اہم اور بنیادی کردار ادا کر رہا تھا اس کے مدرسے پچاس فیصد ہوگئے اور ان کی زیادہ تعداد بلوچستان اور صوبہ سرحد میں قائم ہوئی کیونکہ یہی وہ علاقے تھے جو افغان جہاد میں سب سے زیادہ خام مال فراہم کر رہے تھے۔ اس جہاد کا دوسرا پہلو یوں سامنے آیا کہ وہ تنظیمیں جو اس سے پہلے غیر فعال تھیں یا پھر محدود پیمانے پر مقبوضہ کشمیر میں ہندوستانی فوج کے خلاف برسرِپیکار تھیں وہ بھی افغان جہاد میں شامل ہونے لگیں اور انہوں نے پنجاب خصوصاً جنوبی پنجاب سے مجاہدین کی فراہمی کا کام شروع کردیا۔ بریگیڈیئر یوسف کے مطابق آئی ایس آئی نے سرحد کے تربیتی مراکز میں ایک لاکھ مجاہدین کو تربیت دی تھی۔ 8893

اب دنیا کے پچاس سے زائد مسلم اور غیر مسلم ممالک افغانستان میں سوویت یونین کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے میدان میں اتر چکے تھے۔ ان میں یورپی ممالک تو محض سیاسی اور مالی مفادات کی فراہمی تک محدود تھے لیکن امریکہ کھل کر پاکستان کو جدید ترین اسلحہ بھی فراہم کر رہا تھا اور مجاہدین کی امداد کے لیے مالی امداد بھی......جس میں اب اس کی ملٹی نیشنل کمپنیاں خصوصاً تیل کمپنیاں بھی اپنا حصہ ڈال رہی تھیں۔ دلچسپ بات تو یہ بھی ہے کہ چین جیسا سوشلسٹ ملک بھی سوویت یونین کے خلاف امریکہ اور مغرب کا اتحادی بن چکا تھا۔ جو اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ دنیا میں کوئی نظریہ مفادات پر غالب نہیں ہوسکتا۔ جب مفادات کا حجم غفیر سامنے ہوتا ہے تو سب کچھ پس پشت چلا جاتا ہے (یاد رہے کہ......وسطی ایشیا کی نو آزاد ریاست قازقستان کے ساتھ چین نے تیل کی خریداری کا معاہدہ کرلیا ہے جو شاید سوویت یونین

کے ساتھ ممکن نہیں تھا) تو دوسری طرف ایران اور امریکہ جو انقلاب کے بعد ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر چلے گئے تھے افغانستان کے مسئلہ پر ایک دوسرے کے اتحادی بن گئے تھے۔ حالانکہ یہ وہ موقع تھا کہ سعودی عرب اور ایران کے درمیان بھی سخت مخاصمت چل رہی تھی مگر اس مسئلہ پر یہ دونوں ملک امریکی اتحادی بن گئے جس کا واضح مطلب یہ بھی تھا کہ نظریاتی اور مسلکی اختلافات ریاست کے مفاد کے آڑے نہیں آسکتے تھے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ممالک مجاہدین کی بھرتی اور ان کی تربیت کے لیے پاکستان کو بیس کیمپ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ لیکن کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ اس جنگ کے مابعد اثرات کیا ہوں گے اور مختلف قومیتوں، ثقافتوں اور روایات کی موجودگی میں کیا پاکستان اس کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں؟ کیا پاکستان افغان مجاہدین کے توسط سے ہونے والی ثقافتی اور تہذیبی یلغار کا مقابلہ کر سکے گا جس میں کلاشنکوف کلچر، ہیروئن اور سمگلنگ کے مکروہ دھندے سامنے آئے۔ 1980ء میں پاکستان میں ہیروئن استعمال کرنے والوں کی تعداد صرف پانچ ہزار تھی جو 2000ء میں 30 لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

1986ء تک امریکہ افغانستان کے جہاد میں 60 کروڑ ڈالر سالانہ محض اسلحہ کی مد میں خرچ کر رہا تھا لیکن پاکستانی حکمرانوں کو یہ احساس نہیں تھا کہ......عالمی جہاد جس کو اسلامی جہاد قرار دے کر جن عناصر کو افغانستان بھیجا جا رہا ہے جنگ کے خاتمہ کے بعد ان کا اگلا ہدف کیا ہوگا اور اگر یہ ہدف پاکستان ٹھہرا جیسا کہ اب واضح ہو رہا ہے تو پھر کیا ہوگا؟ پاکستان جیسا کمزور سیاسی نظام کا مالک ملک کن خطرات سے دوچار ہوگا؟ مستقبل میں پاکستان اپنا سیاسی اور جغرافیائی تاثر برقرار رکھ سکے گا یا نہیں؟

حکمرانوں کے علاوہ اس خطے میں موجود قوم پرست جماعتیں اور سیاسی قوتیں بھی بدقسمتی سے یا تو جہادی ایجنڈے کو آگے بڑھا رہی تھیں یا پھر حالات کی نزاکت اور دوررس نتائج کا صحیح تجزیہ نہ کرنے کے باعث خاموش تماشائی بنی ہوئی تھیں حالانکہ......ایک تلخ سچائی تو یہ بھی ہے کہ افغانستان میں روس کے خلاف مزاحمت میں اضافہ کے ساتھ ہی پشاور اور کوئٹہ کے اردگرد سرخ نشان لگا دیئے گئے تھے۔ یہ ان نشانوں سے کہیں مختلف تھے جو ایوب خان کے زمانہ میں یوٹو طیاروں کی پروازوں کے بعد لگائے گئے تھے۔ بہرحال پشاور سمگلنگ اور منشیات

کا مرکز بھی بنا اور اس جنگ کے پہلے نتیجہ کے طور پر یہاں اسلحہ کی بھرمار بھی ہوئی۔ بم دھماکوں کے ساتھ پرانی اور نئی دشمنیوں کو بھی فروغ ملا۔ ایک دوسرے پر بموں، راکٹ لانچروں اور چھوٹے میزائلوں سے حملہ کرنا معمول بن گیا تو دوسری طرف امریکی ڈالروں اور سعودی ریالوں نے جہاد کے عمل کو باقاعدہ کاروبار بنا کر رکھ دیا تھا۔ جس نے افریقہ سے لے کر وسطی ایشیا تک تمام جہادیوں اور پس پردہ کھیل کے ''شیئر ہولڈرز'' کو پاکستان کا رخ کرنے پر مجبور کردیا۔ 38 ممالک کے مجاہدین اس ''مقدس جنگ'' میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لیے افغانستان پہنچ گئے تھے۔ ادھر پاکستان میں مسلک اور فرقے کی بنیاد پر دوسو سے زائد تنظیمیں اور گروپ وجود میں آچکے تھے جنہیں مخصوص مقاصد کے تحت حکومتی اور ریاستی سرپرستی بھی فراہم کی گئی تو دوسری طرف ایسے افراد بھی آگئے جو جہاد اور طاقت کے ذریعے اپنی نوعیت کی ایک منفرد ریاست کے قیام کی خواہش رکھتے تھے جو ''خلافت'' کے تصور پر مبنی ہو ان کا دعویٰ تھا کہ یہ تصور خلافت راشدہ کے نظام سے کشید کیا گیا ہے۔ یہ امریکہ کی سرپرستی میں افغانستان میں ہونے والا خطرناک تجربہ تھا جو بعد میں خود امریکہ اور مغربی ممالک کے لیے ملاعمر کی حکومت کی شکل میں تشویش کا باعث بن گیا اور خود اس کو ہی ختم کرنا پڑا تھا۔ بہرحال خلافت کے اس تصور نے غیرملکی اور مقامی دینی سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک اتفاق رائے بھی پیدا کردیا جو پاکستان میں یا پھر مخصوص علاقوں میں ''نفاذ شریعت'' کی دعویدار تھیں تو دوسری طرف سوویت حکمرانوں کی پے درپے غلطیوں کے ردعمل نے عام افغانیوں نے بھی جہادیوں کی طرف رخ کرنا شروع کردیا۔ انقلاب کے نام پر لائی جانے والی غیرمقبول تبدیلیاں جو مقامی سماج اور تہذیبی روایات سے ہم آہنگ نہیں تھیں عوامی ردعمل کا باعث بنیں اور وہ تبدیلی عام افغانیوں کے لیے بھی ناقابل برداشت چیز بن گئی تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعد میں آنے والی تبدیلیوں کو قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔

ادھر......افغان جنگ کے ذریعے پاکستانی جرنیل بھی اقتدار کو طول دینے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف وہ اربوں ڈالرز کے مالک بھی ہوگئے۔ ان پر اسلحہ کی فروخت کے الزامات بھی عائد ہوئے ان کے لیے یہ جنگ لاٹریوں سے کم نہیں تھی چنانچہ انہوں نے پاکستان کے اندر موجود جمہوری پارٹیوں کو بھی دیوار سے لگانا شروع کردیا۔ دینی سیاسی

جماعتوں اور عسکری تنظیموں کی حمایت بھی کی انہیں مفادات سے بھی نوازا یہی گروہ جرنیلوں کے مستقل اتحادی بن کر سامنے آئے اورانہوں نے نہ صرف ضیاء الحق کو''امیر المومنین'' کا خطاب دیا بلکہ جمہوریت کو کفر قرار دیتے ہوئے ایسے فتاویٰ بھی جاری کیے کہ اسلام میں سیاسی جماعتوں کی گنجائش نہیں ہے جبکہ خود جنرل ضیاء الحق بھی جو خود ایسے ہی ''نظام اسلام'' کو دین کی میراث سمجھتے تھے وہ بھی ان تشریحات کو اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے استعمال کر رہے تھے۔لیکن درون خانہ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ پاکستان میں بھی سعودی نظام کے امکانات تلاش کیے جائیں۔ وہ ایک طرف تو مجلس شوریٰ کے ذریعے ریاستی اور حکومتی امور کو آگے بڑھا رہے تھے تو دوسری طرف شرعی عدالتیں بھی بنوانا چاہتے تھے۔اس کے لیے کچھ علمائے کرام کو سعودی عرب میں تربیت کے لیے بھی بھجوایا گیا تھا۔ اس عدالتی نظام کے لیے سعودی عرب نے سرمائے کی فراہمی پر یقین دہانی بھی کرائی تھی۔

سوویت یونین کے خلاف ''اسلامی جہاد'' کی پس پردہ حقیقت کا اندازہ اس تناظر میں لگانا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آخر ......اس ''جہاد'' میں مسلمانوں کی روایتی دشمن حکومتیں اور خفیہ ادارے بھی کام کر رہے تھے جس میں اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد اور بھارتی ایجنسی را بھی شریک تھی اور یہ سب جہادیوں کے ساتھ مل کر اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی تھیں تو کیوں؟؟ جبکہ موساد کے اہلکاروں کو تو پاکستان میں نقل وحرکت کی مکمل آزادی تھی ان اداروں کی مداخلت نے اس خطے میں ایک ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ جس سے یہ خطہ ابھی تک آزاد نہیں ہو سکا۔ آج بھی ان اداروں کی اس علاقے میں سرگرمیوں کی اطلاعات سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر موجود ہیں۔

ایک اور سچائی تو یہ بھی ہے کہ......80ء سے لے کر 89ء تک اور پھر اس کے دو سال بعد تک ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف عسکریت پسندی اور شدت پسندی کی نرسریوں سے اتنی زیادہ فصل تیار ہو چکی تھی جس کے زہریلے ثمرات بعد میں دنیا کے لیے زہر قاتل بنتے گئے......بلکہ اس علاقے میں موجود پناہ گاہوں نے مستقل مسکنوں کا روپ اختیار کر لیا اور ان کی شاخوں نے پاکستان اور افغانستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ......سوویت یونین کی واپسی کابل میں روس نواز حکومت کے خاتمہ، جنیوا امن معاہدے اور افغانستان میں حزب اسلامی اور

شمالی اتحاد کی حکومت کے قیام......اور پھر بہت بعد میں طالبان حکومت کے قیام اور خاتمے کے باوجود یہ زہریلے درخت ختم ہوئے اور نہ ہی ان سے برآمد ہونے والی فصلوں کا سلسلہ روکا جا سکا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو افغانستان اور پاکستان کے جہادی سیاسی اور ذاتی مخالفین پر ٹوٹ پڑے اور جو بھی ان کے مفادات کی راہ میں رکاوٹ بنا اس کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی گئی تو دوسری طرف کچھ تنظیموں نے اسلامی خلافت یا امارت کے قیام کو اولین ترجیح بنا لیا انہوں نے القاعدہ اور اخوان المسلمون جیسی مؤثر اور متحرک تنظیموں کی پاکستان میں مزید وسعت کا راستہ بھی ہموار کیا اور پھر بعد کے حالات نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ اس آئیڈیالوجی یا پھر ان کے نظریات کی مخالفت میں جو بھی قوت اور شخصیت آئے گی اس کو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔

اگرچہ......ان تنظیموں کے درمیان سیاسی اور مفاداتی ٹکراؤ موجود تھا ان کے درمیان اس پس منظر میں واضح اختلافات بھی تھے لیکن اس کے بالمقابل اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ سیکولر، ترقی پسند اور جمہوری قوتوں کو راستے سے ہٹانے پر یہ تمام تنظیمیں متحد اور متفق تھیں اور ان میں مکمل فکری ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ یہی نظریہ اور اس پر قوت کا استعمال جمہوریت پسند قوتوں کی کمزوری اور ناکامی کا سبب بھی بنا کیونکہ یہی وہ قوتیں تھیں جو کسی نہ کسی حد تک جہادی نظریے میں موجود آمرانہ رویہ اور جدوجہد کی مخالفت کر سکتی تھیں چنانچہ نہ صرف ایک طرف تو ان ترقی پسندانہ نظریات کی نفی کی گئی اور انہیں غیر اسلامی قرار دیا گیا بلکہ ان جماعتوں کے قائدین کو بھی ہٹ کرنے سے دریغ نہیں کیا گیا۔

افغان جنگ سے قبل چونکہ یہ دینی سیاسی جماعتیں اور جہادی تنظیمیں مسلک اور فرقوں میں بٹی ہوئی تھیں بلکہ ایک دوسرے کی شدید مخالف ہوا کرتی تھیں انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف وسیع لٹریچر بھی چھاپا ہوا تھا لیکن ان سب کو مفادات کے تحت سوویت یونین کی مخالفت میں اکٹھا کر دیا گیا تھا چنانچہ جب سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی ہوگئی تو ان کا مشترکہ دشمن نہیں رہا تو یہ سب لوگ کابل کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے جبکہ ادھر پاکستان کی عسکریت پسند قوتوں نے بھی ایک دوسرے کو نشانہ بنانا شروع کر دیا اور کچھ تنظیموں نے پاکستان میں جہاد کا آغاز کرتے ہوئے فکری اور نظریاتی غلبے کی

کوششوں کا آغاز کیا اور سب سے پہلے شیعہ مکتبۂ فکر کو نشانے پر رکھ لیا ایک نقطۂ نظر تو یہ بھی ہے کہ ان مخصوص تنظیموں کو ریاستی سرپرستی بھی حاصل تھی کیونکہ خود جنرل ضیاء الحق بھی ایک موقع پر اہل تشیع کو غیر مسلم قرار دینے کی بات کر چکے تھے۔ یہ وہ تنظیمیں تھیں جو افغان جہاد کے دوران اسلحہ سے لیس ہو چکی تھیں اور ان کے پاس دولت و طاقت بھی وافر تھی ان کے لیے مخالفین کو طاقت کے ذریعے راستے سے ہٹانا کچھ مشکل نہیں تھا جس کے دفاع میں شیعہ تنظیمیں بھی وجود میں آئیں اور انہوں نے بھی جوابی حملے شروع کر دیئے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب پاکستان میں طاقت اور تشدد کے ذریعے اپنے نظریات کے غلبہ اور اپنے مفادات سے جڑی باتوں کو منوانے کا خطرناک رجحان سامنے آیا۔

افغانستان میں سوویت یونین اور اس کے حمایتیوں کے بعد مجاہدین کی آڑ میں ''وار لارڈز'' آ گئے جنہوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنی علاقائی بالادستی ثابت کرنے کے لیے افغانستان کی سرزمین کو تاراج کر دیا لیکن یہ پاکستان کی منصوبہ بندی کا حصہ نہیں تھا بلکہ پاکستان نے ان مخالفین کو متحد کرنے کی بہت کوشش کی اور وہاں کچھ لوگوں کے سروں پر دست شفقت بھی رکھا لیکن یہ گروہ اسی علاقائی، لسانی اور علاقائی مفادات کی بنا پر ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا نہیں ہو سکے تو طالبان کو تیار کیا گیا۔ یہ پیپلز پارٹی کے دوسرے دور میں ہوا۔ جنرل نصیراللہ بابر جو اس وقت وزیر داخلہ بھی تھے امریکن سفیر کے ساتھ کوئٹہ گئے اور وہاں قندھار سے آئے ہوئے ''مہمانوں'' کے ساتھ ان کے مذاکرات ہوئے جس کے بعد وہ سرخ آندھی کی طرح اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے کابل کے نواح تک پہنچ گئے اور پھر کچھ ہی دنوں میں ''شمالی اتحاد'' کے علاقوں کو چھوڑ کر پورے افغانستان پر قابض ہو گئے۔ انہیں امریکیوں نے ہی نائن الیون کے بعد کی صورتحال میں اقتدار سے علیحدہ کیا۔ لیکن دلچسپ بات تو یہ بھی ہے کہ افغانستان پر امریکی فضائی حملوں کا کہیں سے بھی کوئی مؤثر جواب نہیں دیا گیا۔ بلکہ طالبان بغیر کسی بڑی مزاحمت کے ہی کابل چھوڑ گئے۔ شاید یہ بھی ان کی حکمت عملی کا حصہ تھا اس طرح وہ اپنی فوجی قوت اور اسلحہ بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ان کے مستقبل میں امریکہ کے خلاف شروع ہونے والی مزاحمتی کارروائیوں میں کام آ سکتا تھا...... بہرحال، اس تمام عرصہ میں افغانستان مجاہدین کے قبضہ میں رہا تو پاکستان میں بھی مقامی عسکری تنظیموں کی گرفت بھی مضبوط ہو گئی

بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ غیر مقامی عسکری جہادی قوتیں بھی بوجوہ پاکستان کے خلاف ہوگئیں جو پاکستان اور امریکہ کے ساتھ مل کر کئی سال افغانستان میں سوویت یونین اور اس کے حامیوں کے خلاف جنگ میں شامل رہی تھیں لیکن...... یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

نائن الیون کے بعد جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو اس کو دنیا کے 92 ممالک کی حمایت حاصل تھی جن میں پہلے سے برعکس اس دفعہ کچھ اہم ترین مسلم ممالک اب جہاد کے بجائے دہشت گردی کے خلاف شروع ہونے والی جنگ جو بظاہر القاعدہ کے خلاف لڑی جا تا تھی امریکہ کی صف میں کھڑے ہوگئے جس میں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات وغیرہ جہاں مبینہ طور پر امریکی غلاموں کی حکومت تھی وہ القاعدہ کے خلاف امریکہ کی حمایت کرنے لگے۔ خصوصاً وہ ممالک جہاں القاعدہ کے نیٹ ورک موجود تھے اور وہ غیر علانیہ یا علانیہ بادشاہتوں کے خلاف کام کر رہے تھے اگرچہ یہ تصور بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ بادشاہت کی جگہ جس خلافت یا امارات کا نظام لانا چاہتے تھے وہ کسی حد تک جاری نظام سے مختلف تھا اور اس میں عوام کی رائے کا کسی حد تک احترام شامل تھا۔ چنانچہ اس تناظر میں سعودی عرب کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ ''خاندانی'' اور قبائلی لڑائی تھی۔ بہرحال ایک سو سے زیادہ مختلف تنظیمیں ایسی تھیں جو مختلف ممالک میں ''القاعدہ'' کی طرح حکمرانوں کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں۔ وہ سب 'جہاد' کے نام پر افغانستان میں جمع ہوئی تھیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ ان تنظیموں کو سعودی عرب نے ہی افغانستان بھیجنے میں اہم کردار ادا کیا اور پھر ان کی مالی معاونت بھی کی چنانچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سعودی عرب نے اپنے گلے کے طوق اتار کر افغانستان میں پھینک دیئے تھے جو طالبان کا حصہ بن گئے۔

طالبان کی تحریک تو 1996ء میں اٹھی تھی جس کو آئی ایس آئی، سی آئی اے اور مشرق وسطیٰ کے وہ ممالک جو امریکہ کے زیر اثر تھے، کی حمایت حاصل تھی۔ جبکہ کچھ کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ افغانستان میں ''اسلامی حکومت'' قائم کر کے رہیں گے۔ یہ افغانیوں کی بدقسمتی تھی کہ جو عرب ممالک مجاہدین، القاعدہ، طالبان اور مختلف گروپوں کی سرپرستی کرتے رہے تھے وہ ان کے اس کھیل کو نہیں سمجھ سکے حالانکہ یہ وہ ممالک تھے جن کے ہاں اس قسم کی تنظیموں پر سخت پابندی عائد تھی بلکہ انہیں اپنی ''دعوتی سرگرمیوں'' کی بھی اجازت نہیں تھی۔

1992ء میں القاعدہ افغانستان میں مجاہدین کی امداد کے لیے آئی تھی لیکن 94-1993ء تک اس کا طالبان کے ساتھ رابطہ ہو چکا تھا۔96ء میں جب طالبان کابل میں داخل ہوئے اور انہوں نے حکومت میں شامل گروپوں کے آپسی اختلافات کے باعث کابل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو القاعدہ رہنماؤں نے دوسرے ممالک پر بھی توجہ مرکوز کرنا شروع کر دی جہاں ان کے لیے 'عملی کارروائی' کچھ ایسی زیادہ مشکل نہیں رہی تھی وہ سوویت یونین کے خلاف مزاحمت میں بہت کچھ سیکھ چکے تھے اور انہیں اس قسم کی کاررو ے کے لیے کسی غیر معمولی تربیت کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی جو ان ممالک کے القاعدہ ے خلاف اتحاد کا باعث بھی بنیں۔ مزید یہ کہ جب طالبان حکومت نے مجرموں کو سخت سزائیں دیں، چوروں کے ہاتھ کاٹنے، زانیوں کو سنگسار کرنا اور سرعام قتل کے بدلے میں قتل شروع ہوئے تو یہ سزائیں موجود دنیا میں ''غیر انسانی'' قرار دی جانے لگیں اسی طرح جب طالبان نے گوتم بدھ کے تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی ورثہ کو ''غیر اسلامی'' قرار دے کر ختم کیا تو پوری دنیا اس 'ورثہ' کی تباہی پر صدائے احتجاج بلند کرنے لگی تھی۔ اسی طرح عورتوں پر پابندیاں عائد کی گئیں جدید علوم پر قدغنیں لگیں تو دنیا افغانستان پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور ہوگئی اور اس کو تشویش کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔

ادھر پاکستان جو مجاہدین کی آپسی لڑائیوں سے بہت حد تک اضطراب میں تھا کیونکہ بدقسمتی تو یہ بھی تھی کہ پاکستان نے جس گروپ کے بھی سر پہ ہاتھ رکھا وہ یا تو بہک گیا یا پھر وہ معیار پر پورا نہیں اتر سکا۔ پاکستان نے بہت کوشش کی کہ ان گروپوں کے درمیان اقتدار کے مسئلہ پر اتفاق رائے ہو جائے۔ کیونکہ پاکستان کی ریاست کا ایک مخصوص حصہ یہ طے کر چکا تھا کہ افغانستان میں ایک ایسی حکومت کا قیام ضروری ہے جو پاکستان کے زیر اثر ہو۔ ایک زمانہ تھا جب پاکستان کے کچھ حلقے افغانستان کو ''پانچویں صوبے'' کے طور پر بھی دیکھتے رہے تھے لیکن اب ان کی حکمت عملی تبدیل ہو چکی تھی یہ وہی پالیسی تھی جو ایوب خان کے زمانہ میں بھی سامنے آئی تھی لیکن ضیاء الحق کے زمانہ میں سوویت فوجوں کے خلاف مزاحمت کے وقت کھل کر سامنے آئی اور اس کا تسلسل بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے ادوار میں بھی دکھائی دیتا رہا۔

(یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے دونوں ادوار کی

حکومتیں اقتدار تک ہی محدود تھیں ان کا پالیسی سازی میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ 1977ء کے بعد سے تمام پالیسیاں فوج کے کنٹرول میں تھیں اور یہ سلسلہ آج 2009ء میں بھی جاری ہے۔)

چنانچہ یہ نوازشریف ہی تھے جنہوں نے مجاہدین کے کابل میں داخلے کا راستہ ہموار کیا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے خلاف اسلام آباد میں افغانستان کی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا تھا اس موقع پر ان کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ وہ صبغت اللہ مجددی کے صدر بننے کے تیسرے روز ہی انہیں مبارکباد دینے کابل پہنچ گئے اور کابل ایئرپورٹ پر فرط جذبات میں انہوں نے شکرانے کے نوافل بھی ادا کیے تھے.....میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے یہ اعلان بھی کیا کہ مجاہدین کابل کی فتح کے بعد اب کشمیر اور فلسطین کو بھی آزاد کروائیں گے۔ یہ درحقیقت پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا وہ اعلان تھا جو مستقبل کی منصوبہ بندی کا حصہ تھا۔ کیونکہ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ مجاہدین کے ذریعے کشمیر کو بھی آزاد کرا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ......ایک تسلسل میں پاکستانی حکمرانوں کا رویہ افغانستان کے بارے ایک مخصوص حکمت عملی کا ہی حصہ رہا ہے۔ بینظیر بھٹو کے دور میں اگر چہ جنرل نصیراللہ بابر وزیرداخلہ تھے لیکن افغانستان کے مسئلہ پر وزیرخارجہ کا کردار بھی وہی ادا کرتے تھے ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ طالبان انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھے اور یہ جنرل بابر ہی تھے جو طالبان کو اپنے بچے قرار دیتے تھے۔ وہ اکثر افغانستان کے دورے کرتے رہے مگر طالبان مخالف قوتوں کی حمایت حاصل نہیں کر سکے۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ بھی ہے کہ پاکستان کی حکومتوں کے ساتھ سیاسی قوتوں کا بھی افغانستان کے حوالے سے وژن کچھ واضح نہیں رہا بلکہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی ترجیحات کے ہی تابع رہے اسی طرح ترقی پسند اور سیکولر جماعتیں بھی کوئی واضح مؤقف اختیار کرنے کے بجائے گومگو کی کیفیت سے دوچار رہیں۔ خصوصاً پشتون قوم پرست جماعت عوامی نیشنل پارٹی جس کے 'جدامجد' غفار خان کو افغانی ہونے کی بنا پر کابل میں لے جا کر سپرد خاک کیا گیا تھا وہ بھی صورتحال کا صحیح ادراک نہیں کر سکی یا پھر آنے والے لمحوں کا صحیح تجزیہ کرنے میں ناکام رہی۔ ایک وقت پر وہ ببرک ولی بھائی بھائی، اور نجیب ولی بھائی بھائی کے نعرے لگاتی رہی لیکن 1990ء میں جب یہ پارٹی اقتدار میں آئی اور نوازشریف کھل کر مجاہدین

کی حمایت کر رہے تھے تو حکومت اور نواز شریف کے اتحادی کی حیثیت سے ایک مرتبہ بھی اس پارٹی نے انہیں افغانستان کے بارے پالیسی پر نظر ثانی کے لیے کہا اور نہ ہی حکومت میں شمولیت کے لیے عدم مداخلت کی کوئی شرط رکھی بلکہ حکومت کے ساتھ اتحاد کو محض اس بنا پر لٹکائے رکھا کہ پارٹی لیڈر اور بیگم نسیم ولی خان کے بھائی اعظم ہوتی کو ان کی مرضی کی وزارت دی جائے۔

بہرحال......وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو افغانستان کے بارے پاکستانی حکمرانوں، ریاستی اداروں اور سیاستدانوں کا کردار کچھ زیادہ مختلف نہیں رہا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہ تو افغانی اعتماد پر پورا اترے اور نہ ہی پاکستان کے حکمران ان کے لیے قابل بھروسہ ثابت ہوئے یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں پے در پے تجربات ہوتے رہے کبھی گلبدین پسندیدہ ہوا تو کبھی مجددی کو پسند کرلیا گیا اور کبھی طالبان ہر دلعزیز ٹھہرے۔ جو اس کی ناکام حکمت عملی کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن دوسری طرف افغانی بھی یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوگئے کہ ان کی مشکلات کا ایک بنیادی اور مستقل سبب پاکستان کا ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے رہنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج افغانستان کے سیاسی اور مذہبی قائدین پاکستان کو ہی اپنا اولین دشمن سمجھنے لگے ہیں۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ 94-1993ء میں طالبان افغانستان میں داخل ہوئے تو اس کے ساتھ ہی پاکستان کے صوبہ سرحد کے اندر مالاکنڈ ڈویژن میں طالبان ہی کی طرح تحریک نفاذ شریعت محمدی کے نام پر ایک مزاحمتی گروپ وجود میں آکر میدان میں اتر آیا تھا اور یہی وہ گروپ تھا جو افغانستان میں امریکی حملے کے دوران طالبان کی مدد کے لیے بھی گیا تھا۔ لیکن ایک تاریخی حقیقت تو یہ بھی ہے کہ جب اسی کی دہائی میں افغانستان اور کشمیر میں مزاحمت کی ابتدا ہورہی تھی تو پاکستان میں بھی ایسی ہی تنظیموں کا قیام عمل میں آرہا تھا اور وہ اپنی سرگرمیوں کے لیے تیار ہورہی تھیں جو ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف فرقہ واریت، انتہاپسندی اور مزاحمت کا راستہ ہموار کررہی تھیں۔

اس تمام پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے جہادی اداروں اور شخصیات نے اس پورے عرصہ کے دوران میں اگر ایک طرف افغانستان میں مجاہدین، طالبان

اور القاعدہ جیسی تنظیموں کی سرپرستی کی ہے تو دوسری طرف وقتاً فوقتاً پاکستان کے اندر بھی کھل کر ایسی تنظیموں کی آبیاری کی ہے جو پاکستانی معاشرے اور سیاسی عمل میں جہادی نظریات، فرقہ واریت اور انتہاپسندی کے فروغ کا باعث بنیں جس کے نتیجہ میں پاکستان کو آج اندرون اور بیرون دونوں اطراف سے عسکریت پسندوں کے شدید حملوں کا خطرہ ہے بلکہ خود پاکستان کی سلامتی کو بھی شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔

اس صورتحال کا ایک اور نتیجہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ پاکستان کے خلاف نہ صرف افغانستان کے سیاسی اور عوامی حلقوں میں نفرت شدت اختیار کرگئی ہے بلکہ پاکستان کے اندر بھی وہ عناصر ریاست اور حکومت کے لیے چیلنج بن گئے۔ انتظامی اور حکومتی ادارے اور مخصوص شخصیات ان کے حملوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ریاست کی سرپرستی میں پل بڑھ کر مضبوط اور توانا ہوئے تھے۔ یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس نے 2002ء میں امریکی حملے کے بعد پاکستان کو امریکہ، برطانیہ اور اتحادی عرب ممالک کی نظروں میں اپنے نئے مفادات اور ترجیحات میں ایک ایسے موڑ پر لاکھڑا کیا تھا جس کا پاکستان کے حکمرانوں اور اداروں نے نائن الیون سے قبل کے سیاسی اور علاقائی منظرنامے میں تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس پس منظر میں ایک اور حقیقت تو یہ بھی ہے جو ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتی ہے کہ پاکستان کے پالیسی ساز بدلتی ہوئی دنیا کی ترجیحات کو سمجھ نہیں رہے تھے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ امریکہ میں وسطی اور جنوبی ایشیا کے حوالے سے کیا بنیادی سٹرٹیجک تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں یا پھر وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ امریکہ پاکستان کو جغرافیائی اہمیت کی بنا پر نظرانداز نہیں کرسکتا۔ یا پھر یہ کہ......امریکہ کو افغانستان میں پاکستان کی دلچسپی کا صحیح علم نہیں تھا؟ لیکن پاکستان کو جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھ دیگر کئی اہم جرنیلوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا اور وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے کہ یہ حادثہ کیوں ہوا تھا؟ اور اس میں افغان پالیسی کا کہاں تک دخل تھا؟ اگر نہیں یہ سب کچھ معلوم تھا تو انہوں نے طالبان اور القاعدہ حکومت کے قیام اور اس کے اثرات ونتائج کو بدلتے ہوئے امریکی رویے میں کیوں نہیں دیکھا اور طالبان کی سرپرستی ہی کو کیوں اپنائے رکھا؟ یا پھر وہ امریکہ کو نظرانداز کرکے ایسا کر رہے تھے تو کیا وہ امریکہ کی بدلی ہوئی نظروں کو افورڈ کرسکتے تھے؟ حالانکہ وہ

ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایسا کر سکتے تھے تو وہ ایک ہی ٹیلی فون پر افغانستان سے پیچھے ہٹنے پر تیار نہ ہوتے اور سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ بلند نہ کرتے؟ یہ الگ بات کہ بعد کے حالات میں یہ حکمت عملی بھی غلط ثابت ہوئی۔ اور وہ بھی ریاست میں موجود ان عناصر کی وجہ سے جو 71ء کی جنگ سے لے کر افغانستان میں سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی تک جہادی فلسفے کے مالک بن چکے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اس فلسفہ کے ذریعے پوری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں یہی وہ عناصر تھے جو پاکستانی ریاست کی سرپرستی میں سیاست اور معاشرت میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کر چکے تھے۔

چنانچہ......افغانستان پر امریکہ کے قبضہ کے بعد پاکستان کو حقیقتاً ایک پیچیدہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا جس میں ایک طرف تو اسے افغانستان سے آنے والے القاعدہ اور طالبان عناصر سے نمٹنے کا مسئلہ درپیش تھا تو دوسری طرف افغانستان میں رہ جانے والے طالبان اور مجاہدین کو بھی یہ توقع تھی کہ پاکستان اس برے وقت میں ان کی مدد ضرور کرے گا۔۔ انہیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ لیکن پاکستان عالمی اتحاد کے بالمقابل مزاحمتی رویہ اختیار نہیں کر سکا تو جنرل مشرف نے بعض مضبوط اداروں، گروپوں اور افراد کی مخالفت کے باوجود سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ بلند کرتے ہوئے دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد کا حصہ بننے کا اعلان کر دیا اور یوں پاکستان کی افغانستان کے حوالے سے ترجیحات ضعف کا شکار ہو گئیں اور ریاست کے لیے ایک بہت بڑے بحران کا باعث بن گئیں۔

2002ء میں جب امریکا اور اس کی اتحادی نیٹو افواج نے افغانستان پر حملہ کر کے طالبان کو پسپا ہونے پر مجبور کیا تو بے شمار طالبان اور القاعدہ کے جنگجو شمالی اور جنوبی وزیرستان، کرم ایجنسی کے راستے پاکستانی قبائلی علاقوں میں داخل ہو گئے۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں جنگجوؤں اور مجاہدین کے پہلے سے رابطے اور ٹھکانے موجود تھے اور جو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھے تھے۔ ان کو یہاں پناہ گزین ہونے میں کسی بڑی مشکل سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ جس کے نتیجہ میں پاکستان کے یہ قبائلی علاقے ان تمام عناصر کے ٹھکانے بن گئے جن کی امریکہ اور نیٹو افواج کو تلاش تھی۔

یہاں ایک دلچسپ سوال یہ بھی ہے کہ......جب امریکہ افغانستان پر فضائی حملے

کررہا تھا اور طالبان اور القاعدہ کے جنگجو وہاں سے فرار ہوکر ان قبائلی علاقوں میں آرہے تھے پاکستان نے ان کی آمد کیوں نہیں روکی؟ یا پھر ان علاقوں سے ملحقہ سرحد کی نگرانی کیوں نہیں کی؟

بہرحال......جب ان جہادی گروپوں نے چند ماہ سنبھلنے کے بعد سرحد پار کرکے افغانستان میں امریکی اتحادی فوجوں کو نشانہ بنانا شروع کیا تو پاکستان کے لیے ایک نئے آزمائشی دور کا آغاز ہوا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب پاکستان امریکہ کے لیے بھی ناقابل اعتماد ہوگیا تو دوسری طرف طالبان بھی اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ ہی وہ گروپ اب پاکستان کے اداروں پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار تھے جو کشمیر اور افغانستان میں ان کے ساتھ تعاون کرتے رہے تھے چنانچہ جب بعض دوسری وجوہات کے علاوہ پاکستان نے امریکہ کو شیشے میں اتارنے اور عالمی دباؤ کو کم کرنے کے لیے وزیرستان میں فوج داخل کی تو اس کو شدید ترین مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ فوجی حکومتوں کی پالیسیوں میں چونکہ عوام اور صاحب الرائے لوگوں کی مشاورت شامل نہیں ہوتی اور فوج کا طرزِ عمل تسلط اور غلبے کی بنیاد پر ہوتا ہے اس لیے وقت کے ساتھ معاملات اس کے ہاتھ سے نکلتے گئے اور بچی کھچی وہ جہادی قوتیں بھی مخالف ہوگئیں جو ہر حال میں فوج کی حمایت کرتی رہی تھیں۔ مشرف حکومت کی دوہری پالیسی فریقین کے درمیان فاصلوں اور نفرتوں کا باعث بنتی گئی اور یوں 2007ء تک 'جہادی قوتوں' نے قبائلی علاقہ جات کے ساتھ صوبہ سرحد کے بندوبستی علاقوں کو بھی اپنی کارروائیوں کے لیے ہدف بنالیا جس کے بعد آج یہ حالت ہے کہ صوبہ سرحد کے بعد پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں بھی ان عناصر کی سرگرمیوں کے شواہد مل رہے ہیں۔

باب 2

عسکریت پسند گروپ اور اُن کی لیڈرشپ

گزشتہ باب میں ہم ان عوامل ومحرکات پر بحث کرتے رہے ہیں کہ کس طرح ان تنظیموں اور گروہوں کی تشکیل ہوئی اور وہ کیا مقاصد تھے کہ جن کے لیے نہ صرف انہیں قوت اور طاقت فراہم کی گئی اور پھر انہیں سوویت یونین کے خلاف استعمال کیا گیا اس میں حکومتوں اور اداروں کا کردار کیا تھا اور انہیں کس طرح نظریاتی اور سیاسی حمایت فراہم کی گئی۔ لیکن ایک اور تلخ سچائی تو یہ بھی ہے کہ ان مجاہدین اور عسکریت پسند تنظیموں کے پاس ایک نظریاتی حوالہ اور اس کا ایک واضح مقصد بھی تھا جس کے ساتھ وہ جسم و جاں اور روح وقلب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ 'کافروں' کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اگر وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں تو ایک ایسی 'اسلامی ریاست' قائم کرنے میں سرخرو ہوں گے جس میں ان کے اپنے مخصوص تشریحاتی نظام میں ہی سہی اسلامی نظام کا نفاذ ہوگا لیکن اگر وہ مارے جاتے ہیں تو شہید ہو کر جنت میں جائیں گے۔ یہی وہ اساس تھی جو اس جنگ کی قوت متحرکہ تھی جو وقت کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی رہی۔ اسے پاکستان کے مذہبی عناصر بھی خصوصاً مدرسوں سے 'نیا خون' بھی فراہم ہوتا رہا۔ تو دوسری طرف یہ تنظیمیں اور گروہ ریاستی، حکومتی اور انتظامی ڈھانچوں پر بھی ہوم ورک کرتے رہے۔

چنانچہ پاکستان میں افغان جہاد اور موجودہ مذہب کے نام پر جاری مزاحمت سے وابستہ اسلام پسند رہنماؤں اور عسکری کمانڈروں کی تعداد اور پس منظر کا عمیق جائزہ لیا جائے تو

اس تاثر کو مزید قوت حاصل ہوتی ہے کہ ان طالبان کے پاس اپنا آئیڈیل نظام چلانے، دفاعی حکمت عملی اور قیادت کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک پورا سسٹم موجود ہے اور انہوں نے ماضی کی غلطیوں سے بھی بہت کچھ سیکھ کر نئے زاویے مرتب کر رکھے ہیں بلکہ ان کے پاس متبادل قیادت کے لیے بھی بہت سے تجربہ کار، کمٹڈ اور اہل افراد کی پوری کھیپ تیار ہو چکی ہے جو وقت اور حالات کی بھٹی سے نکل کر کندن بن کر سامنے آئی ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ......طالبان اور اس سے متعلقہ دوسری تنظیموں نے اپنی قیادت کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ 'فیصلہ سازی' اور پالیسی سازی کرتا ہے جبکہ دوسرا حصہ عسکری امور اور حکمت عملی بنانے اور اس پر عملدرآمد کا ذمہ دار ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنے اور دیگر متبادلات نمٹانے کے لیے دیگر اہل افراد کو متعین کیا گیا ہے۔ پاکستان کی سات قبائلی ایجنسیوں میں ان لوگوں نے باقاعدہ نیٹ ورک بنایا ہوا ہے جبکہ ایک درجن سے زائد عسکری تنظیموں کے درمیان جہادی طریقہ کار، مخالفین کے تعین، عالمی طاقتوں اور غیر ملکیوں سے تعلقات، متبادل نظام کے بنیادی نکات پر شدید اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن القاعدہ اور طالبان کی سرپرستی ان اختلافات کو آگے بڑھنے نہیں دیتی بلکہ ایسے اختلافات کو ثانوی قرار دے کر فوری طور پر 'بنیادی مقاصد' پر متحد اور متفق کر لیا جاتا ہے۔

اس باب میں ہم ان تنظیموں کی نشاندہی کی کوشش کریں گے جو قبائلی علاقوں میں مسلم دنیا میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی آئیڈیالوجی کے لیے فکری اور عسکری محاذوں پر سرگرم عمل ہیں اور وہ تیزی کے ساتھ اس جانب بڑھ رہی ہیں۔ قبائلی علاقوں میں اس وقت بائیس جنگجو تنظیمیں سرگرم عمل ہیں جو مؤثر بنیادی تنظیمی ڈھانچہ بھی رکھتی ہیں۔

حقانی گروپ

یہ وہ گروپ ہے جس نے افغان جہاد کے دوران ابتداء ہی سے اپنے بانی اور سپریم کمانڈر جلال الدین حقانی کی قیادت میں نہ صرف مدارس اور تربیتی مراکز قائم کیے بلکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں کے علاوہ افغانستان بھر میں اپنی جدوجہد، قربانیوں اور لائحہ عمل کے باعث نمایاں اہمیت اور عزت کا مقام پا کر 1978ء سے لے کر اب تک اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔

قوم کے نام خصوصی پیغام

کہ بیت اللہ محسود نے اسلام کے لباس میں جو بھی کارروائیاں شروع کی ہیں [illegible] اسلام نہیں۔ یہ شرپسندی ہے۔ مجاہدین کے نام پر انہوں نے جو بھی کارروائیاں کی ہیں۔ یہ جہاد نہیں اپنے ظالمانہ اقتدار کو بچانا ہے۔ جیسا کہ آپ قوم کو بخوبی اندازہ ہے۔ کہ مولوی حسن [illegible] کا درس دیتا تھا۔ اور اس ظالم نے بھی بہت [illegible] نے شہید کر دیا [illegible] علاوہ کئی مخلص مجاہدین جیسا کہ حاجی سدر [illegible] محمد شاد [illegible] عبدالحنان، ڈاکٹر مولوی مسعود حسن [illegible] زرمان خان [illegible] بیت اللہ محسود ان کے علاوہ بیت اللہ کے [illegible] ان کے علاوہ ہزاروں [illegible] قوم کے [illegible] والا اور ان کے خاندان [illegible] کے شہادت [illegible] بے گناہ [illegible] مسجدوں [illegible] بازاروں میں [illegible] شہید کئے گئے [illegible] ہے۔

قوم سے پوچھتا ہوں۔ کہ کیا یہ جہاد ہے اسلام کا مذہب ہے [illegible] کا درس دیتا ہے۔

مجاہدین بھائیوں کے نام خصوصی [illegible]

مجاہدین بھائیوں کو ہماری طرف سے یہ خصوصی پیغام ہے [illegible] کی کا [illegible] امریکہ [illegible] [illegible] علماء صاحبان کی روشنی میں ہوتا ہے۔ جب آپ کا [illegible] ان ہو گئے۔

علماء کرام صاحبان کے نام خصوصی پیغام

علماء کرام کو میں خصوصی اپیل کرتا ہوں۔ کہ بیت اللہ محسود کے گزر [illegible] آپ علماء صاحبان کی حق کے کہنے میں کچھ مجبوریاں تھیں۔ اب میں آپ صاحبان کو خصوصی اپیل کرتا ہوں کہ حق والوں کا ساتھ دیں۔ ان کے علاوہ بیت اللہ محسود اور ان کے چند [illegible] جیسا کہ عصمت اللہ اور [illegible] جوان کے اتحادی ہیں۔ میں ان کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں۔ کہ ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ ورنہ دنیا و آخرت میں رسوا اور ذلیل ہو گے۔

شکریہ

منجانب: امیر محترم [illegible] آپ کا امیر محترم [illegible] مسعود

اس گروپ کو القاعدہ سمیت دوسری عالمی جہادی تنظیموں کی بھرپور معاونت حاصل رہی ہے۔ اس گروپ کی قیادت پاکستان میں جلال الدین حقانی کے صاحبزادے سراج الدین حقانی المعروف خلیفہ جی کے پاس ہے۔ یہ گروپ غیر ملکی جنگجوؤں، پاکستانی طالبان اور افغان طالبان کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ اس گروپ نے پولیٹیکل ونگ اور تھنک ٹینکس بھی بنا رکھے ہیں۔ پولیٹیکل ونگ میں مولوی گل رمضان ساکن میران شاہ، مولوی نعیم ساکن ایف آر بنوں اور مولوی محمد علیم ساکن وزیرستان کے علاوہ بہت سے عرب اور سنٹرل ایشین ماہرین شامل ہیں۔

عسکری ونگ کی ذمہ داریاں جلال الدین حقانی کے دو اور بیٹے ناصر الدین حقانی اور بدرالدین حقانی کے کاندھوں پر ہیں۔ یہ گروپ متعدد کشمیری اور عرب تنظیموں کو بھی اپنے ساتھ چلا رہا ہے۔ حقانی گروپ کو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو وزیرستان اور بعض دوسرے علاقوں کے علاوہ مختلف امور پر افغانستان میں بھی ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بیت اللہ محسود اور حافظ گل بہادر کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جو کہ ایک دوسرے کی مخالفت کے باوجود (ماضی قریب میں) پاکستان کی حد تک خود کو سراج الدین حقانی کی قیادت اور ڈسپلن کا حصہ سمجھتے رہے اور حقانی نے ان کو ٹکراؤ کی حالت سے بچائے رکھا۔ اسی طرح بعض کشمیری اور عرب تنظیموں سمیت دوسرے گروپوں کے درمیان بھی جب کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے تو حقانی گروپ کے اکابرین ایسے ہر مسئلے کو نمٹا لیتے ہیں۔

یہ گروپ شیعہ مسلک اور افغانستان کے شمالی اتحاد کا سخت مخالف سمجھا جاتا ہے۔ اس گروپ کے ارکان اور جنگجوؤں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور یہ ڈیورنڈ لائن کے دونوں اطراف میں بہ کثرت موجود ہیں۔

تحریک طالبان پاکستان (بیت اللہ محسود)

یہ نہ صرف پاکستانی طالبان کا مؤثر ترین گروپ ہے بلکہ اس کو یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ اس نے جہاد کے کاز اور عملی مزاحمت کے سلسلے کو دوسری قبائلی ایجنسیوں، صوبوں اور اضلاع تک بھی پھیلا دیا ہے۔ اس تنظیم کو بیت اللہ محسود ولد محمد ہارون قوم بدوی خیل ساکن

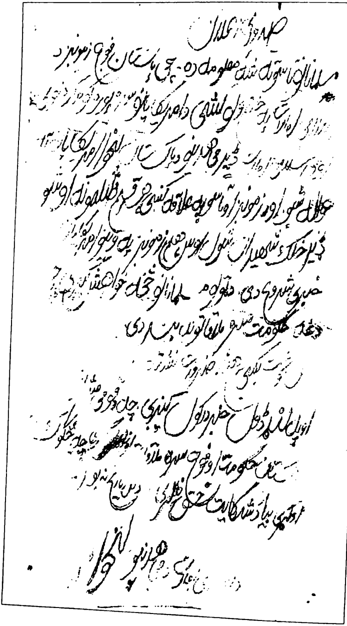
مسلمانانو تاسو ته ښه معلومه ده چی پاکستان فوج زمونږ د
[illegible] د امریکی په [illegible]
[illegible] ډیر مجاهدین [illegible]
[illegible] شو او زمونږ او تاسو په علاقه کښی [illegible] قبضه کړی ده او تاسو
ډیر خلک شهیدان شول [illegible]

لدھا پیدائش ضلع بنوں نے 2007ء کو قائم کیا جسے بعد میں کالعدم قرار دیا گیا۔ جن علاقوں میں اس گروپ کے کمانڈرز اور حامی مصروف عمل ہیں ان میں جنوبی اور شمالی وزیرستان، کرم اورکزئی، مہمند، خیبر اور باجوڑ کی قبائلی ایجنسیاں شامل ہیں۔ یہ وہ واحد گروپ ہے جس نے پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں بھی اپنی شاخیں قائم کررکھی ہیں اور اس کو وہاں سے افرادی قوت بھی ملتی ہے۔ جبکہ صوبہ سرحد کے ایک درجن سے زائد اضلاع میں بھی اس کے حامی موجود ہیں۔جنوبی وزیرستان کا علاقہ مکین اس گروپ کا ہیڈکوارٹر ہے۔

پاکستانی فورسز سے برسرپیکار مختلف علاقوں کے زیادہ تر کمانڈروں کا تعلق اس گروپ سے رہا ہے۔ جو اہم کمانڈر اس گروپ کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں یا اس کی حمایت کرتے ہیں ان کے نام یہ ہیں

جنوبی وزیرستان

(1) قاری حسین ولد محمد الیاس علاقہ سراروغہ (2) کمانڈر سلیم ساکن لدھا (3) رئیس خان ساکن وزیرستان (شرعی عدالتوں کا قاضی القضاۃ بھی رہا ہے) (4) کمانڈر عظمت اللہ قوم شوبی خیل ساکن بروند (5) مولوی حکیم اللہ المعروف جمشید شامل ہیں۔ قاری حسین احمد کا یہ گروپ خودکش سکواڈ اور پرتشدد کارروائیوں کی شہرت رکھتا ہے۔

2009ء کے آغاز میں اس گروپ نے ایک سی ڈی کے ذریعے لاہور، راولپنڈی اور اسلام آباد میں ہونے والے متعدد خودکش حملوں کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ قاری حسین احمد ماضی میں بیت اللہ محسود کے اتحادی تھے لیکن بعد میں ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔

شمالی وزیرستان

شمالی وزیرستان میں محسود گروپ کے قابل ذکر عہدیدار کمانڈر یہ ہیں:

(1) مولانا نور سید امیر برائے شمالی وزیرستان ساکن رزمک سروبی (یہ کمانڈر خیبر اورکزئی ایجنسی میں بھی فرائض انجام دے چکا ہے۔ (2) کمانڈر فقیر داوڑ المعروف ڈاکٹر (کمانڈر برائے میران شاہ) (3) کمانڈر حاجی آفتاب خان (انچارج برائے میر علی اور مولوی عبداللہ۔ آخرالذکر وہ شخص ہے جن کا کام غیرملکیوں کو پناہ دینا اور ان کے معاملات کی ذمہ

داری پورا کرنا ہے۔

جو دوسرے اہم کمانڈر دوسری ایجنسیوں میں بیت اللہ گروپ کا نیٹ ورک چلا رہے ہیں ان میں کمانڈر حکیم اللہ (اورکزئی، کرم، خیبر کا انچارج) رحمان اللہ، حضرت علی (خیبر ایجنسی) کمانڈر عمر خالد (مہمند ایجنسی) اور حاجی فقیر محمد (باجوڑ ایجنسی قابل ذکر ہیں۔) ان کمانڈروں نے اپنے زیر قیادت علاقوں میں اپنے طور پر دوسرے کمانڈر بھی تعینات کیے ہوئے ہیں مثال کے طور پر مہمند ایجنسی میں عمر خالد کے گروپ میں جو دوسرے اہم لوگ برسرپیکار ہیں ان میں قاری شکیل، سنگین قندھاری، یارسید، اکرام اللہ، درے خان، وجیہہ اللہ، شہزادہ، بلال بخاری، کمانڈر مہربان، احتشام اور کمانڈر موسم شامل ہیں۔ قاری شکیل نائب امیر کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔

اسی طرح باجوڑ ایجنسی میں مولانا فقیر محمد کی ٹیم جن اہم کمانڈروں پر مشتمل ہے ان میں نائب امیر مولانا سید محمد، ترجمان مولوی عمر محسود سالار، کمانڈر رشینا، عنایت الرحمٰن اور کمانڈر عبداللہ شامل ہیں۔ بعض فروعی اختلافات کے باوجود درہ آدم خیل طالبان کے کمانڈر طارق اور کرم ایجنسی کے کمانڈر قاری حسین کو بھی عملاً بیت اللہ محسود گروپ ہی کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ قبائلی علاقوں کے علاوہ سوات، بلوچستان اور سندھ کے طالبان کی وابستگی بھی بیت اللہ محسود گروپ ہی کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔

مقامی طالبان تحریک (شمالی وزیرستان)

یہ گروپ 08-2007ء کے دوران بیت اللہ محسود کی تحریک طالبان پاکستان ہی کا حصہ تھا تاہم بعض اختلافات کے باعث 2008ء کے دوران یہ لوگ ٹی ٹی پی سے الگ ہوگئے (2009ء کو دوبارہ اتحاد قائم کیا) اس گروپ کے امیر کا نام حافظ گل بہادر قوم خیل وزیر ہے۔ اس گروپ کے نائب امیر مولوی نذیر ہیں جو جنوبی وزیرستان میں اس گروپ کے انچارج ہیں۔ ترجمان کا نام مفتی ابو ہارون ہے جو جنوبی وزیرستان کے رہائشی ہیں۔ اس گروپ کو مشہور شخصیت مفتی صادق نور کی سرپرستی حاصل ہے۔

اس گروپ کے دوسرے قابل ذکر کمانڈروں کے نام اور تفصیلات یہ ہیں:

مولوی علم خان قوم خوشحالی وزیر (کمانڈر میر علی) سیف اللہ قوم کابل خیل وزیر

(کمانڈر شیواہ، سپین روم۔ کمانڈر آزاد خان (انچارج میران شاہ) ابوشعیب (کمانڈر غلام خان) خالد خان (کمانڈر جانی خیل ایف آر بنوں) گروپ کے سربراہ حافظ گل بہادر دتہ خیل علاقے کا عسکری کمانڈر بھی ہے۔

جنوبی وزیرستان میں گل بہادر کا اتحادی مولوی نذیر حقانی اور بیت اللہ گروپ کے بعد تیسری بڑی قوت کا حامل شخص ہے۔ مولوی نذیر اور عبدالسلام ساکن وانا کا شمار ان کمانڈروں میں ہوتا ہے جو وزیرستان میں غیرملکی جنگجوؤں کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے خلاف صف آرا ہوئے۔ کمانڈر نذیر نے 2007ء کے اوائل میں حکومت پاکستان کی مدد سے ازبک کمانڈر طاہر یلدیشوف اور ان کے ساتھیوں کے خلاف لشکرکشی بھی کی اور ان کو علاقے سے نکال دیا تھا۔ حافظ گل بہادر بھی اس کام میں ان کی معاونت کررہے تھے۔ بنیادی طور پر یہ گروپ غیرملکیوں کی مخالفت محسود مزاحمت کاروں سے مخاصمت اور حکومت پاکستان کی حمایت کا پس منظر رکھتا ہے۔ حاجی نذیر کے ساتھ جنوبی وزیرستان میں جو اہم کمانڈر موجود ہیں ان میں کمانڈر محمد ولی المعروف ملنگ ساکن برمل قوم گنگی خیل، شمس اللہ ولد زرداد خان ساکن برمل قوم کرمل خیل وزیر، حلیم اللہ قوم طوبی خیل وزیر ساکن وانا اور تحصیل خان ساکن شکئی قوم وزیر شامل ہیں۔

نومبر 2008ء کے دوران جنوبی وزیرستان میں مرحوم کمانڈر عبداللہ محسود کا گروپ پھر سے منظرعام پر آیا ہے۔ اس گروپ کی قیادت قاری زین الدین محسود کررہے ہیں جبکہ ان کو پانچ سو کے قریب جنگجوؤں کی حمایت حاصل ہے۔ یہ گروپ بیت اللہ محسود کی مخالفت میں قائم کیا گیا ہے اور کہا جارہا ہے کہ اس کو پاکستان کی ان قوتوں کی حمایت حاصل ہے جو کہ بیت اللہ کا اثر کم کرنا چاہتی ہیں۔

مہدی ملیشیا، حیدری طالبان

یہ دونوں گروپ اہل تشیع سے تعلق رکھنے والے عسکریت پسندوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے کمانڈر زحسین علی شاہ اور عابد حسین شورش زدہ کرم ایجنسی میں ٹی ٹی پی اور ایک اور اتحادی گروپ تحریک طالبان اسلامی پاکستان کے خلاف مزاحمت کررہے ہیں۔

مہدی ملیشیا اور حیدری طالبان کے عسکریت پسندوں کی تعداد آٹھ سے دس ہزار کے درمیان ہے۔ ان دونوں تنظیموں کو ایران کے علاوہ افغانستان کے شمالی اتحاد کی حمایت حاصل ہے اور کرم ایجنسی میں ان دو تنظیموں کی ایک بڑی قوت اور عوامی حمایت موجود ہے۔ شمالی اتحاد کے متعدد کمانڈرز بھی اس ایجنسی میں تحریک طالبان پاکستان اور قاری حسین کے خلاف لڑتے پائے گئے ہیں۔

لشکر اسلام

یہ تنظیم خیبر ایجنسی میں انتہائی اہمیت کا حامل گروپ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قیادت مقامی آفریدی شخصیت حاجی منگل باغ کرتے ہیں۔ ابتداء میں اس گروپ کے حکام کا مقصد علاقے میں جرائم پیشہ افراد کے خلاف کارروائیاں کرنا تھا اور اسی بنیاد پر اسے عوام کی حمایت بھی حاصل ہوئی تھی۔ تاہم تنظیم نے بعد میں طالبان طرز کے ایک متبادل نظام کے فروغ کے اقدامات شروع کیے۔ نماز نہ پڑھنے پر سزا دینا، نماز کے اوقات میں کاروبار بند کرانا، دیگر اخلاقی جرائم کی سخت سزائیں دینا اور دوسرے اہم اقدامات سے ثابت ہوتا ہے کہ لشکر اسلام طالبان کی آئیڈیالوجی متعارف کروانے پر خصوصی توجہ دے رہی تھی۔ یہ تنظیم اپنے مخالف گروپ انصار الاسلام کے خلاف سخت ترین کارروائیاں کرتی رہی اسی طرح فریقین کی جھڑپوں کے دوران محتاط اندازے کے مطابق 600 سے زائد لوگ لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ بنیادی طور پر لشکر اسلام حکومت اور فورسز کی حامی تنظیم ہے جبکہ یہ گروپ افغانستان میں پاکستانی تنظیموں کی کارروائیوں کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ پانچ ہزار کے قریب تربیت یافتہ جنگجو موجود ہیں جن میں پندرہ سو کے قریب انتہائی تربیت یافتہ بتائے جاتے ہیں۔ 2009ء کے دوران اس تنظیم نے پشاور کے مختلف علاقوں میں بھی متعدد کارروائیاں کیں اور عملاً پشاور ہی ان کا بڑا ٹارگٹ رہا ہے۔

انصار الاسلام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر

یہ وہ فعال مقامی تنظیمیں ہیں جو کہ خیبر ایجنسی میں اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ آخر الذکر گروپ کے لیڈر حاجی نامدار خان کو 13 اگست 2009ء کو قتل کیا گیا تو اس کی ذمہ داری بیت اللہ

محسود کے کمانڈر اور قریبی ساتھی کمانڈر حکیم اللہ پر ڈالی گئی۔ حاجی نامدار افغانستان کے طالبان کا پرجوش حامی تھا لیکن وہ بعض ایشوز پر بیت اللہ محسود کی مخالفت بھی کرتا تھا جس کے نتیجے میں اس کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس وقت اس گروپ کی قیادت کمانڈر نیاز کررہے ہیں۔ خیبر ایجنسی میں لشکر اسلام گروپ کی وہی حیثیت ہے جو کہ وزیرستان میں بیت اللہ گروپ کی ہے۔ مستقبل میں یہ اہم ترین ایجنسی مختلف عسکری گروپوں کے درمیان بڑی کشیدگی کا باعث بن سکتی ہے کیونکہ بیت اللہ گروپ نے پشاور کی اہمیت کو سامنے رکھ کر اس ایجنسی کو فوکس کیا ہوا ہے۔

تحریک نفاذ شریعت محمدی ملاکنڈ ڈویژن

اس تنظیم کو ملاکنڈ ڈویژن میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مولوی فضل اللہ کی سوات میں حالیہ تحریک اسی گروپ کی کوشش تھی۔ ٹی این ایس ایم اور سوات مین تورابورا گروپ کے کمانڈروں کے درمیان بھی خیبر ایجنسی کی طرح باہمی کشیدگی کا خدشہ بڑھنے کا امکان ہے کیونکہ یہاں پر بھی عسکریت پسند حکومت کے مخالفین اور حامیوں پر مشتمل دو واضح گروپوں میں تقسیم ہوچکے ہیں۔ مختلف گروپوں کے درمیان وزیرستان میں ایک معاہدہ تشکیل پایا تھا تاکہ مختلف الخیال گروپوں کو متحد رکھا جائے اور ان کو چند واضح اہداف کے فارمولے پر متفق کیا جائے۔

کشمیری گروپ

مقامی قیادت کی حامل ان آٹھ بڑے گروپوں کے علاوہ جو دوسرے جہادی گروپ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد کے متاثرہ اضلاع میں طالبانائزیشن کے لیے متحرک ہیں ان میں لشکر طیبہ، لشکر جھنگوی، سپاہ صحابہ، حرکت المجاہدین، جیش محمد اور حرکت المجاہدین الاسلامی جیسے سات منظم گروپ بھی شامل ہیں جو کہ کشمیر کی تحریک میں حصہ لینے کے علاوہ پاکستان کے اندر فرقہ وارانہ معاملات میں بھی ملوث رہے ہیں۔ یہ گروپ عالمی دباؤ کے تحت حکومت پاکستان کی طرف سے پابندیاں لگنے کے بعد ان علاقوں میں آئے ہیں۔

کشمیر اور پنجاب سے تعلق رکھنے والی ان تنظیموں کے براہ راست رابطے وزیرستان کے حقانی گروپ کے ساتھ رہتے ہیں جبکہ بیت اللہ محسود بھی ان کی معاونت کرتے ہیں۔

حرکت المجاہدین اسلامی کے سربراہ قاری سیف اللہ اختر، جیش محمد کے مولانا مسعود

اظہر اور دوسرے رہنما وزیرستان آتے رہے ہیں اور ان کی سرگرمیوں کے مراکز، ڈانڈے درپہ خیل، میران شاہ اور میرعلی ہیں۔ یہ لوگ پنجاب اور کشمیر کے علاوہ کرم اور اورکزئی ایجنسی کی شیعہ تنظیموں کے خلاف سرگرمیوں میں حقانی اور بیت اللہ کی مشاورت اور رہنمائی سے عملی حصہ لیتے رہتے ہیں۔ پنجاب سے افغانستان کی جنگ میں حصہ لینے والے جہادیوں کو بھی ان سات تنظیموں کے ذریعے حقانی گروپ کے توسط سے سرحد کے اس پار بھیجا جاتا ہے۔

قبائلی علاقہ جات میں متحرک ان عسکری تنظیموں کی تفصیلات اور بنیادی ڈھانچوں کے تجزیہ سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ کچھ یوں بھی ہیں:

- ☆ ان کا بنیادی مقصد ایک خاص پس منظر میں طالبان فکر کا فروغ ہے۔
- ☆ کچھ تنظیمیں ایسی ہیں جو محض افغانستان میں ہی کارروائیوں تک محدود ہیں اور پاکستان میں ایسی کارروائیوں کو غلط سمجھتی ہیں ان کو حکومتی اداروں کی سرپرستی بھی حاصل ہے اور شاید انہی کو ''گڈ طالبان'' کہا جاتا ہے۔
- ☆ کچھ پاکستان یا پھر قبائلی علاقوں میں بھی سرگرم عمل ہیں۔
- ☆ ان تنظیموں کے درمیان اختلافات بھی موجود ہیں اور ان اختلافات کی بنیاد پر ہی ان کے گروپس وجود میں آچکے ہیں اور ان اختلافات کو ہوا دینے میں اداروں اور مقامی سرکاری مشینری نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔
- ☆ کچھ تنظیمیں ایسی ہیں جو فکری غلبہ چاہتی ہیں اور کسی دیگر نقطۂ نظر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ان کے ردعمل میں ہی شیعہ تنظیمیں وجود میں آئی ہیں۔

ان بنیادی فکری تضادات کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی ہیں جو مفادات کے دائروں میں گھومتی ہیں۔ بیرونی سرمایے کی آمد نے بھی مختلف گروپوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کچھ مستقبل کے حوالے سے بنتے ہوئے منظرنامے میں اپنی زیادہ سے زیادہ اہمیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ گروپس ایسے ہیں جنہیں مختلف گروپوں کی قوت کو توڑنے کے لیے سرپرستی فراہم کی گئی اور اب وہ بھی مفادات کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن اس سارے تناظر میں جو مستقبل کی مجموعی تصویر سامنے آتی ہے اس میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ اگر ان علاقوں پر پاکستان کی حکومت اور فوج اپنی بالادستی قائم رکھنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو

یہ افغانستان کی سوویت فوجوں کے بعد کی صورتحال ہوگی جس میں ہر گروپ اقتدار کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرا رہا تھا۔ قبائلی دشمنیوں کا منظر پیش کر رہا تھا۔

جس کی ایک مثال تو یہ بھی ہے کہ 24 جولائی 2007ء کو جب جنوبی وزیرستان سے تعلق رکھنے والے 'عبداللہ محسود' طالبان کمانڈر کی حیثیت سے سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے تو بیت اللہ محسود اور عبداللہ محسود کے گروپوں میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے عبداللہ محسود کے جانشین مسعودالرحمٰن نے بیت اللہ محسود سے اس قتل کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا لیکن اس نے اس مطالبہ پر کوئی کان نہیں دھرا تو عبداللہ محسود نے بیت اللہ محسود پر اس قتل کا براہ راست الزام عائد کر دیا اور پھر ان دونوں گروپوں کے درمیان اختلافات اس وقت شدت اختیار کر گئے جب عبداللہ محسود کی موت کے دو تین ماہ بعد ان کے جانشین مسعودالرحمٰن کو بھی ریموٹ کنٹرول بم کے ذریعے ساتھیوں سمیت ٹانو کے علاقہ میں قتل کر دیا گیا جس کے بعد عبداللہ محسود کے قریبی ساتھیوں ملک ولی جان اور مولوی شیر محمد کے بیت اللہ محسود کی طرف سے موت کے پروانے جاری کر دیئے گئے بعد میں ملک ولی جان کے لیے عام معافی دے دی گئی لیکن مولوی شیر محمد ابھی تک بیت اللہ محسود کی ہٹ لسٹ پر ہے۔

ادھر عبداللہ محسود کے جانشین مسعودالرحمٰن کے قتل کے بعد ان کے بیٹے قاری زین الدین مسعود نے کمانڈ سنبھالی اور قوم کے نام پیغام جاری کرتے ہوئے کہا کہ:

> بیت اللہ محسود نے اسلام کے نام پر جو بھی کارروائیاں کی ہیں وہ اسلام نہیں ہے۔ یہ شر پسندی ہے۔ مجاہدین کے نام پر انہوں نے جو بھی کارروائیاں کی ہیں یہ جہاد نہیں اپنے ظالمانہ اقتدار کو بچانا ہے۔
>
> جیسا کہ آپ قوم کو بخوبی اندازہ ہے کہ مولوی حسن جان حق کا درس دیتا تھا اس کو اس ظالم بیت اللہ محسود نے شہید کروا دیا۔ درجنوں کی تعداد میں کمانڈروں اور سینکڑوں کی تعداد میں مشران کو شہید کروایا اس کے علاوہ اس نے ملک بھر میں مسجدوں، بازاروں اور ہسپتالوں میں خودکش دھماکے کیے۔
>
> میں آپ قوم سے پوچھتا ہوں کہ......کیا یہ جہاد ہے؟ اسلام تو امن کا مذہب ہے تشدد کا نہیں! اسلام تو امن کا درس دیتا ہے۔

علمائے کرام کے نام پیغام

علمائے کرام سے میں خصوصی اپیل کرتا ہوں کہ بیت اللہ محسود کے گزرے ہوئے دور میں آپ علمائے کرام کے حق کہنے میں کچھ مجبوریاں تھیں۔ اب میں آپ صاحبان کو خصوصی اپیل کرتا ہوں کہ حق والوں کا ساتھ دیں۔

ان کے علاوہ میں بیت اللہ محسود اور ان کے چند کمانڈروں...... عظمت اللہ اور رشین جوان کے اتحادی ہیں میں ان کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اس کا ساتھ چھوڑ دیں ورنہ دنیا و آخرت میں ذلیل ورسوا ہوں گے۔

منجانب...... کمانڈر عبداللہ محسود شہید گروپ کے امیر

محترم قاری زین الدین محسود۔

حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے اندر، خصوصاً قبائلی علاقہ جات میں مختلف تنظیموں اور گروہوں نے علاقائی بالادستیاں قائم کرلیں اور اپنے اپنے حکم نامے بھی جاری کیے۔ ایک انتباہ امیر و شوریٰ مجاہدین کی طرف سے جنوری 2009ء میں جاری کیا گیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ:

''الحمدللہ، ہم سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کسی مسلمان کو دوسرے پر ناجائز ہاتھ اٹھانے کا حق نہیں۔ ہم نہ تو خود ظالم ہیں اور نہ ظالموں کے ساتھی بلکہ ہر مظلوم مسلمان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔''

شوریٰ مجاہدین شمالی وزیرستان نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ:

''جس کسی نے بھی 'جاسوسی کے الزام' کے علاوہ کوئی بھی فرد، بچہ یا کسی کی گاڑی صرف تاوان کی غرض سے اغوا کی، وزیرستان کے اندر سے یا باہر سے۔ ان لوگوں کو پانچ دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ (یکم فروری سے پانچ فروری تک) تا کہ ان تمام بچوں، افراد اور گاڑیوں کو بلامعاوضہ ان کے اہل خانہ کو اور گاڑیوں کو اپنے مالکوں کو واپس کردیا جائے۔ اس کے بعد کسی بھی شخص یا گروپ کا کوئی بھی عذر قبول نہ ہوگا۔ اور شوریٰ مجاہدین ان کے خلاف سخت کارروائی کرے گی۔''

ایسی ہی ایک ہدایت تحریک طالبان پاکستان کی طرف سے بھی جاری کی گئی۔ جس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ مجاہدین اس قسم کی کارروائیوں میں ملوث ہیں یا پھر کچھ لوگ ہیں جو مجاہدین کی آڑ میں ایسی مذموم اور مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث پائے گئے تھے۔ 23 جنوری

2009ء کو جاری ہونے والے اس بیان میں کہا گیا کہ:

''تنظیم کے جملہ ذمہ داران اور کارکنان کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ آج کے بعد پاکستان بھر میں مجاہدین پر گاڑیوں کی لوٹ مار، اغوا، حکومتی وسول املاک کی لوٹ مار کرنا سب ممنوع ہے۔ اس میں کسی کارکن کا کوئی عذر قطعاً قبول نہیں ہوگا۔ آج کے بعد تمام سابقہ اجازت نامے منسوخ کردیئے گئے ہیں۔ اور یہ دلیل بھی قبول نہیں ہوگی کہ مجھے فلاں امیر صاحب نے اجازت دے رکھی ہے۔ ایسے لوگوں کو پکڑنے کے لیے خصوصی فورس تشکیل دے دی گئی ہے۔ کسی کے ساتھ نرمی نہیں برتی جائے گی۔ اور سخت ترین سزا دی جائے گی۔''

بہرحال ایک طرف تو یہ صورتحال تھی کہ ...... مجاہدین اپنے رہنماؤں کی اجازت سے مجرمانہ کارروائیوں سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ جس کے باعث بنیادی مقصد کو نقصان پہنچنے کے ساتھ عوام میں بھی ان کے خلاف نفرت پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی۔ تو دوسری طرف مختلف گروپوں کے اختلافات بڑھتے گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایک دوسرے پر حملے بھی کیے مخالفین کے سرکردہ رہنماؤں کو قتل بھی کیا۔ بیت اللہ محسود اور عبداللہ محسود گروپ ایک دوسرے کے سامنے آچکا تھا۔

جولائی 2008ء میں شکئی کے مقام پر بیت اللہ گروپ کے کارکن کی ہلاکت کا الزام عبداللہ محسود گروپ پر عائد کیا گیا جس کے بعد اگست میں ملک خیر محمد کو مولے خان سرائے اور وانا کے درمیان مسلح افراد نے گاڑی سے اتار کر گولی ماردی جس کے صرف دو دن بعد عبداللہ محسود گروپ کے کمانڈر مولوی شیر محمد کے بھتیجے امیرالدین کو برونڈ کے علاقہ میں قتل کیا گیا۔ اکتوبر میں بیت اللہ محسود گروپ کے غفران نامی شخص کو ڈیرہ اسماعیل خان میں قتل کردیا گیا جس کے دو تین بعد 27 اکتوبر کو بیت اللہ محسود کے بھائی یحییٰ خان کو ایف آر بنوں کے علاقہ ڈومیل میں قتل کردیا گیا تو 29 اکتوبر کو عبداللہ محسود گروپ کے کمانڈر مولوی شیر محمد کے بھائی محمد یوسف کو ٹانک میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ان واقعات کے بعد عبداللہ محسود گروپ نے وانا، شکئی اور ڈیرہ اسماعیل خان میں اپنے دفاتر قائم کرلیے اور اپنا گروپ منظم کرنا شروع کردیا یہی وہ موقع تھا۔ جب اخوان

المسلمین سے تعلق رکھنے والے کچھ اہم ملکی اور غیر ملکی کمانڈر بھی اس گروپ میں شامل ہو گئے تھے جس سے یہ گروپ مزید مستحکم ہو گیا اور اس گروپ نے بنوں، ٹانک اور بیت اللہ محسود کے زیر کنٹرول علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا جس سے یہ خدشہ بھی سامنے آیا کہ مستقبل میں وزیرستان میں متحرک یہ دونوں بڑے گروپ ٹانک، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان اور کراچی میں ایک دوسرے کے حمایتیوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں جس سے مزید خون خرابہ ہو سکتا ہے جبکہ دوسری طرف جنوبی وزیرستان کے وہ قبائل اور خاندان جن کو عسکریت پسندوں کے ہاتھوں جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا تھا وہ بھی اپنے نقصان کے ازالہ یا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں جس سے اس علاقہ میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔

مختلف گروپوں کے درمیان اختلافات اور ٹکراؤ کا اندازہ مذکورہ بعض واقعات سے لگایا جا سکتا ہے تاہم ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جب بھی پاکستانی طالبان گروپوں میں اختلافات شدت اختیار کر گئے افغانستان کی طالبان قیادت نے مداخلت کر کے معاملات کے سلجھانے کا راستہ ہموار کر دیا۔ جو لوگ ماضی میں اس سلسلے میں براہ راست مداخلت کرتے آئے ہیں ان میں جلال الدین حقانی، ملا داد اللہ اور یہاں تک کہ ملا عمر بھی شامل رہے ہیں۔

باچاخان

باب 3

ملک میں طالبان کی تعداد اور مخصوص علاقے

ایک زمانہ تھا جب طالبان کو محض افغانستان میں لڑنے والے جنگجو ہی سمجھا جاتا تھا لیکن جب اس کا افغانستان پر غلبہ ہوا اور اس کے اثرات پاکستانی علاقوں پر بھی مرتب ہوئے تو معلوم ہوا کہ 'طالبان' ایک مخصوص نظریہ ہے جس میں اسلام کی انتہا پسندانہ تشریحات موجود ہیں اور وہ ہر غیر نظریہ کو 'غیر اسلام' سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب افغانستان میں سوویت فوجوں کی واپسی ہوئی اور مجاہدین کی اکثریت پاکستان لوٹ آئی تو انہوں نے اپنے اہداف میں شیعہ مکتبۂ فکر کو شامل کر کے اس کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں اور مسجدوں، امام بارگاہوں کو بھی نشانہ بنانے سے دریغ نہیں کیا۔ یہ صورتحال قبائلی علاقہ جات کے مختلف مقامات پر آج بھی موجود ہے اور یہ انہی لوگوں کی انتہا پسندی کا نتیجہ ہے کہ دو شیعہ تنظیمیں بھی اس علاقہ میں سامنے آ چکی ہیں جو پاکستان کی حامی بھی ہیں اور انہیں مبینہ طور پر اداروں کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ ان کا تذکرہ ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ لیکن بات یہیں پر ہی ختم نہیں ہوتی یہ افغانستان سے پلٹ کر آنے والے گروہ اور تنظیمیں ہی تھیں جنہوں نے غلبہ اسلام کے لیے پاکستان کے اندر عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا...... لیکن ایک نقطۂ نظر میں یہ بھی ادھورا سچ ہے کہ کیونکہ یہ تنظیمیں طالبان مکتبۂ فکر جو مکتبۂ دیوبند کا تعلیم یافتہ تھا جب ملا عمر کی قیادت میں کابل پر قابض ہوا تو ان تنظیموں کے اکثر ارکان افغانستان چلے گئے تھے جو وہاں سے امریکی حملے کے بعد پلٹ کر قبائلی علاقوں میں آ گئے لیکن یہ پورا سچ نہیں

ہے ان جماعتوں سے تعلق رکھنے والے غیر پشتون ارکان پاکستان میں ہی رہے تھے اور انہوں نے اپنے اہداف کونشانہ بنانے کی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں۔

لیکن اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ......جنرل ضیاء الحق کے زمانہ میں جس طرح مذہبی فکر کو ذرائع ابلاغ کا ہی نہیں تدریسی نظام کا بھی حصہ بنا دیا گیا تھا وہ ایک مجموعی معاشرتی رجحانات کے فروغ کا بھی باعث بنا لوگوں میں مذہبی فکر نمایاں ہوئی جس کا اظہار اجتماعی رویوں میں بھی ہونے لگا۔ مزید یہ کہ حکومتی سرپرستی میں جب کچھ تنظیموں کو افغانستان کے بعد کشمیر میں بھی جہاد کے لیے استعمال کیا گیا تو اس کے اثرات بھی نمایاں ہوئے جبکہ اس کے بالمقابل ترقی پسندانہ سوچ اور فکر کو ایک تسلسل میں ذرائع ابلاغ سے خارج کردیا گیا اور اس طرح وہ گنجائش پیدا کی گئیں کہ جو مخصوص نظریات کے پھیلاؤ اور وسعت کے لیے معاون ثابت ہوسکتی تھیں یہی وجہ ہے کہ طالبان ایک مخصوص مکتبۂ فکر بن گیا جس میں انتہاپسندی اور شدت پسندی موجود تھی۔ چنانچہ یہ کہنا کہ 'طالبان ازم' محض قبائلی علاقہ جات اور صوبہ سرحد تک ہی محدود رہا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں مگر......افغانستان پر امریکی غلبہ کے بعد جب مزاحمتی عمل شروع ہوا تو یہ ایک تشدد پسند اور جنگجو روپ میں زیادہ نمایاں ہوا حتیٰ کہ......جو بھی تنظیمیں اور گروہ طاقت اور ہتھیار کے ذریعے 'غلبہ اسلام' یا پھر مخصوص نقطۂ نظر کا تسلط چاہتی تھیں انہیں طالبان کے نام سے ہی جانا جانے لگا۔ جو قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد میں بہ کثرت موجود تھا۔ لیکن آج جنوبی پنجاب جہاں سے جیش محمد نے اپنا سفر شروع کیا تھا اسے بھی ایک بہت بڑا مرکز خیال کیا جاتا ہے بلکہ سوات کی لڑائی میں یہ گروپ بھی کھل کر سامنے آیا تھا۔

اس دوران میں جب گورنر سرحد اویس غنی لاہور آئے تو انہوں نے اس جنگ میں ''پنجابی مجاہدین'' کے ملوث ہونے کی بات بھی کی تھی لیکن پنجاب حکومت میں شامل وزراء نے اس کی تردید کی تھی جو محض سیاسی بیان تھا اور لاہور کے پولیس ٹریننگ سنٹر پر حملہ کرنے والوں میں سرائیکی بولنے والے بھی شامل تھے جس پر مشیر داخلہ رحمان ملک نے جیش محمد کے ملوث ہونے کی بات بھی کی تھی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کے مختلف علاقوں خصوصاً سات قبائلی ایجنسیوں اور نیم قبائلی علاقوں میں طالبان کی مختلف تنظیموں سے وابستہ عہدیداروں،

AFGHAN TRIBES & THE DURAND LINE

NOT TO SCALE

کمانڈروں، ارکان اور عسکریت پسندوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ ہے۔ اس تعداد میں وہ طالبان یا عسکریت پسند شامل نہیں ہیں جو کہ صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع کے علاوہ بلوچستان کی پشتون بیلٹ اور اربن سندھ میں یا تو موجود ہیں یا مختلف کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے طالبان کی تعداد افغانستان کے طالبان کے برابر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے دونوں اطراف یہ تعداد دو لاکھ سے زائد ہے اور یہ طالبان یا عسکریت پسند ریاستی فورسز اور حکومتوں کے خلاف مصروف عمل ہیں۔ یہ وہ تعداد ہے جو کہ عسکری اور تنظیمی عمل سے متعلق سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں مصروف رہتے ہوئے عسکریت پسندی کے فعال نیٹ ورک کا باقاعدہ حصہ ہے۔ وہ لوگ اس تعداد کا حصہ نہیں ہیں جو کہ طالبان کے حامی ہیں مگر عملی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیتے۔

پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں، طالبان کے قریبی ذرائع افغانستان اور امریکہ کے متعلقہ اداروں کی جانب سے قبائلی علاقہ جات میں موجود طالبان کی تعداد کے بارے مختلف اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ان کے متضاد دعوؤں کا تقابلی جائزہ لے کر کم ترین تعداد کا تناسب نکالا جائے تو تب بھی عسکریت پسندوں کے فعال ارکان، تربیت یافتہ جنگجوؤں اور کمانڈروں کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہیں ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق طالبان کی سب سے زیادہ تعداد جنوبی وزیرستان میں پائی جاتی ہے جہاں پر طالبان کے چار مختلف گروپوں کے پاس تربیت یافتہ جنگجوؤں کی ایک بڑی اور مؤثر کھیپ پائی جاتی ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق جنوبی وزیرستان میں موجود چار گروپوں کے عسکریت پسندوں کی تعداد کچھ یوں ہے:

بیت اللہ محسود	بیس سے تیس ہزار تک
مولوی نذیر گروپ	بارہ سے پندرہ ہزار تک
طاہر یلدیشوف اور دوسرے خارجی گروپ	تین سے چار ہزار تک
عبداللہ محسود گروپ	پانچ سو سے سات سو تک

اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ صرف جنوبی وزیرستان میں عسکریت پسندوں کی تعداد تیس ہزار سے زائد ہے جبکہ بیت اللہ محسود اور سراج حقانی کے پاس تین سو سے زائد

خودکش بمبار بھی موجود ہیں جو کسی بھی وقت کارروائی کے لیے تیار رہتے ہیں۔

شمالی وزیرستان بھی عسکریت پسندوں کا مضبوط گڑھ تصور کیا جاتا ہے اور اعداد وشمار کی رو سے یہ دوسرے نمبر پر ہے۔

حافظ گل بہادر گروپ کے عسکریت پسندوں کی تعداد	آٹھ سے دس ہزار تک
بیت اللہ محسود گروپ کے عسکریت پسندوں کی تعداد	پانچ سے آٹھ ہزار تک
سراج حقانی اور دوسرے گروپس میں عسکریت پسندوں کی تعداد	بارہ سے پندرہ ہزار تک

سراج حقانی اور بیت اللہ محسود نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے انتہائی قریب ہیں بلکہ یہ مشترکہ کارروائیاں کرنے کے علاوہ اپنے ارکان کو مشترکہ تربیت بھی دیتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہی وہ دو کمانڈر ہیں جو کہ افغانستان میں امریکہ اور نیٹو کے خلاف براہ راست حملوں اور کارروائیوں میں بغیر کسی وقفے کے ملوث رہے ہیں۔ ان دو کمانڈروں کے شمالی اور جنوبی وزیرستان کے علاوہ دوسری ایجنسیوں میں بھی نیٹ ورکس موجود ہیں۔

اورکزئی ایجنسی

وہ علاقہ ہے جہاں پر شیعہ اور سنی اختلاف کی بنیاد پر عسکریت پسند گروپ ایک دوسرے کے خلاف بھی برسرپیکار رہتے ہیں یعنی اس ایجنسی میں یہ گروپ فورسز یا ریاستی اداروں کے ساتھ ساتھ مسلکی اور سیاسی بنیاد پر ایک دوسرے کو نشانہ بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اس ایجنسی میں افغانستان، پاکستان اور ایران تینوں ممالک کے حامی طالبان پائے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ ہلاکتیں بھی اس علاقے میں ریکارڈ کی گئی ہیں۔

اس ایجنسی میں دو بڑے گروپوں کی تعداد کچھ یوں ہے:

کمانڈر حکیم اللہ گروپ (بیت اللہ کا حامی	چھ سے آٹھ ہزار تک
کمانڈر حسین علی شاہ اور عابد حسین (شیعہ کمانڈرز)	پانچ سے سات ہزار تک

کرم ایجنسی

کرم ایجنسی میں قاری حسین ایک تشدد پسند اور سخت گیر کمانڈر کی شہرت رکھتے ہیں

اوران کے پاس خودکش حملہ آوروں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے وہ بنیادی طور پر بیت اللہ محسود کا حامی رہا ہے۔ درہ آدم خیل میں برسرپیکار طالبان کے ساتھ بھی قاری حسین کے قریبی مراسم ہیں اور ان کے کمانڈر طارق کا زیادہ تر انحصار بھی قاری حسین پر ہی ہوتا ہے۔ کمانڈر طارق کے عسکریت پسندوں کی تعداد پانچ سو سے آٹھ سوتک ہے جبکہ قاری حسین کے مزاحمت کاروں کی تعداد بھی اتنی ہی بتائی جاتی ہے۔ تاہم ان کو اپنی تعداد کے بجائے معیار پر انحصار کرنے کی وجہ سے شہرت حاصل ہے۔

بنیادی طور پر حکیم اللہ ہی وہ کمانڈر ہے جو کہ بیک وقت کرم، اورکزئی اور خیبر ایجنسی کو بیت اللہ محسود کے قریبی ساتھی کی حیثیت سے معاملات کو چلاتا ہے۔ کمانڈر حکیم اللہ، قاری حسین اور کمانڈر طارق بوقت ضرورت ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔ کرم اور اورکزئی میں شیعہ تنظیمیں ہی ان کا زیادہ تر ہدف بنتی رہتی ہیں۔

خیبر ایجنسی

صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور سے نزدیک ترین خیبر ایجنسی بھی ایک ایسی ایجنسی ہے جہاں پر کرم ایجنسی کی طرح مزاحمتی تنظیموں کی تعداد دو یا تین سے زائد ہے۔ اس ایجنسی میں بھی بیت اللہ محسود کے ارکان کی تعداد وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ یہ لوگ 2008ء کے دوران متعدد کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ خیبر ایجنسی میں رحمان اللہ، حضرت علی طمانچے والا اور حضرت نبی بیت اللہ محسود کے متعین کردہ کمانڈرز ہیں۔

مختلف گروپوں کی عددی پوزیشن کچھ یوں بتائی جارہی ہے۔

بیت اللہ محسود گروپ (رحمان اللہ وغیرہ)	ایک ہزار سے بارہ سوتک
لشکر اسلام (منگل باغ)	دو سے تین ہزار تک
انصار الاسلام	ایک ہزار سے پندرہ سوتک
امر بالمعروف ونہی المنکر گروپ	تین سو سے پانچ سوتک

خیبر میں بھی دوسری ایجنسیوں کی طرح مختلف اوقات میں یہ گروپس آپس میں لڑتے آئے ہیں تاہم لشکر اسلام کو ایجنسی میں بالادستی حاصل ہے۔ بیت اللہ محسود اور منگل باغ

کے گروپ مخالفین پر اکثر غالب رہتے ہیں جبکہ مستقبل میں محسود گروپ کی قوت اور سرگرمیوں میں اضافے کا امکان کئی وجوہات کی بنا پر کیا جا رہا ہے۔ نیٹو کی سپلائی لائن پر کیے جانے والے حملوں میں بیت اللہ گروپ ہی ملوث رہا ہے۔ اس ایجنسی کی اہمیت بھی اس بنا پر بہت زیادہ ہے کہ یہاں سے افغانستان کو بین الاقوامی راستہ جاتا ہے۔ جس کو نیٹو افواج سپلائی کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

مہمند ایجنسی

اس علاقے میں جولائی 2007ء کے دوران لال مسجد آپریشن کے بعد مزاحمت شروع ہوئی تھی۔ مزاحمت کرنے والے کمانڈر کا نام عمر خالد ہے جس کے دوسرے متعدد تربیت یافتہ کمانڈرز اور فورسز سے گہرے روابط موجود ہیں۔ یہ لوگ تحریک طالبان پاکستان کا باقاعدہ حصہ ہیں۔ ان مزاحمت کاروں کی تعداد پانچ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ان کی سرگرمیاں مہمند ایجنسی کے علاقوں خونیرئی، سپینکئی، پنڈیالی اور دویزئی سے لے کر ضلع چارسدہ کے 25 متنازعہ دیہات سے ہوتی ہوئی شب قدر تک سامنے آتی رہی ہیں۔

باجوڑ ایجنسی

وزیرستان کی دو ایجنسیوں کے بعد وہ علاقہ ہے جہاں پر پاکستانی فورسز نے آپریشن کے نام پر سخت ترین کارروائیاں کرتے ہوئے سینکڑوں طالبان اوران کے حامیوں کو نہ صرف یہ کہ نشانہ بنایا بلکہ آپریشن کے باعث دو لاکھ سے تین لاکھ تک لوگ نقل مکانی پر بھی مجبور ہوئے اس ایجنسی میں امریکی حملے بھی کیے جاچکے ہیں جبکہ یہاں پر القاعدہ کے لیڈروں اور ارکان کی موجودگی کی افواہیں بھی وقتاً فوقتاً اڑتی رہتی ہیں۔

2008ء کے آخر میں جاری کردہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس برس باجوڑ ایجنسی میں پندرہ سو سے زائد عسکریت پسند فورسز کا نشانہ بن کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نو سو پچاس گرفتار ہوئے (جن میں غیر ملکی بھی شامل تھے) جبکہ فورسز کی کارروائیوں کے دوران مزاحمت کاروں کے ہاتھوں آرمی کے بیالیس جوان جاں بحق ایک سو بہتر زخمی اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کے بتیس جاں بحق جبکہ پچانوے جوان زخمی ہوئے۔

باجوڑ ایجنسی میں طالبان گروپوں کے مزاحمت کاروں کی تعداد کچھ یوں ہے:

مولانا فقیر محمد (ٹی ٹی پی) گروپ کے ارکان کی تعداد	چار سے پانچ ہزار تک
کمانڈر ضیاء الرحمٰن (لشکر اسلام باجوڑ)	پندرہ سو سے دو ہزار تک
زرقاوی گروپ (غیر ملکیوں پر مشتمل)	سات سو سے ایک ہزار تک
الظواہری گروپ (غیر ملکیوں پر مشتمل)	چھ سو سے نو سو تک

مولانا فقیر محمد طالبان تحریک کی سرگرمیوں اور مزاحمت کے بعد اہم ترین کمانڈرز کی صف میں شامل ہوگئے ہیں جبکہ ان کے قریبی ساتھی مولوی عمر تحریک طالبان پاکستان کے مرکزی ترجمان کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ ان گروپوں نے پاکستانی فورسز کو دو سال تک شدید مشکلات اور مزاحمت سے دوچار کیے رکھا جس کے نتیجے میں باجوڑ کے طالبان کو وزیرستان کے بعد عالمی شہرت اور اہمیت حاصل ہوگئی۔

ان سات قبائلی ایجنسیوں کے علاوہ نیم قبائلی علاقوں (ایف آر ز) اور سوات میں بھی طالبان کی بڑی تعداد موجود ہے۔ سوات کے طالبان کی تعداد سات سے گیارہ ہزار تک بتائی جاتی ہے جبکہ متعدد دوسرے اضلاع میں بھی قابل ذکر تعداد پائی جاتی ہے۔

طالبان گروپوں کے مزاحمت کاروں اور تربیت یافتہ جنگجوؤں کی اتنی بڑی تعداد سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے 2002ء کے بعد پاکستان خصوصاً قبائلی ایجنسیوں میں خود کو منظم کر کے کتنی قوت حاصل کی ہے۔ القاعدہ اسلامک موومنٹ آف ازبکستان افغان طالبان اور افغانی جہادی تنظیموں کے ہاتھوں تربیت یافتہ پاکستانی طالبان دور جدید کی جنگی حکمت عملی اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں جبکہ یہ لوگ تکنیکی مہارت میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ گوریلا جنگ میں ماہر یہ لوگ پے در پے تجربات اور مسلسل مزاحمت کی پریکٹس کے باعث دنیا کی کسی بھی ریگولر آرمی کے لیے نہ صرف یہ کہ بڑا چیلنج بن سکتے ہیں۔ جس کا ثبوت انہوں نے دنیا کی بہترین پاکستانی فوج کو گزشتہ چھ سال سے مشکل میں ڈال کر دیا ہے اور اب پاکستان کی حکومت مسلح افواج کی مشاورت سے بعض گروپوں کے ساتھ مذاکرات کرنے اور ان کے مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی ہے جیسا کہ سوات میں ہوا ہے۔

+·····+·····+

باب 4

قبائلی علاقوں میں موجود غیر ملکی تنظیمیں

اس حقیقت کا پوری دنیا کو ادراک ہے اور اس کا تذکرہ ہم نے پہلے بھی کیا ہے کہ افغانستان کی سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران دنیا بھر سے خصوصاً مسلم ممالک سے 'مجاہدین' اور ان کی سرکردہ تنظیموں کو افغانستان میں داخل کیا گیا تھا جو سوویت فوجوں کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ لیکن جب سوویت فوجیں امریکہ کے ساتھ معاہدے کے بعد افغانستان سے چلی گئیں تو یہ تنظیمیں اس بنیادی فلسفے اور نظریے کی طرف پلٹ گئیں جس نے انہیں 'جہاد' کا راستہ دکھایا تھا اور پھر اپنے نظریے کے غلبے کی جدوجہد کو اپنا محور ومرکز بنالیا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں وہ طالبان کے ساتھ منسلک ہوئیں اور جب طالبان نے کابل پر قبضہ کرلیا تو اپنے نظریاتی تسلط کو وسعت بھی دینے لگیں چنانچہ جہاں انہیں افغانستان کی حکومتی سرپرستی میسر آگئی تھی وہاں انہوں نے افغانستان سے باہر بھی اپنی سرگرمیوں کو بڑھانا شروع کردیا تھا۔

لیکن......جب امریکہ کے افغانستان پر قبضے کا ٹرننگ پوائنٹ آیا تو یہ مشکل میں پڑ گئیں یہ تنظیمیں اور ان سے وابستہ افراد اپنے ممالک کو تو واپس نہیں جا سکتے تھے کیونکہ ان ممالک میں ایسی جہادی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی یا پھر کچھ ممالک نے نائن الیون کے بعد کی صورتحال میں ایسی تنظیموں پر قدغنیں لگادی تھیں چنانچہ ان کے لیے سوائے اس کے کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے قبائلی علاقوں کو ہی اپنی ''آخری پناہ گاہ'' بنالیں جہاں ان کے

دیرینہ روابط پہلے سے ہی موجود تھے......بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں ایسے غیرملکی مجاہدین بھی تھے جنہوں نے مقامی لوگوں سے رشتہ داریاں کر لی تھیں اور اب ان کی اولادیں بھی انہی علاقوں میں موجود تھیں چنانچہ ان لوگوں نے انہی علاقوں کی طرف پلٹنے کو ترجیح دی۔

یہاں ایک اور قابل ذکر بات تو یہ بھی ہے کہ چین کے صوبہ سنکیانگ میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک زمانہ میں پاکستان کی ایک دینی جماعت پر مداخلت کے الزامات عائد ہوئے تھے جس پر چین کی طرف سے حکومت پاکستان سے ایک سے زیادہ مرتبہ احتجاج بھی کیا گیا چنانچہ حکومت نے 90ء کی دہائی میں اس مخصوص جماعت کو اس سے باز رہنے کی تلقین بھی کی تھی لیکن ......امریکی غلبہ کے بعد جب یہ تصور نمایاں ہوا کہ افغانستان پر امریکی قبضہ کا ایک مقصد چین کے اردگرد حصار قائم کرنا بھی ہے تو اس علاقے میں امریکی مداخلت کا چرچا بھی ہوا۔ لیکن ایک اور حقیقت تو یہ بھی ہے کہ اس علاقہ میں بھی ایک جہادی گروپ وجود میں آچکا تھا جو غلبہ اسلام کے تصور کا حامی تھا یہ گروپ بھی جہاد میں شامل ہو چکا تھا لیکن واپس جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا وہ بھی ان علاقوں میں آ گیا۔

چنانچہ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے جب اے این پی کے سینئر حاجی عدیل ٹیلی ویژن پر یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے کہ طالبان اور القاعدہ کے پاس سے یورپی روسی اور چینی ہتھیار بھی برآمد ہوئے ہیں فورسز کو اس کا نوٹس لینا چاہیے کہ یہ ہتھیار کیسے اور کہاں سے ان کے پاس آتے ہیں؟

یہ اس بات کی بھی دلیل تھی کہ چینی مجاہدین کا اپنے ملک میں رابطہ موجود ہے اور وہاں موجود عناصر یا اسلحہ کے سمگلر انہیں یہ اسلحہ فراہم کرتے ہیں۔

پاکستان کے اندر فورسز حکومت اور مخالفین کے خلاف برسرپیکار غیرملکی تنظیموں میں القاعدہ، اسلامک موومنٹ آف ازبکستان اور چینی مزاحمت کاروں پر مشتمل تین یا اس سے زیادہ گروپ سرگرم عمل ہیں۔ اگرچہ یہ تمام تنظیمیں پاکستانی اور افغانی گروپوں کے ساتھ قریبی رابطے رکھ کر ایک دوسرے کے اتحادی ہیں تاہم اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تین تنظیمیں پاکستان کے علاوہ بعض دوسرے ممالک میں بھی کبھی کبھار اپنی آزادانہ حیثیت سے کارروائیاں کرتی رہی ہیں۔ یہ غیرملکی تنظیمیں پاکستانی اور افغانی طالبان کے ساتھ مشترکہ

کارروائیوں کے دوران اپنی شناخت قائم رکھنے کے لیے الگ پلاٹون کے طور پر حصہ لیتی ہیں جبکہ دوسرے ممالک میں کارروائیوں کی کسی پلاننگ کے دوران ضروری نہیں کہ پاکستانی یا افغانی طالبان قیادت بھی ان کے ساتھ متفق یا شریک کار ہو۔

ان غیر ملکی تنظیموں کے رہنما اور کمانڈر وزیرستان، کرم اور باجوڑ کی ایجنسیوں کو بطور بیس کیمپ استعمال کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور نیٹو افواج کو متعدد بار ان پر حملے کرنے پڑے ہیں اور ان حملوں میں خصوصاً ڈرون حملوں کے دوران سینکڑوں کی تعداد میں مقامی طالبان کے علاوہ غیر ملکیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ کارروائیاں وزیرستان اور باجوڑ میں کی گئیں اور ابھی تک جاری ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کے اندر ہونے والی کارروائیوں کے دوران پندرہ سو سے لے کر پچیس سو تک القاعدہ ارکان وقتاً فوقتاً حصہ لیتے رہے ہیں۔ یہ لوگ وزیرستان اور باجوڑ آتے رہتے ہیں۔ یہاں قیام اور پلاننگ کرتے ہیں اور بوقت ضرورت مزاحمتی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں۔

القاعدہ سے منسلک دو گروپوں نے سال 8-2007ء کے دوران باجوڑ ایجنسی کے معرکے میں مخصوص انداز میں حصہ لے کر پاکستانی فورسز کا مقابلہ کیا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں نے محدود پیمانے پر باجوڑ سے قبل وزیرستان اور کرم ایجنسیوں میں بھی فورسز اور شیعہ گروپوں کے خلاف کارروائیوں میں باقاعدگی سے حصہ لیا تھا جبکہ پشاور سمیت دوسرے علاقوں میں ان کی قابل ذکر تعداد بھی گرفتار کی گئی۔ اس سے قبل میانوالی، فیصل آباد، رحیم یار خان، ملتان، جیکب آباد، کوئٹہ اور بعض دوسرے شہروں سے بھی ایک ہزار سے زائد غیر ملکی مختلف اوقات میں گرفتار کیے گئے تھے۔

باجوڑ ایجنسی کے الزرقاوی اور الظواہری گروپوں کا القاعدہ کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ ان کے ارکان کی تعداد پندرہ سو سے تین ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو باجوڑ سے ملحقہ افغانستان کے علاقوں میں نیٹو اور امریکہ کے خلاف کارروائیاں کر کے باجوڑ کو بطور بیس کیمپ استعمال کرتے ہیں۔ زرقاوی گروپ میں اردن، عراق اور شام سے تعلق رکھنے والے جنگجو شامل ہیں۔ ان کی قیادت ڈاکٹر محمد اسماعیل کرتے ہیں جو صوبہ ننگرہار کے

دارالحکومت جلال آباد کے باشندے بتائے جاتے ہیں۔

الظواہری گروپ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو کہ عراق، سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس گروپ کے ساتھ ایک وقت میں القاعدہ کے نائب ڈاکٹر ایمن الظواہری کے براہ راست رابطے تھے۔ الظواہری کی باجوڑ اور چترال آمد اور قیام کی اطلاعات بھی وقتاً فوقتاً ملتی رہتی تھیں۔ اس گروپ کے کمانڈر کا نام بھی اسماعیل ہے اور ان کا تعلق افغانستان کے صوبہ کنڑ سے بتایا جاتا ہے۔ اس گروپ کے ارکان کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ تاہم ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ماسٹر مائنڈ لیول کے لوگ ہیں اور ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کے ساتھ ابتداء ہی سے منسلک رہے ہیں۔ یہ گروپ بھی باجوڑ کو بطور بیس کیمپ استعمال کر کے افغانستان کے صوبہ کنڑ اور نورستان کے علاوہ مشرقی افغانستان کے متعدد دوسرے علاقوں میں مؤثر کارروائیاں کرتا ہے۔ ان دونوں گروپوں کو امریکہ کی جانب سے 2006ء سے لے کر 2008ء تک متعدد بار نشانہ بنایا گیا جس کے دوران مبینہ طور پر متعدد اہم کمانڈر اور ارکان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

القاعدہ اور اس سے منسلک ایسے دوسرے گروپوں میں بھی دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو پاکستان کے اندر بھی کارروائیوں میں حصہ لینے کے حامی ہیں اور وہ محدود پیمانے پر ایسا کرتے رہے ہیں جبکہ دوسرا گروپ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو نہ صرف یہ کہ ایسا کرنے کی مخالفت کرتا ہے بلکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ پاکستان کے طالبان اور دوسرے ایسی تنظیموں کو پاکستانی حکومتوں اور فورسز کے ساتھ معاملات خراب کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس قسم کے غیر ملکی پاکستان کے قبائلی علاقوں کو بطور بیس کیمپ استعمال کر کے پاکستانی فورسز کے بجائے سرحد کے اس پار امریکہ اور نیٹو افواج پر حملوں کو یقینی بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستانی فورسز کے ساتھ ٹکراؤ اور مزاحمت کی کوششوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ باجوڑ کے دونوں مذکورہ گروپ بھی اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔

غیر ملکی انٹیلی جنس اداروں اور ذرائع ابلاغ کے مطابق پاکستان میں پانچ ہزار سے لے کر گیارہ ہزار تک غیر ملکی عسکریت پسند موجود ہیں جن میں اکثریت کا تعلق القاعدہ سے

ہے۔ جن علاقوں میں ان کے قیام کی نشاندہی کی جاتی ہے ان میں وزیرستان، کرم ایجنسی، باجوڑ اور بلوچستان کے بعض حصے شامل ہیں جبکہ جنوبی پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی ان کے قیام اور نقل و حرکت کی اطلاعات ملتی رہی ہیں۔

پاکستان کی دونوں وزیرستان ایجنسیوں میں ازبکستان، تاجکستان اور چیچنیا میں تحریک چلانے والی تنظیم آئی ایم یو اسلامک مومنٹ آف ازبکستان کے اہم کمانڈرز اور جنگجو بھی لمبے عرصے تک قیام پذیر رہے ہیں۔ اس تنظیم کے سربراہ قاری طاہر یلدیشوف 2006ء سے لے کر 2008ء تک بیت اللہ محسود کے ساتھ ان کے مراکز مکین اور لدھا میں نہ صرف یہ کہ قیام پذیر رہے بلکہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مزاحمتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ 2007ء کو اس گروپ کے خلاف طالبان کے دوسرے کمانڈروں حافظ گل بہادر اور مولوی نذیر نے لشکرکشی کی جس کے بعد بے شمار غیرملکیوں کو علاقہ چھوڑنا پڑا اور طاہر یلدیشوف کو جنوبی وزیرستان میں بھی متعدد خطرات لاحق ہوگئے تو وہ ساتھیوں کے ہمراہ افغانستان چلے گئے یا انڈرگراؤنڈ ہوگئے۔ اس جھڑپ کے دوران متعدد غیرملکی مارے گئے جبکہ ان کے حامیوں کے گھر نذر آتش کردیئے گئے تھے۔

لدھا، مکین اور میرعلی میں ایسے بے شمار ازبک اور تاجک باشندے بھی موجود ہیں جن کی اکثریت نے مقامی خواتین سے شادیاں کی ہوئی ہیں اور 2007ء کے بعد پرامن زندگی گزار کر حکومت مخالف کارروائیوں یا جہادی سرگرمیوں سے لاتعلق ہوگئے ہیں۔

آئی ایم یو کی ایک قابل ذکر تعداد بیت اللہ محسود اور سراج الدین حقانی کے پاس وقتاً فوقتاً قیام پذیر ہوتی رہی ہے۔ یہ لوگ باجوڑ اور کرم ایجنسیوں کے علاوہ سوات میں 2008ء والی مزاحمت کے دوران بھی دیکھے گئے۔

القاعدہ اور آئی ایم یو کے علاوہ جس تیسری اہم تنظیم کے رہنما وزیرستان میں قیام کرچکے ہیں وہ چینی عسکریت پسندوں اور مزاحمت کاروں کا گروپ ہے۔ اس تنظیم کا نام ای ٹی آئی ایم اسلامک مومنٹ آف فریڈم ہے۔ اس تنظیم کے قائدین اور ارکان کی تعداد کو انتہائی خفیہ رکھا جاتا ہے تاکہ پاکستان اور چین کے درمیان تعلقات خراب نہ ہوں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 2007-8ء کے دوران اس گروپ کے پچاس سے لیکر تین سو تک افراد

وزیرستان میں موجود تھے۔ ان لوگوں کی قیادت عبیداللہ نامی کمانڈر کر رہے تھے جو کہ چین کے سنکیانگ ریجن کے باشندے تھے۔

عبیداللہ 2005ء کے دوران انگور اڈہ وزیرستان میں پاکستانی فورسز اور طالبان کے درمیان شدید ترین جھڑپ کے دوران جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تاہم ان کے متعدد ساتھی اب بھی وزیرستان اور سوات میں موجود ہیں۔ ان لوگوں میں وہ پچاس افراد بھی شامل ہیں جن کے ناموں کی فہرست چینی حکام نے جنرل پرویز مشرف کو دورۂ چین کے دوران پیش کی تھی اور ان کی حوالگی کا مطالبہ کیا تھا۔ ان لوگوں کی شکلیں ازبک اور تاجک باشندوں سے ملتی ہیں اس لیے تینوں نسلوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ذرائع کے مطابق 2003ء ہی کے دوران یہ لوگ افغانستان سے وزیرستان آئے اس وقت ان کی تعداد 160 تھی۔ درہ آدم خیل کے طالبان کمانڈر طارق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آئی ایم یو اور ای ٹی آئی ایم کے بڑے حامی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ 2008ء کے آخر میں پشاور اور درہ آدم خیل کے مختلف علاقوں میں ستر سے زائد ازبک اور چیچن گرفتار کیے گئے۔ ان تین تنظیموں کے علاوہ پاکستان میں لیبیا اسلامک فائٹنگ گروپ کے لوگ بھی قیام کرتے رہے ہیں۔

باب 5

طالبان کے مالی اور دفاعی وسائل

کسی بھی تحریک کی وسعت اور پھیلاؤ سرمائے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ تحریک 'مسلح مزاحمت یا بغاوت' کی شکل اختیار کر جائے تو پھر اس کے لیے سرمائے کے ساتھ اسلحہ کی فراہمی بھی ایک بہت بڑا سوال بن جاتی ہے۔ پاکستان میں طالبان کی اس 'مزاحمت' کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ لیکن اس کی شدت میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج اس پر قابو پانے میں ہنوز ناکام نظر آتی ہیں۔

ایک نقطۂ نظر تو یہ بھی ہے کہ یہ جنگجو پہاڑی علاقوں میں ایک مخصوص تربیت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس طویل جنگ کے دوران انہوں نے خود بھی ایسے تجربات حاصل کر لیے ہیں جو انہیں اپنی حکمت عملی بنانے میں مددگار ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جدید ترین اسلحہ اور ہتھیار بھی موجود ہیں بلکہ ایسے ہتھیار جن کا فوج یا دیگر اداروں کے پاس بھی مؤثر توڑ اور جواب نہیں۔

لیکن یہ سوال بہرحال دلچسپی سے خالی نہیں کہ آخر ان جنگجوؤں کے پاس جدید ترین ہتھیاروں کے ساتھ سرمایہ کہاں سے آتا ہے کیونکہ بعض عسکریت پسند گروہ تو ایسے بھی ہیں جو اپنے جنگجوؤں کو باقاعدہ تنخواہیں بھی ادا کرتے ہیں جو ہر مہینے کے پہلے جمعۃ المبارک کو ادا کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قبائلی اور بندوبستی علاقوں کے اکثر بے روزگار ان گروہوں کے

باقاعدہ تنخواہ دار بن چکے ہیں۔ بہرحال اس کے باوجود پاکستان کے عسکریت پسندوں کے تنظیمی اور عسکری نظام، تربیتی مراکز، نقل و حرکت اور کارروائیاں دیکھ کر یہ سوال ابھرنا ایک فطری امر ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں طالبان اپنے اخراجات کس طرح اور کہاں سے پورا کرتے ہیں؟ اس ضمن میں مختلف قسم کے دعوے کیے جاتے ہیں۔ تاہم سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ اخراجات کے ذرائع سے قبل یہ پتہ لگایا جائے کہ ان کے پاس اتنا اسلحہ کہاں سے آتا ہے کہ وہ برسوں سے فورسز اور مخالفین کے خلاف لڑتے چلے آرہے ہیں اور ان کی جنگی قوت بھی کم نہیں ہوتی۔

کہا جاتا ہے کہ طالبان کے پاس پستول سے لے کر راکٹ لانچر، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور مہلک ہتھیاروں تک کے تمام اسلحہ موجود ہے۔صوبائی وزارت داخلہ (صوبہ سرحد) نے 5 اپریل 2009ء کو ایک رپورٹ میں کہا کہ عسکریت پسندوں کے پاس ایسا جدید اسلحہ اور مواصلاتی نظام موجود ہے جو حکومتی فورسز اور پولیس کے پاس بھی نہیں ہے۔ رپورٹ میں طالبان کی بالادستی اور کامیاب کارروائیوں کو ان کے جدید اسلحے کی موجودگی ہی کا سبب بھی قرار دیا گیا ہے۔

اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ طالبان کے پاس کسی ریاست سے کم جنگی طاقت نہیں۔ اب تک کی جتنی بھی کارروائیاں ہوئی ہیں ان میں ریاستی ادارے ناکام جبکہ عسکری گروپ کامیاب دکھائی دیئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ پاکستان، افغانستان، یہاں تک کہ امریکہ جیسی ریاستوں سے ٹکر لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ کئی بار ثابت ہو چکا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں پاکستانی طالبان کو افغانستان میں موجود طالبان اور القاعدہ گروپوں نے اسلحہ فراہم کیا تھا۔ افغانستان میں طالبان نے پاکستان کی اپنی حامی حکومتوں سے بڑی تعداد میں اسلحہ حاصل کیا تھا۔ اسی اسلحے کے زور پر جب طالبان نے مجاہد تنظیموں اور جنگی سرداروں کے خلاف کارروائیاں کرکے ان کو بے بس کیا تو وہاں بھی طالبان کو بے انتہا اسلحہ ہاتھ آ گیا۔ طالبان ریاست کے قیام کے بعد پاکستان، سعودی عرب اور چین نے ان کو بڑی مقدار میں اسلحہ فراہم کیا۔ نائن الیون کے بعد جب یہ لوگ تورابورا، پکتیا،

خوست اور دوسرے سرحدی صوبوں کے راستے قبائلی علاقوں میں داخل ہو گئے تو اپنے ساتھ بڑی تعداد میں جدید اور بھاری اسلحہ بھی لے آئے۔

2002ء کے بعد 2004ء تک چونکہ افغانستان میں طالبان کی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں اس لیے ان کے کمانڈروں اور جنگجوؤں نے وزیرستان اور بعض دوسرے علاقوں کو اپنے ٹھکانوں میں تبدیل کیا جس کے دوران انہوں نے نہ صرف پاکستان کے مذہبی حلقوں سے روابط اور تیز کر دیئے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں نوجوانوں کو تربیت بھی دی۔ 2004-5ء کے دوران میں طالبان (افغانی) امریکہ اور نیٹو کے خلاف صف آرا ہو کر دوبارہ افغانستان میں داخل ہونے لگے تو واپسی پر انہوں نے مناسب تعداد میں اسلحہ پاکستانی طالبان کے پاس چھوڑ دیا۔ اس اقدام کا مقصد پاکستانی عسکریت پسندوں کو کارروائیوں کے لیے تیار کرنے کے علاوہ وزیرستان کو حسب معمول بیس کیمپ بنائے رکھنا تھا۔

2004ء کے دوران جب پاکستان پر دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا تو طالبان نے اسی اسلحہ کو استعمال کرنا شروع کیا۔ اس عرصے میں بعض عالمی جہادی تنظیمیں، امدادی ادارے، اسلامک ٹرسٹ اور عرب شخصیات نے دونوں اطراف کے عسکریت پسندوں کو مالی امداد دینا تیز کر دیا۔

پاکستانی فورسز کے خلاف پاکستانی طالبان کی کارروائیوں کی پلاننگ کے دوران اس بات پر خصوصی توجہ دی گئی کہ پاکستانی فورسز جو امریکہ کے کہنے پر انہیں تسخیر کرنے آئی ہیں ان سے ترجیحی بنیادوں پر اسلحہ چھیننے کی کوشش کی جائے۔ اس پلاننگ کے نتیجے میں 2004ء سے لے کر 2007ء تک کے تین سالوں کے دوران پاکستانی فورسز سے بڑی تعداد میں اسلحہ چھینا گیا اور متعدد اسلحہ ڈپوز اور قافلوں پر حملے کیے گئے۔ اس دوران گاہے بگاہے اس قسم کی اطلاعات بھی موصول ہوتی رہیں کہ پاکستانی فورسز نے متعدد بار اپنی مرضی سے اپنا اسلحہ طالبان کے حوالے کر دیا۔ اپنی مرضی سے فورسز کے ہاتھوں ہتھیاروں کی حوالگی کو پاکستان کے خفیہ اداروں کی حکمت عملی کا نام دیا گیا۔ اس اقدام کا مقصد افغانستان کے طالبان کو اسلحہ کی فراہمی میں سہولت فراہم کرنا تھا جو آئی ایس آئی کی مستقل پالیسی کا ایک اہم جزو تھا۔

پاکستانی طالبان نے پولیس سے بھی بڑی تعداد میں ہتھیار چھین لیے اس مقصد کے

لیے قبائل سے ملحقہ اضلاع میں ایک منصوبے کے تحت پولیس کے گوداموں اور چوکیوں کو نشانہ بنایا جاتا رہا۔ یہ لوگ جن ممالک کا اسلحہ استعمال کرتے آئے ہیں ان میں امریکہ، روس، چین اور پاکستان سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ ان کشمیری گروپوں نے بھی طالبان کو اسلحہ فراہم کیا جو کشمیر سے متعلق پاکستان کی پالیسی بدلنے کے بعد قبائلی علاقوں کا رخ کر کے طالبان کے ساتھ مل گئے تھے اور ان کے ساتھ مشترکہ کارروائیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ عسکریت پسندوں نے معمول کی کارروائیوں کے لیے اسلحہ سازی کی مقامی صنعتیں بھی قائم کیں اس مقصد کے لیے درہ آدم خیل کے اسلحہ کاریگروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔

اسلحہ کے علاوہ مالی وسائل کی فراہمی کے لیے ان کو متعدد ممالک، خفیہ اداروں، بااثر جہادی شخصیات، کاروباری حلقوں، اسلامک این جی اوز، جہادی تنظیموں اور سب سے بڑھ کر القاعدہ نیٹ ورک کی مستقل معاونت حاصل رہی۔ 2008ء کے وسط تک عالمی میڈیا میں تواتر سے الزام لگایا جاتا رہا کہ پاکستانی خفیہ ادارے طالبان کو فنڈز مہیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، دی گارڈین اور خلیج ٹائمز نے متعدد بار اپنی رپورٹیں شائع کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ ادارے نہ صرف دونوں جانب کے طالبان کو سیاسی اور عسکری امداد فراہم کرتے ہیں بلکہ وہ بڑی رقوم بھی مہیا کرتے ہیں۔ اوباما کے برسراقتدار آنے کے بعد تو اس قسم کے الزامات میں نہ صرف بے انتہا اضافہ ہوا بلکہ ان الزامات کی بنیاد پر نئی اعلان کردہ افغان پالیسی کے دوران پاکستان ہی کو امریکہ کا سب سے بڑا ٹارگٹ قرار دیا گیا۔

پاکستان کے ایک معتبر ادارے پاکستان سٹڈیز فار پیس (PIPS) نے ایک رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ پاکستانی اور افغانی عسکریت پسند گروپوں کو 35 سے زائد جہادی ٹرسٹ اور دوسرے متعلقہ ادارے مستقل بنیادوں پر فنڈز فراہم کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں متعدد 2002ء اور 2007ء میں بند کر کے ان کے اکاؤنٹس منجمد کر دیے گئے تھے۔ پاکستانی طالبان نے اپنے اخراجات پورا کرنے اور وسائل میں اضافے کے لیے جو دوسرا اہم طریقہ ایجاد کیا وہ حکومتی شخصیات، غیرملکی اہلکاروں، این جی اوز کے سربراہوں اور امیر ترین افراد کو اغوا کر کے ان کے بدلے کروڑوں کا تاوان طلب کرنا تھا۔

اغوا کی ان وارداتوں کے نتیجے میں طالبان کے بیک وقت متعدد مقاصد پورا ہورہے تھے۔ پہلا مقصد تو یہ پورا ہورہا تھا کہ حکومت اور غیرملکی ریاستوں پر زبردست دباؤ بڑھایا جاتا اور یہ ثابت کیا جاتا کہ عسکریت پسند جب چاہیں اپنی شرائط منوانے اور اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لیے کسی بھی حکومتی یا غیرملکی شخصیت کو اٹھا سکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ حکومتی اداروں کو نااہل، بے خبر اور ناکام قرار دیا جائے جبکہ تیسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ ان افراد کی رہائی کے بدلے کروڑوں کا تاوان طلب کیا جانا ممکن بن جاتا۔ شخصیات کو اٹھائے جانے کے واقعات میں 9-2008ء کے دوران غیرمعمولی اضافہ ہوا۔ متعدد شخصیات کے بدلے بیک وقت اپنے ساتھیوں کی رہائی اور بھاری تاوان کو یقینی بنایا گیا اور اس ضمن میں متعدد مثالیں موجود ہیں جن لوگوں کو اٹھایا جاتا رہا ان کی رہائی کے بدلے پچاس لاکھ سے لے کر پانچ چھ کروڑ تک کی بھاری رقم وصول کی جاتی رہی۔

2008ء کے دوران فاٹا اور صوبہ سرحد میں اغوا کی اتنی وارداتیں ہوئیں جن کی ملکی تاریخ میں اس سے قبل مثال ملنا مشکل ہے۔

طالبان نے وسائل میں اضافے کے لیے اہم شخصیات کو اٹھائے جانے کا سلسلہ صوبہ سرحد یا قبائلی علاقوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے یہ سلسلہ اسلام آباد، لاہور، راولپنڈی اور کراچی جیسے شہروں تک بھی انتہائی کامیابی سے پھیلا دیا جبکہ کراچی شہر کو خصوصی طور پر ہدف بنایا گیا۔ کیونکہ یہ پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی اور کاروباری مرکز ہے اور یہاں طالبان کا محدود نیٹ ورک اور عمل دخل بھی موجود ہے۔ کراچی کے صاحب ثروت پشتونوں کی باقاعدہ لسٹیں بنائی گئیں جب بھی ان کو ضرورت ہوتی ان فہرستوں کی بنیاد پر متعدد لوگوں سے رابطے کر کے ان سے معقول رقم حاصل کی جاتی۔ جن لوگوں نے رقم دینے سے انکار کیا ان کو یا تو اغوا کیا گیا یا بعض کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس ضمن میں خیبر ایجنسی سے تعلق رکھنے والے ایک امیر شخص کے قتل کی ذمہ داری بھی طالبان پر عائد کی گئی۔ جس کو اغوا کرنے کے بعد نومبر 2008ء میں کراچی میں قتل کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شخص سے رہائی کے بدلے آٹھ کروڑ روپے طلب کیے گئے تھے جن کی ادائیگی سے ٹال مٹول او پولیس کی ناقص حکمت عملی کے باعث اس کو مار دیا گیا۔

طالبان قبائل سے تعلق رکھنے والے دوسرے کاروباری لوگوں سے بھی رضا کارانہ طور پر بڑی تعداد میں چندے کے نام پر باقاعدگی سے رقوم وصول کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ کسی مزاحمت یا انکار کے بجائے مفاہمت کا راستہ اپنا کر معقول رقم فراہم کر کے ان کی مدد کرتے ہیں۔ جو لوگ طالبان کے زیر قبضہ علاقوں میں کاروبار یا ملازمتیں کرتے ہیں ان کو بھی باقاعدگی سے مناسب پیسے ایک طرح ٹیکس ادا کرنے کا پابند بنایا گیا ہے۔

شورش زدہ علاقوں میں سرکاری بینکوں کو لوٹنا بھی طالبان کی حکمت عملی کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ لوگ بینکوں پر حملہ آور ہو کر دستیاب رقم اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہنگو، بنوں، ٹانک، ڈی آئی خان، دیر اور سوات میں رپورٹ کیے گئے جب بینکوں کو حملوں کے بعد پیسوں سے خالی کر دیا گیا۔

وسائل کے ان بڑے ذرائع کے علاوہ طالبان کو ان کے حامی عام لوگ بھی مالی معاونت فراہم کرتے ہیں اور یہ سلسلہ کسی وقفے کے بغیر جاری رہتا ہے۔ مثال کے طور پر سوات میں جب 2007ء کو مولانا فضل اللہ نے اپنی تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا تو متعدد علاقوں میں عام لوگوں نے بڑی تعداد میں رقوم، اسلحہ، ساز وسامان اور زیورات چندے کی شکل میں ان کے سپرد کیے۔ خواتین نے غیر معمولی تعداد میں اپنے زیورات رضا کارانہ طور پر ان کے حوالے کر دیئے جبکہ خواتین اور بچوں سے نقدی کی صورت میں کروڑوں روپے فضل اللہ کے ساتھیوں کے ہاں جمع کرائے گئے۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

اِنتباہ

الحمد اللہ ہم سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ہر مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ناجائز ہاتھ اُٹھانے کا حق نہیں ہے ہم نہ تو خود ظالم ہیں اور نہ ظالموں ... ساتھی ہیں بلکہ ہر مظ... مسلمان کا مدد کرنا ہمارا فریضہ ہے البتہ ہم اللہ تعالیٰ ... ین کے د... کے لیے تلوار سے بھی تیز ہیں

... جہاد ... شوریٰ مجاہدین شمالی وزیرستان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے ... کسی نے جاسوسی ... الزام کے علاوہ کوئی بھی فرد، بچہ یا کسی کا گاڑی صرف تاوان کی غرض سے اغوا ... یا ہو وزیرستان کے اندر سے یا وزیرستان کے باہر سے اغوا کیا ہو۔

... ن لوگوں کو 5 دن کی مہلت دی جاتی ہیں یعنی یکم فروری سے 5 فروری 2009 تک تاکہ ... بچوں، افرادوں، اور گاڑیوں کو بلا معاوضہ اپنے اہل خانوں کو اور گاڑیوں کو اپنے مالکوں کو واپس کر دیے جائیں ... کے بعد کسی بھی گروپ یا شخص کا کوئی بھی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔

اور شوریٰ مجاہدین شمالی وزیرستان ... کے خلاف سخت کاروائی کریگی۔

منجانب: امیر و شوریٰ مجاہدین

شمالی وزیرستان ایجنسی

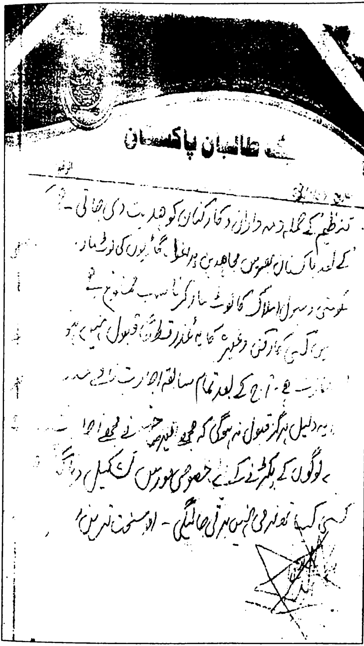

طالبان پاکستان

تنظیم کے تمام ذمہ داران و کارکنان کو ہدایت دی جاتی ہے۔

کے لئے پاکستان [illegible] مجاہدین [illegible] گاڑیوں کی لوٹ مار

حکومتی و سرکاری املاک کو لوٹ مار کرنا سب ممنوع ہے

[illegible] کسی کارکن و ذمہ دار کا یہ عذر قطعاً قبول نہیں ہوگا

[illegible] آج کے بعد تمام سابقہ اجازت [illegible]

یہ دلیل ہرگز قبول نہ ہوگی کہ مجھے فلاں صاحب نے مجھے اجازت

لوگوں کے پکڑنے کے خصوصی طور میں [illegible]

کسی کو تنظیمی اجازت نہیں دی جائیگی۔ [illegible]

باب 6

انتہاپسندی: ریاستی اور سیاسی قوتوں کی کوتاہیاں

تاریخی تناظر میں ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ پاکستان کے قبائلی علاقے اور افغانستان کے مشرقی پختون علاقے صدیوں سے تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے جڑے ہوئے ہیں، ان کی لسانی اور معاشرتی روایات بھی کئی حوالوں سے مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریز نے دو باران علاقوں کو فتح کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا تو اسے مزید ناکامی ڈیورنڈ لائن کے مستقل تعین نہ ہونے کی صورت میں ملی تھی چنانچہ 1893ء میں جب ڈیورنڈ لائن کے بارے معاہدہ ہوا تو اس کی عارضی حیثیت اس کو محض سوسال تک قبول کرنے سے بھی نمایاں ہوئی اور پھر یوں بھی ہوا کہ ڈیورنڈ لائن کے کچھ حصے غیرواضح رہے جو آج بھی موجود ہیں۔ یہی وہ غیرواضح حصے ہیں جو کل بھی سرحد پر مداخلت کے لیے استعمال ہوتے تھے اور آج بھی ان علاقوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے جبکہ یہی وہ حصے ہیں جو حالت امن میں افغانستان سے سمگلنگ کے لیے بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔

ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ آج بھی متنازع سمجھا جاتا ہے۔ افغانستان کے کیمونسٹ حکمرانوں سے لے کر مجاہدین اور پاکستان کے حمایتی طالبان تک سوسال کا متعین عرصہ گزرنے کے بعد اس ڈیورنڈ لائن کو متنازع ہی قرار دیتے رہے ہیں۔ جس سے یہ تاثر نمایاں ہوتا رہا کہ ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف کے پشتون جب بھی سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط اور مستحکم ہوں گے تو وہ اس مسئلے پر ازسرنو غور کرنے کا مطالبہ کریں گے۔ شاید ایسا ہی اندیشہ پاکستان کے

حکمران طبقوں کے ذہن میں بھی کہیں موجود تھا۔ یہ خوف اس وقت غیرمحسوس طور پر زیادہ نمایاں نظر آیا جب 1990ء اور 2000ء کے دوران تک پاکستان کے حمایت یافتہ مجاہدین کابل پر قابض رہے تھے اور انہوں نے بھی ڈیورنڈ لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا اور اس پر بحث و مباحثہ کا آغاز کردیا۔

ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ 47ء، 64ء، 74ء اور 79ء میں پاکستان میں مختلف حکومتوں کے دور میں بھی سامنے آتا رہا تھا لیکن اس کی شدت سردار داؤد اور ڈاکٹر نجیب اللہ کے دور اقتدار میں غیرمعمولی طور پر محسوس کی گئی۔ 1980ء کی سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران میں اگرچہ افغانستان بین الاقوامی قوتوں کا اکھاڑہ بن گیا تھا لیکن اس کے باوجود وقتاً فوقتاً افغان سیاسی قیادت کسی نہ کسی شکل میں ڈیورنڈ لائن کے مسئلے کو نمایاں کرتی رہی جبکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے پشتون قوم پرست بھی اس مسئلہ کو متنازع بنا کر ہی پیش کرتے رہے تھے۔

ایک اور تلخ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ نئی ریاست کے قیام کے باوجود نہ صرف پشتون آبادی کو بلوچستان، سرحد اور قبائلی علاقوں کے تین روائتی اور انتظامی یونٹوں میں ہی تقسیم رکھا گیا یعنی وہ علاقائی تقسیم جو انگریز نے مخصوص مقاصد کے لیے کی تھی اس کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ مزید بدقسمتی یہ کہ قبائلی علاقوں کو 'پولیٹیکل ایجنٹوں' کے ذریعے ہی چلایا گیا۔ اسے نہ تو صوبائی درجہ دیا گیا اور نہ ہی کسی صوبے کے انتظامی ڈھانچے کا حصہ بنایا گیا۔ چنانچہ قبائلی عوام کو ووٹ کا حق ملنے یا پھر اپنے نمائندے براہ راست منتخب کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ان علاقوں کو مرکز کے ذریعے براہ راست کنٹرول کیا جاتا رہا جس کے باعث ایک طرف تو قبائلی عوام پشاور اور اسلام آباد سے دور ہوتے گئے تو دوسری طرف انہیں معاشرتی اور معاشی سہولتیں بھی میسر نہیں آسکیں تو ان کی محرومیوں اور مشکلات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

اس تناظر میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ......وہ چاروں طرف سے ایک طرح گھیراؤ کا شکار تھے انہیں دیگر پشتون علاقوں سے بھی روابط میں مشکلات تھیں جو قبائلی عوام کی ناراضی اور غصہ کا باعث بنتی رہی۔ 1997ء میں ان کو بالغ رائے دہی کے ذریعے ووٹ کا حق تو دیا گیا مگر یہ نہ تو کسی علیحدہ یونٹ یا پھر قریب ترین صوبہ سرحد اور بلوچستان کا حصہ تھا بلکہ اس کے

باوجود اسے مرکز کے ہی کنٹرول میں رکھا گیا۔ستم ظریفی کی انتہا تو یہ ہے کہ نصف کروڑ سے زائد کی یہ آبادی اب بھی اپنی اسمبلی، بلدیاتی نظام اور عدالتوں سے محروم ہے یہی وہ بدترین صورتحال تھی جس میں ان علاقوں میں ان لوگوں کے گھسنے کا ٹاسک آسان بنا دیا جو نہ صرف محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے بلکہ ایک مخصوص ایجنڈے پر کام کرنا چاہتے تھے مزید یہ کہ انہیں پاکستان کے بعض مقتدر عناصر کی حمایت بھی حاصل تھی۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں 'پختونستان' کا ایشو بار بار سر اٹھاتا رہا اور جس کی بازگشت آج پھر ایک نئے تناظر میں 'انتہا پسند ریاست' کی شکل میں سنائی دینے لگی ہے جس کو بعض عالمی قوتوں کی حمایت کی چہ میگوئیاں بھی ہورہی ہیں اور یہ کہا جارہا ہے کہ ایک 'جنونی ریاست' چین کے لیے زیادہ مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔

بہرحال ایک نقطۂ نظر تو یہ بھی ہے کہ......اگر پاکستان کی مقتدر قوتیں افغانستان میں بے جا مداخلت نہ کرتیں اور پشتون آبادی کو جو اب چار کروڑ سے تجاوز کرچکی ہے اس کے سیاسی اور معاشی حقوق دے دیتیں تو شاید آج یہ صورتحال بالکل مختلف ہوتی یہ لوگ بھی 'انتہاپسندی' کی طرف مائل ہونے کے بجائے اپنی بہترین صلاحیتیں پاکستان کی ترقی اور استحکام کے لیے استعمال کررہے ہوتے بلکہ...... پاکستان کے تین بڑے شہروں پشاور، کراچی اور کوئٹہ میں طالبانائزیشن کی گونج بھی سنائی نہ دیتی۔ کیونکہ ایک حقیقت تو یہ بھی ہے کہ صوبہ سندھ کا دارالحکومت اور پاکستان کا سب سے بڑا شہر کراچی آج پشتون آبادی کا بھی سب سے بڑا شہر ہے تو یہی شہر کابل، کوئٹہ اور پشاور کے بعد پختونوں کا سب سے بڑا شہر مانا جاتا ہے۔ اور یہ سب لوگ اپنے معاشی مسائل کے باعث ہی اپنے آبائی علاقے چھوڑنے پر مجبور ہوئے اگر انہیں مقامی سطح پر وسائل روزگار کے ساتھ زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی فراہم کی جاتیں تو یہ لوگ بھی ہجرتوں پر مجبور ہوتے اور نہ ہی یہ قوم ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی لیکن اس پس منظر میں اب یہ سوال بھی اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے کہ اگر 'نئی ریاست' وجود میں آئی تو پھر ان بکھرے ہوئے پختونوں کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہوں گی لیکن اس کے بالمقابل ایک مکتبۂ فکر کچھ اور دلائل بھی دیتا ہے اس کا کہنا ہے کہ مٹی کی محبت کے علاوہ......انسان اپنے مفادات سے جڑا ہوتا ہے اور یہی وہ مفادات ہیں جو اسے ہجرت کر کے دوسری جگہوں پر آباد ہونے پر مجبور کرتے ہیں

جب یہ مفادات گہرے ہوتے ہیں تو مٹی کے رشتے کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں خالصتان کی تحریک کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سکھوں کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ مفادات کے تابع ہوکر پورے ہندوستان میں پھیل چکا تھا۔ یہی صورت آج صوبہ سرحد کے پختونوں کی بھی ہے جن کے مفادات کراچی اور پنجاب کے بے شمار شہروں تک پھیل چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر آج پختون قوم پرست پنجاب کو گالی دیتے ہیں تو ان کو وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوتی جو 80ء کی دہائی تک حاصل ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تاجر طبقہ مفادات کی وسعت میں پل کا کردار ادا کرتا ہے اور یہ کام 80ء کی دہائی کے بعد بہت تیزی سے ہوا ہے آج پنجاب کے ہر بڑے شہر میں 'پٹھان مارکیٹ' بن چکی ہے جو سرحد سے مال منگوا کر پنجاب میں فروخت کرتے ہیں۔ یہ طبقہ مفادات کے شکنجے میں پھنس چکا ہے اب اس کا آزاد ہونا مشکل ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو کبھی کسی تحریک کا حصہ نہیں بنتا۔

لیکن بہرحال...... یہ نقطۂ نظر اپنی جگہ اہم ہے پھر بھی یہ سوال صوبہ سرحد کے دانشور حلقوں میں زیر بحث رہا ہے کہ اگر پختون بحیثیت قوم کبھی اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو ان کی آبادی کی اکثریت کے حوالے سے ریاستی اداروں کے لیے بیک وقت تین علاقوں یا صوبوں کے علاوہ پڑوس میں موجود اسلام آباد کو سنبھالنا کس حد تک ممکن ہوگا؟ اگرچہ اس حوالے سے تو بظاہر ابھی کوئی خطرہ نہیں لیکن طالبانائزیشن نے اس پس منظر میں خدشات اور اندیشے ضرور اجاگر کردیئے ہیں۔ کراچی میں پختون پانچ سے زیادہ مرتبہ مزاحمت کے ذریعے اپنی افادیت ثابت کرچکے ہیں۔ یہ سارا پس منظر بیان کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ پاکستان نے بعض حوالوں سے اگر افغانستان کے عوام کو دور کرلیا ہے تو اپنی پختون آبادی کو بھی سیاسی اور معاشی طور پر مطمئن کرنے کی عملی کوشش نہیں کی جس کے باعث ہر دو اطراف سے ریاست پاکستان کے لیے خطرات تو موجود ہیں۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں آج طالبان کے بعض عناصر نے مزاحمت کی کوششوں کو پشتون سیاست اور محرومیوں بلکہ پشتون نیشنلزم کے ساتھ جوڑ دیا ہے ایک اور تلخ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ پشتونوں کو قومی دھارے میں شامل نہ کرنے جیسی غلطی کا اعادہ امریکہ افغانستان میں بھی کرچکا ہے بلکہ ایک نقطۂ نظر میں وہ افغانستان میں اس کی سزا مزاحمت کی شکل میں

بھگت رہا ہے۔ لیکن اب اس کو اپنی غلطی کا احساس تو ہو رہا ہے اور وہ اسی لیے ''گڈ طالبان'' کے ساتھ مذاکرات کرنے اور ان کے ساتھ اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔
بہرحال ایک اور سچ تو یہ بھی ہے کہ سوویت فوجوں کے انخلا کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان کو تنہا چھوڑ کر سیاسی اور اقتصادی نظام کو یکسر نظرانداز کر کے ایک خطرناک خانہ جنگی اور تباہی کے راستے پر چھوڑ دیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں القاعدہ اور دوسری تنظیموں کے ساتھ طالبان کی بالادستی قائم ہوئی تھی اگر امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان کی ترقی واستحکام پر توجہ مرکوز کرتے تو آج یقیناً صورتحال مختلف ہوتی اس میں پاکستان کا کردار بھی کوئی ایسا شاندار نہیں ہے۔
یہ بھی پوری نہیں تو آدھی سچائی ضرور ہے کہ......90ء کی دہائی میں افغانستان کے جنگجو گروپوں کی آپس کی لڑائی نے آبادی کے بڑے حصہ کے دل میں طالبان کے لیے ہمدردی کا عنصر پیدا کر دیا تھا تو ادھر قبائلی علاقوں کو پاکستان کے مقتدر حلقوں کی طرف سے مسلسل نظرانداز کیے جانے کے باعث اسلام کے نام پر متبادل نظام کی خواہش کو جنم دیا تھا کیونکہ یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ رہی ہے کہ وزیرستان، باجوڑ اور سوات میں لوگوں نے بعض شدید ترین اختلافات کے باوجود قانون، انصاف اور عدالت سے متعلقہ امور پر طالبان کو باقاعدہ درخواستیں پیش کی تھیں اور اب جبکہ سوات میں صوبہ سرحد کی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد عدالتی نظام قائم ہوا ہے اور فوری انصاف کا عمل شروع ہوا ہے تو روزانہ سینکڑوں درخواستیں انصاف کے لیے موصول ہو رہی ہیں۔ یہ سب وہی لوگ ہیں کہ جو قانونی پیچیدگیوں، انصاف میں تاخیر اور دیگر حربوں کی وجہ سے اس عدالتی عمل سے تنگ آ چکے تھے۔
ادھر ایک اور نقطۂ نظر تو یہ بھی ہے کہ......اسی کی دہائی میں آنے والے تیس لاکھ مہاجرین نے بھی سرحد کے بہت سے شہروں کو تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے شدید متاثر کیا۔ یہ لوگ محض کیمپوں تک محدود نہیں رہے۔ انہیں ہر طرف گھومنے پھرنے کی آزادی تھی چنانچہ جہاں ان شہروں میں جرائم میں اضافہ ہوا وہاں مخصوص ثقافتی اثرات بھی مرتب ہوئے اور ایک مخصوص نظریاتی تسلط کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ تو دوسری طرف ان شہروں کی اقتصادیات بھی متاثر ہوئی جس کی ایک مثال پشاور پر افغان ٹرانسپورٹ کا قبضہ بھی تھا جو آج اس سے بھی کہیں

زیادہ مضبوط ہو چکا ہے کیونکہ ان میں سے اکثریت افغانستان واپس نہیں گئی چنانچہ یہ سوال بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ تیس لاکھ مہاجرین میں سے کتنی تعداد میں افغانی افغانستان میں تبدیلی کے بعد واپس گئے ہیں اور کتنے ابھی تک یہیں مقیم ہیں۔ یہاں ایک قابل ذکر بات تو یہ بھی ہے کہ ان مہاجرین کو کچھ ادارے اور تنظیمیں افغانستان میں کارروائیوں کے لیے بھی استعمال کرتی رہی ہیں جنہیں امریکی قبضے کے بعد واپس ان علاقوں میں دھکیل دیا گیا تھا یا پھر یہ محفوظ پناہ گاہوں میں آ گئے تھے۔

بہرحال اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ انتہاپسندی کا یہ سلسلہ ایک عالمگیر اسلامی آئیڈیالوجی اور غیرملکی مداخلت کی بنا پر شروع ہوا تھا لیکن اس میں کچھ واضح سیاسی اور اقتصادی وجوہات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ اسباب تھے جن پر امریکہ نے سرحد کے اس پار اور نہ ہی سرحد کے اس طرف پاکستان نے سنجیدگی سے غور کیا ہے کیونکہ طالبان تحریک میں اگر ایک طرف انتہاپسند اور نظریاتی لوگ موجود ہیں تو دوسری طرف معاشرتی اور معاشی مسائل کا شکار نوجوان طبقہ بھی کثیر تعداد میں ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا ہے چنانچہ اگر ایک طرف پاکستانی اور امریکی قوتوں کو بھی اس صورتحال سے مکمل طور پر بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آج اگر جماعت اسلامی، جے یو آئی کے فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق طالبان کی پرتشدد کارروائیوں کو دبے لفظوں میں تنقید کا نشانہ بناتے نظر آتے ہیں تو کل تک یہی وہ لوگ تھے جو نہ صرف مجاہدین کے سرپرست اعلیٰ اور طالبان کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے بلکہ خود کو ایک دوسرے سے زیادہ مؤثر ثابت کرنے کی بھی کوششیں کرتے تھے اپنے مجاہدین کے ساتھ تعلق پر فخر بھی کرتے تھے اور طالبان کے نام پر اپنے سیاسی مفادات کو بھی آگے بڑھا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج طالبان ان لوگوں کو غداروں اور ریاست کے ایجنٹوں کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کا واضح مطلب یہ بھی ہے کہ اگر ان لوگوں نے مثبت کردار ادا کیا ہوتا تو نہ ان کو 'برے ناموں' سے یاد کیا جاتا اور نہ ہی یہ طالبان ان کے حلقہ اثر اور مشاورت کے عمل سے باہر نکلتے۔ آج جماعت اسلامی امریکہ کی سب سے بڑی مخالف سیاسی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن کل تک یہ جماعت سوویت یونین کے خلاف جنگ میں امریکہ کی حمایتی بن کر جہاد کے ثمرات اکٹھے کر رہی تھی۔ گویا یہ اسرائیل سمیت دیگر غیرمسلم قوتوں کی بھی ساتھی تھی۔ ان مذہبی

جماعتوں، ریاستی اداروں اور عالمی طاقتوں کے ساتھ پاکستان خصوصاً اس علاقے کی نسبتاً سیکولر اور قوم پرست قوتوں کا کردار بھی کچھ ایسا تسلی بخش اور مثبت نہیں رہا۔ نواز شریف اور بینظیر بھٹو جیسی قومی شخصیات بھی محض اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اسٹبلشمنٹ کی پالیسی کو ہی آگے بڑھاتی رہیں۔ انہوں نے مجاہدین اور طالبان کی جنگجو پالیسی کو ہی پروموٹ کیا بلکہ علاقائی سیاسی جماعتوں سے اتحاد کے باوجود قبائلی علاقوں میں بالغ رائے دہی کے تحت جمہوری عمل کو فروغ دینا نصیب نہیں ہوا۔ اس ضمن میں علاقائی سیاسی جماعتوں کی غفلت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے بھی جمہوری عمل کے اجراء کے لیے مذکورہ بڑی شخصیات اور جماعتوں پر دباؤ نہیں ڈالا۔ یہی وہ مجرمانہ غفلت ہے جو اس علاقے میں پسماندگی اور عدم استحکام کا باعث بنی۔

قوم پرست جماعتوں کی کچھ غلطیوں کی نشاندہی ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں لیکن افسوس کی بات تو یہ بھی ہے کہ قوم پرست قوتیں خصوصاً عوامی نیشنل پارٹی تمام تر تلخ تجربات کے باوجود اقتدار میں آنے میں تو کامیاب ہوگئی لیکن اس کا اس تناظر میں کوئی واضح وژن سامنے نہیں آیا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ممکنہ صورتحال کا صحیح ادراک ہی کیا اور نہ ہی انتہاپسندی کے گہرے اثرات کا تجزیہ کیا بعد کے ردعمل اور بوکھلاہٹ میں کیے جانے والے سوات معاہدے سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس نے نہ تو انتہاپسندی کی زمین کے اندر پھیل جانے والی جڑوں کا تجزیہ کیا اور نہ ہی ان کو ختم کرنے کے لیے کوئی ہوم ورک کیا تھا حالانکہ یہ بات واضح ہو چکی تھی 2008ء کے انتخابات میں نہ صرف وہ کامیاب ہوگی بلکہ اسے ہی یہ ذمہ داری سونپی جائے گی اس کے باوجود جب وہ اقتدار میں آ گئی اور اس کو انتہاپسندوں کے بدترین تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑا تو اس کے باوجود وہ انتہاپسندی کے خلاف واضح پالیسی اختیار کرنے سے گریزاں ہی دکھائی دی جس کی ایک مثال تو یوں بھی دی جا سکتی ہے کہ پارٹی اجلاسوں میں قیادت سوات آپریشن کے بارے یہ موقف اختیار کرتی رہی کہ اس نے فوجی قیادت سے اس آپریشن کے غیر موثر اور غیر فعال ہونے کی کئی بار شکایت کی ہے لیکن ان کی شکایات پر توجہ نہیں دی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر فوجی اور مرکزی سیاسی قیادت اس اہم ترین ایشو اور سوات میں ہونے والے نقصانات پر اپنی اس اتحادی جماعت سے تعاون نہیں

کر رہی تھی تو عوامی نیشنل پارٹی نے اس پر باقاعدہ احتجاج کیوں نہیں کیا اور صوبائی حکومت کے ساتھ کیوں چمٹی رہی؟ ایک ایسے پرتشدد ماحول میں جب وہ اپنے کارکنوں حتیٰ کہ لیڈرشپ کے لیے بھی تحفظ فراہم کرنے سے قاصر تھی وہ محض دھمکیوں تک ہی کیوں محدود رہی۔ لیکن افسوس تو اس بات کا بھی ہے کہ اس نے یہ دھمکی پہلی دفعہ تو صوبائی وزارتوں میں ردوبدل کے معاملے پر اور دوسری دفعہ سوات میں نظام عدل کی منظوری پر صدر کی طرف سے دستخط نہ کرنے پر مستعفی ہونے کی دھمکی دی تھی حالانکہ حالات تو دیگر اہم ایشوز پر سخت اور واضح مؤقف اختیار کرنے کا تقاضا کر رہے تھے جن کے باعث پوری پشتون بیلٹ آگ اور بارود کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔

اس پس منظر میں ایک اور نقطۂ نظر کی یہ سچائی بھی ہے کہ اے این پی کی حکومت سے علیحدگی نہ صرف اس جماعت کو مزید غیر محفوظ بنا دیتی جس کی پہلے اور دوسرے درجے کی قیادت کے ساتھ مقامی مؤثر کارکن ہٹ لسٹ پر آ چکے تھے اور انتہاپسند انہیں انتقام کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ مزید یہ کہ پختون روایات کے تحت انتقام اور بھی لازم ہو جاتا۔ تو دوسری طرف زیادہ اہم بات یہ بھی ہے کہ اگر اے این پی حکومت سے علیحدہ ہو جاتی تو اس کو ترقی پسند اور قوم پرست قوتوں کی واضح شکست سے تعبیر کیا جاتا جس کے بعد کوئی سیکولر سیاسی قوت مقابلے کی اس فضا میں سیاسی میدان میں اترنے کے لیے تیار نہیں ہوتی......یہی وہ پس منظر ہے جس میں اے این پی اقتدار سے علیحدہ ہونے کے لیے تیار نہیں لیکن نظام عدل پر دستخط نہ ہونے کی ذمہ داری بھی جناب صدر زرداری پر ڈال کر خود کو بھی بری الذمہ بناتی رہی اور انتہاپسندوں کی ڈائرکشن بھی تبدیل کرتی رہی یعنی وہ تو نظام عدل کی حامی ہے اور اس نے یہ لاگو بھی کر دیا ہے لیکن پیپلز پارٹی ایسا نہیں چاہتی یہی وجہ ہے کہ اب پیپلز پارٹی کے انتہاپسندوں کی زد میں آنے کا خطرہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ سوال دلچسپی سے خالی نہیں کہ......اے این پی کی قیادت نواز شریف اور زرداری کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات پر ملاقاتیں بھی کرتی ہے، مذاکرات کا حصہ بھی بنتی ہے لیکن وہ صدر زرداری کو نظام عدل پر دستخط کرنے پر آمادہ نہیں کر پاتی؟ حقیقت یہ ہے کہ اسے بھی پاکستان کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پوزیشن کا

بخوبی اندازہ ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر یہ دستخط ہو گئے تو پھر پاکستان کے لیے عالمی تناظر میں کس قسم کی مشکلات درپیش ہو سکتی ہیں اس لیے وہ بھی [illegible] مسئلے کو ایک وقت تک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی رہی ہے۔

DEMARCATION OF A BUFFER STATE

AFGHANISTAN· A-B Boundary settled by Anglo-Russian Boundary Commission 1886-87. B-C: Oxus boundary evolved in principle by Anglo-Russian Diplomacy. 1869-73 C-D: Pamirs boundary defined by Anglo-Russian Boundary Commission, 1895. E-F: Durand Line 1893 (1) Sino-Afghan border defined by treaty, 1963: (2) Bajour District where the Durand Line was still undefined in 1947

NOTE:

- A-B Khamiab to Zulfiqar : Ridgeway-Kuhlberg Commission
- B-C Thalweg of River Oxus: Clarendon-Gortcharkov and Granville-Gortchakov diplomatic interaction
- C-D Wakhan Corridor. Gerad-Schveikovski
- E-F Koh-i-Malik Siah to tip of Wakhan: Durand Commission
- E-G Seistan: Perso-Afghan Border Demarcation (1904)
- G-A Herat: Perso-Afghan Border Commission (1891)

باب 7

فاٹا کی پسماندگی... عسکریت پسندی کا بنیادی سبب

یوں تو دنیا کے کئی ممالک میں مختلف مسلح تحریکیں برسرپیکار ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس وقت ایک درجن سے زائد تحریکیں اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں لیکن وہاں ایک مضبوط پارلیمانی نظام اور جمہوری ادارے مضبوط ہیں اس لیے یہ تحریکیں اس نظام کے نیچے دبی ہوئی ہیں لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تحریکوں کو مقامی اور معاشرتی سطح پر موجود محرومیوں سے ہی توانائی اور تعاون حاصل ہوتا ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کے قبائلی علاقے، طالبان، القاعدہ، کشمیری گروپوں اور دیگر عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں، ٹریننگ سنٹرز اور ریکروٹنگ کے اہم مرکز بن چکے ہیں اور یہی وہ علاقے ہیں جہاں سے طالبان نے باہر بھی نکلنا شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے عالمی برادری، میڈیا اور اہل فکر و دانش تشویش کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن اگر ان علاقوں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی ضرورتوں میں مجبوریوں اور محرومیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بہت سارے حقائق بھی سامنے آ سکتے ہیں جن کا تجزیہ و تحقیق بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

فاٹا کو محض سیاسی اور جمہوری عمل پر پابندی، سیاسی جماعتوں کو کام نہ کرنے دینا۔ ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف عسکری تنظیموں کی آزادانہ نقل و حرکت۔ تربیتی کیمپوں کی موجودگی، بفرزون کے سٹیٹس، افغانستان کی غیر معمولی دلچسپی اور محفوظ علاقائی اہمیت نے ہی عسکریت پسندوں کے لیے سازگار نہیں بنایا اس علاقے کی پسماندگی عوام کی بے بسی اور

حکمرانوں کے رویے نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس علاقے کو تعلیم ترقی اور خوشحالی کے قومی دھارے میں بھی کبھی شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک ہی کیا گیا جس کے باعث وہ مجموعی عوامی رویے بھی سامنے آئے جو کسی بھی تحریک کے لیے معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ زیرِ نظر باب میں ہم فاٹا کی محرومیوں کے مختلف پہلوؤں کا اعداد و شمار کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔

سات ایجنسیوں پر مشتمل فاٹا کا کل رقبہ 2,72,220 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کی آبادی اندازاً ساڑھے چار ملین بتائی جارہی ہے۔ سب سے پہلی ایجنسی انگریز دور میں خیبر قائم ہوئی جبکہ آخر میں 1973ء میں ملاکنڈ ایجنسی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ملاکنڈ کے علاوہ باقی چھ ایجنسیوں کی سرحدیں دونوں اطراف سے صوبہ سرحد کے بندوبستی علاقوں اور افغانستان کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جس میں ایک معاہدے کے تحت (غالباً گندمک معاہدہ) افغانستان اور پاکستان دونوں ممالک عمل دخل رکھ سکتے ہیں۔ اسی فارمولے کے تحت افغانستان میں ان علاقوں کے لیے الگ وزارت قائم رکھی گئی اور افغانستان کے تعلیمی اداروں کے علاوہ ملازمتوں میں بھی قبائل کے لیے کوٹے رکھے گئے۔ بعض قبائلی عمائدین ابتداء سے لے کر (بلکہ احمد شاہ ابدالی کے دور سے) حامد کرزئی کے دورِ حکومت تک وزارتوں سمیت اہم عہدوں پر فائز رہے۔ (اب بھی متعدد قبائلی وہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں) قبائل نے مقامی جرگوں کے فیصلے کے مطابق 1947ء میں پاکستان کے ساتھ مشروط الحاق کیا تاہم قیامِ پاکستان سے اب تک اس علاقے کو دیگر صوبوں کی طرح جمہوری، سیاسی اور انتظامی حقوق نہیں دیئے گئے۔

فاٹا میں تعلیمی صورتحال

ورلڈ بینک کے ایک سروے کے مطابق فاٹا تعلیم کے شعبے میں پاکستان کا پسماندہ ترین علاقہ ہے۔ تعلیم کی شرح 16.10 فیصد بتائی جاتی ہے۔ مردوں میں یہ شرح 28.60 فیصد جبکہ خواتین میں 2.10 فیصد ہے۔ (یہ اعداد و شمار طالبانائزیشن سے پہلے کے ہیں۔)

تعلیمی اداروں کی حالت یہ ہے کہ پاکستان تو ایک طرف صوبہ سرحد کے ساتھ بھی اس کے موازنے کا تصور ناممکن ہے۔ مثلاً:

صوبہ سرحد میں پرائمری سکولوں کی تعداد	22668
فاٹا میں پرائمری سکولوں کی تعداد	3779
سرحد میں کالجوں کی تعداد	128
فاٹا میں کالجوں کی تعداد	18
سرحد میں یونیورسٹیوں کی تعداد	15
فاٹا میں یونیورسٹیوں کی تعداد	ایک بھی نہیں

پورے فاٹا میں خواتین کے لیے صرف تین کالجز قائم کیے گئے ہیں جبکہ یہ کالجز بھی طالبان کی سرگرمیوں کے باعث غیر فعال ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس افغان جہاد کے دوران پاکستان نے امریکہ اور دوسرے روس مخالف ممالک کی امداد سے افغانستان سے آئے ہوئے 20 لاکھ مہاجرین کی بچیوں اور بچوں کے لیے جو تعلیمی ادارے قائم کیے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

1983-84ء میں فاٹا اور صوبہ سرحد میں مہاجرین

کے لیے قائم کیے گئے سکولوں کی تعداد	495
لڑکیوں کے سکولوں کی تعداد	110

اس عرصہ کے دوران ملک کے دوسرے علاقوں میں مہاجر سٹوڈنٹس کے لیے بھی سیٹیں مختص کی گئیں۔

میڈیکل کالجز میں سیٹوں کی تعداد	56
انجینئرنگ کالجز میں سیٹوں کی تعداد	38
اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں سیٹوں کی تعداد	78
عام سرکاری کالجوں میں سیٹوں کی تعداد	150
عام سرکاری سکولوں میں سیٹوں کی تعداد	340

1984ء سے لے کر 1990ء تک امریکہ، پاکستان اور دیگر ممالک نے مہاجرین کے 142 دینی مدارس اور تربیتی کیمپوں کے لیے ایک محتاط اندازے کے مطابق 6.4 بلین ڈالر خرچ کیے صوبہ سرحد کے محکمہ اوقاف سے بھی ان کی تعلیم کے لیے 16 ملین روپے حاصل کیے گئے۔

وفاقی بجٹ میں فاٹا کے لیے مختص حصہ

وفاقی بجٹ میں فاٹا کے لیے کبھی بھی 3 فیصد سے زیادہ کا بجٹ نہیں رکھا گیا۔ سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی کہ این ایف سی ایوارڈ میں فاٹا کو سرے سے شامل ہی نہیں کیا گیا۔

فاٹا کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی رہی اس کا اندازہ 98-1997ء کے وفاقی بجٹ سے لگایا جاسکتا ہے۔

آزاد کشمیر کے لیے رکھی گئی رقم	1900 ملین روپے
شمالی علاقہ جات کے لیے	800 ملین روپے
فاٹا کے لیے رکھی گئی رقم	770 ملین روپے

صدر پاکستان آصف علی زرداری نے 8 فروری 2009ء کو پشاور میں فاٹا کا بجٹ 8 ارب سے بڑھا کر 11 ارب کرنے کا اعلان کیا حالانکہ سال 9-2008ء کے لیے صوبہ سرحد کا بجٹ لگ بھگ ایک کھرب رکھا گیا تھا۔ اسی تناسب سے آبادی کا موازنہ کیا جائے تو غیر معمولی فرق سامنے آجاتا ہے۔

فاٹا میں روزگار کے مواقع

مصدقہ اعداد وشمار کے مطابق سرکاری اداروں میں ملازمتوں کا تناسب 2.3 فیصد ہے۔ 60 سے 70 فیصد تک کی عام آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ عام آدمی کی شرح آمدن صوبہ سرحد سے 30 فیصد کم جبکہ پاکستان سے 50 سے 60 فیصد تک کم ہے۔ 40 فیصد آبادی سرحد، پنجاب، سندھ اور باہر کے ممالک میں روزگار پر مجبور ہے۔ بے روزگاری کی شرح سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 60 سے 65 فیصد تک ہے۔ فاٹا میں قابل کاشت اراضی صرف 0.2 فیصد ہے۔ انڈسٹری کی شرح 0.1 ہے جبکہ محض 0.3 فیصد حصے پر جنگلات پائے جاتے ہیں۔

ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق 40 فیصد قبائلی بجلی کی سہولت 48 فیصد، صاف پانی جبکہ 45 فیصد صحت کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں جبکہ ایک اور رپورٹ کے مطابق فاٹا میں فاٹا اور ایف سی آرز میں 50 سے زائد مقامات پر 22360 ملین روپے کی لاگت سے چھوٹے

ڈیم بنائے جا سکتے ہیں جبکہ 18 ایسی معدنیات اس علاقے میں پائی جاتی ہیں جن کو دریافت کر کے کھربوں کا زرمبادلہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بینکنگ کا کوئی سسٹم موجود نہیں جبکہ ٹیکس کا نظام بھی نہیں ہے۔

فاٹا میں صحت کی صورتحال

ایک مصدقہ رپورٹ کے مطابق 8189 مریضوں کے لیے ایک ڈاکٹر دستیاب ہے۔ پاکستان میں یہ شرح 3646 ہے۔ 2006ء میں پورے فاٹا میں ڈاکٹروں کی تعداد 424 تھی۔ پورے فاٹا میں صرف 4 ہسپتال ایسے ہیں جن میں سرجری کی سہولتیں موجود تھیں۔ خواتین کی زچگی کے دوران اموات کی سب سے بڑی شرح بھی فاٹا میں ہے کیونکہ ہسپتال یا تو ہیں نہیں یا جو ہیں بھی ان میں سہولتوں کا فقدان ہے۔ (یونیسیف رپورٹ)۔ فاٹا میں خواتین ڈاکٹروں اور نرسوں کی شرح پاکستان کے کسی بھی علاقے کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔

فاٹا میں انتظامی اور عدالتی نظام

اتنی بڑی اور اہم آبادی کو 1872ء کو انگریز کے عجیب وغریب متعارف کردہ نظام ایف سی آر کے تحت آج بھی چلایا جارہا ہے۔ اس نظام میں 1901ء کو نئی ترامیم کی گئیں۔ یہ وہی سال تھا جب صوبہ سرحد کے نام سے الگ صوبہ قائم کیا گیا۔ پولیٹیکل انتظامیہ کے پاس انتظامی اور عدالتی دونوں اختیارات ہوتے ہیں۔ ایف سی آر کے کسی فیصلے کو ہائیکورٹ یا سپریم کورٹ میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ ایک رپورٹ کے مطابق پولیٹیکل حکام نے پشاور ہائی کورٹ کے تقریباً 42 نوٹسز کا جواب ہی نہیں دیا جن میں سائلین نے ایف سی آر کو چیلنج کیا تھا۔ انسانی حقوق کمیشن کے ایک سروے کے مطابق صوبہ سرحد کی مختلف جیلوں میں ایف سی آر کے تحت 600 سے زائد قبائلی قید ہیں ان میں 110 بچے اور بچیاں بھی ہیں جن کو ان کے والدین یا رشتہ داروں کے جرائم کی پاداش میں ایف سی آر کے تحت جیلوں میں رکھا گیا ہے۔

فاٹا کے عوام کی ملکی سیاسی نظام میں نمائندگی

قبائلی عوام صوبائی اسمبلی اور بلدیاتی نظام میں نمائندگی سے ابھی تک محروم ہیں۔ 1947ء سے لے کر 1954ء تک پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں قبائلیوں کے لیے محض ایک

FATA
AT A GLANCE

- **Area:** 27220 (sq km)
- **Population:** 3.176 million
- **Density:** 117 persons per sq. km
- **Annual growth rate:** 2.19
- **Literacy rate both sexes:** 17.42%
- **Male:** 29.517
- **Female:** 3.00
- **Administrative set-up:** Seven Agencies and Six Frontier Regions
- **Important Passes:** Khyber, Nawa, Peiwar Kotal, Tochi and Gomal
- **Important Rivers:** Bara, Kurram , Gomal, Tochi and Taki Zam
- **Mountain Ranges:** Off shoots of Hindu Kush and Sulaiman with a chain of Koh Sufaid
- **Highest peak:** 15620 feet high Sikka Ram or Said Karam in Kurram Agency

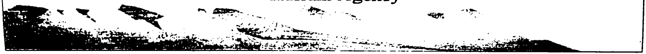

سیٹ مختص تھی۔ 1973ء کے آئین میں ان کی تعداد 8 کردی گئی تاہم ممبران کی نامزدگی کا اختیار لاکھوں عوام کی بجائے حکومت کے مراعات یافتہ 3700 ملکان کے ہاتھوں میں تھا۔ 1997ء میں ان سیٹوں کی تعداد 12 کردی گئی اور عوام کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لینے کا حق بھی دیا گیا۔ عوام کی دلچسپی کا جمہوریت کے لیے اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 12 نشستوں کے لیے 299 امیدوار میدان میں اتر آئے۔ مجموعی ٹرن آؤٹ 35 اور 48 فیصد کے درمیان رہا جبکہ باجوڑ ایجنسی میں ملکی تاریخ کا سب سے بڑا ٹرن آؤٹ یعنی 63 فیصد سامنے آیا۔ متعدد علاقوں میں خواتین نے بھی ووٹ ڈالے۔ فاٹا پاکستان کا وہ واحد علاقہ ہے جہاں پر پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ نافذ نہیں ہے۔ کوئی سیاسی پارٹی سیاسی سرگرمیوں کو جاری نہیں رکھ سکتی۔ اس کے برعکس مذہبی قوتوں اور عسکری تنظیموں کو کھلے عام سرگرمیوں کی اجازت حاصل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 1980ء کے بعد 1990ء تک کے 10 سالوں میں فاٹا میں تقریباً 400 مدارس قائم کیے گئے جنہوں نے انتہاپسندی اور عسکریت پسندی میں مرکزی کردار ادا کیا۔

فاٹا میں ایک منصوبے کے تحت ان مہاجرین اور غیرملکیوں کو بڑی تعداد میں بسایا گیا جو کہ افغان جہاد میں براہ راست حصہ لیتے رہے تھے۔ کرم ایجنسی میں رجسٹرڈ مہاجرین کی تعداد 40 ہزار تھی۔ جنوبی وزیرستان میں ان کی تعداد 84474 تھی جبکہ شمالی وزیرستان میں رجسٹرڈ تعداد 189235 تھی۔ دوسری ایجنسیوں میں بھی ان مہاجرین کو سرکاری سرپرستی میں بسایا گیا۔

کچھ عرصہ قبل تک فاٹا میں امن وامان کی حالت انتہائی بہتر اور ناقابل یقین تھی اس امر کا اندازہ ان اعداد وشمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

2006ء کے دوران صرف پشاور میں 840 افراد کو قتل کیا گیا جبکہ پورے فاٹا میں قتل ہونے والوں کی تعداد صرف 78 تھی۔ فاٹا میں قتل ہونے والوں کی تعداد پشاور کے ایک پولیس تھانے چمکنی سے کم تھی جہاں پر 2006ء کے دوران 85 افراد کے قتل کے مقدمات درج ہوئے۔ تاہم 2000ء کے بعد انتہاپسندی کی ایسی لہر چل نکلی کہ 2003ء سے لے کر 2008ء تک صرف جنوبی اور شمالی وزیرستان میں جرگوں، حجروں اور فیصلوں کی حامل 120 اہم سماجی اور سیاسی شخصیات کو انتہاپسندوں نے بے دردی سے ہلاک کردیا۔ محتاط اندازے کے مطابق اس عرصہ

کے دوران 10 ہزار سے زیادہ عام شہریوں کو طالبان اور فورسز نے ہلاک کردیا اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

مذکورہ بالا چند مثالوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ پاکستانی حکومتوں نے قبائلی عوام کو کبھی پہلے درجے کے شہریوں کا مقام نہیں دیا۔ ان کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی ان کے لیے ملک کے دوسرے شہریوں کی طرح بنیادی ادارے قائم کیے جبکہ اس کے برعکس ان سے جرگہ سمیت وہ دوسرے روایتی پلیٹ فارم بھی عسکریت پسندوں کے ذریعے چھین لیے گئے جن کے ذریعے وہ اپنے انداز میں اپنے قومی اور قبائلی معاملات نمٹاتے آرہے تھے۔

طالبان نے قبائلی علاقوں کو اپنے مراکز میں تبدیل کیا تو انہوں نے افغانستان کے طالبان کا فارمولہ اپناتے ہوئے جرگہ نظام کو تہس نہس کردیا۔ جو معززین علاقے کے عوام کو کسی ایشو پر اکٹھا کرسکتے تھے ان کو ایک ایک کرکے راستے سے ہٹادیا یا علاقہ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق صرف وزیرستان کی دو ایجنسیوں میں 2002ء سے لے کر اب تک 102 معتبر اور بااثر قبائلی مشران کو ہلاک کیا جاچکا ہے۔ طالبان کی اس پالیسی کا مقصد جرگے کے ذریعے کسی بھی متوقع مخالفانہ آواز یا اقدام کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالبان قبائلی علاقوں میں جو کچھ کرتے گئے ان کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہیں رہا اور یوں پورا خطہ طالبان کے آگے سرنگوں ہوگیا۔

یہ طریقہ کار ایک اور انداز میں سوات میں محاذ آرائی کے دوران کھل کر سامنے آگیا۔ معروف کالم نویس نذیر ناجی نے یکم اپریل 2009ء کو اپنے کالم سویرے سویرے میں اگرچہ لاہور کے پولیس ٹریننگ سنٹر پر حملہ کے تناظر میں دہشت گردی کے واقعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن اس پورے تناظر کو بھی سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ جس میں طالبان کا غلبے کا یہ طریقہ سامنے آتا ہے۔ لیکن اب معروضی صورتحال میں جب پر تشدد کارروائیاں ان علاقوں سے باہر نکل کر صوبہ سرحد اور پنجاب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں تو دہشت گردوں کی منصوبہ بندی کے خدوخال کافی حد تک واضح ہوچکے ہیں۔ فاٹا میں سب سے پہلے امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ دار سکیورٹی فورسز کو ہدف بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد پیرا ملٹری فورسز کو نشانہ بنایا گیا۔ جب

انتظامیہ کا ہر مسلح بازو ناکارہ ہوگیا تو سول ملازمین غیر محفوظ ہو کر نکل آئے اور اس طرح قبضہ مکمل ہوگیا۔ سوات کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ مولوی فضل اللہ، محسود گروپ کی توسیع ہے۔ اس نے بھی سوات میں سب سے پہلے پولیس فورس کو ہدف بنایا تھا اور خوف و ہراس کی ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ سوات میں پولیس فورس کی کل آٹھ سو کی نفری میں سے ساڑھے چھ سو افسر اور جوان فرار ہونے پر مجبور ہوگئے کیونکہ جدید ترین اسلحہ سے لیس دہشت گردوں کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ پولیس کے بعد فوج کو بھیجا گیا لیکن اعلیٰ تربیت یافتہ دہشت گردوں نے مہارت سے گوریلا کارروائیاں کیں اور پھر اپنے سیاسی بازو صوفی محمد کے ذریعے بالادستی کی پوزیشن سے سودے بازی کی اور جو معاہدہ کیا گیا اس میں ساری شرائط سکیورٹی فورسز کے لیے ہیں جبکہ مولوی فضل اللہ نے کسی قسم کی پابندی قبول نہیں کی۔ حد یہ ہے کہ سکیورٹی فورسز کو نقل و حرکت کے لیے ملا فضل اللہ سے اجازت نامہ لینے کی ضرورت ہے۔ وہ صرف ان دستوں کو نقل و حرکت کی اجازت دیتا ہے جن کے ساتھ اس کا ایک نمائندہ موجود ہوتا ہے۔

ابتدائی کامیابیوں کے بعد اب دہشت گرد صوبہ سرحد کے بندوبستی علاقوں میں اپنی جڑیں پھیلا رہے ہیں۔ یہاں بھی ان کا پہلا ہدف پولیس فورس رہی ہے۔ اس اجمالی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ دہشت گرد جس علاقے کی طرف بھی جاتے ہیں سب سے پہلے ان فورسز کو نشانہ بناتے ہیں جو مسلح ہوتی ہیں اور ان کی کارروائیوں کو طاقت سے روک سکتی ہیں۔ پولیس کے بعد وہ پیراملٹری فورسز اور باقاعدہ فوج کے ساتھ مقابلے کی حکمت عملی تیار کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ امریکہ سے اسلحہ اور پیسہ لے کر دہشت گردوں کو فاٹا میں تربیت دی گئی۔ انہیں افغانستان کے اندر میدان جنگ میں عملی تربیت کے مواقع فراہم کیے گئے۔ ابتدائی طور پر ان کی کمان ہمارے فوجی افسروں کے سپرد ہوتی تھی سوویت افواج کے خلاف کارروائیوں کی طویل تربیت حاصل کر کے یہ نام نہاد مجاہدین ایک منظم طاقت میں بدل گئے۔ افغانستان پر طالبان کے قبضے تک باہمی جنگیں لڑتے رہے۔ طالبان کے قبضے کے بعد بھی شمالی اتحاد سے برسرپیکار رہے اور افغانستان پر عالمی کولیشن کا قبضہ ہونے کے بعد یہ امریکی اور یورپی فوجوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ پاک فوج کے ایکشن کا سٹائل اور انداز وہی

ہے جو برطانوی اور امریکی فوجوں کا ہوتا ہے۔ ہماری فوج کی تربیت برطانوی طرز پر کی گئی ہے اور اسلحہ امریکی ساخت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دہشت گردوں کو پاک فوج سے لڑنے کے لیے جس تربیت کی ضرورت تھی وہ انہیں امریکی فوج کے خلاف طویل عملی تجربے کے دوران حاصل ہو چکی ہے۔ وہ چاہیں تو اس وقت بھی پورے پاکستان میں کارروائیاں کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

Training of the Afghan Refugees Youth.

افغانستان کے سکولوں کے چند مناظر۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب 8

طالبان بمقابلہ اے این پی

قوم پرست اے این پی اور مذہبی قوتیں صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں نظریاتی تصادم کے باعث ہمیشہ سے ایک دوسرے کے خلاف رہی ہیں۔ اے این پی افغانستان کے روشن خیال اور قوم پرست حکمرانوں کے قریب رہی جبکہ مذہبی جماعتیں اور عسکری قوتیں اخوان المسلمین، حزب اسلامی اور طالبان تک کے عام ادوار کے دوران جہادی فلسفے کی حامی رہی ہیں اور یہی وہ بنیادی ایشو ہے جس نے ان قوتوں کو افغانستان کے بعد فاٹا اور اب صوبہ سرحد میں ایک دوسرے کے سامنے لاکر کھڑا کیا ہے۔ صوبہ سرحد کی سیاست پر افغان معاملات براہ راست اثر انداز ہوتے آئے ہیں جس کے باعث صوبہ سرحد اور فاٹا کی کوئی بھی سیاسی قوت ایشوز اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتی۔ نائن الیون کے بعد جب افغانستان پر امریکہ اور اتحادیوں کے حملے کا خدشہ یقین میں تبدیل ہوگیا تو پارٹی کے ریٹائرڈ رہبر تحریک مرحوم خان عبدالولی خان کو علالت اور گوشہ نشینی کی حالت میں باچا خان مرکز پشاور لاکر ان سے طالبان اور القاعدہ کے خلاف ایک مفصل پریس کانفرنس کروائی گئی۔ ولی خان نے القاعدہ اور طالبان کی کھل کر مخالفت کرتے ہوئے مؤقف اپنایا کہ اگر طالبان حکمرانوں نے اسامہ بن لادن کو افغانستان سے باہر نہیں نکالا تو امریکہ کو افغانستان پر حملے اور قبضے کا جواز مل جائے گا اور یوں پورا خطہ بدامنی اور عدم استحکام کا شکار ہوجائے گا۔

خان عبدالولی خان کی اس پریس کانفرنس کے بعد ہی طالبان اور القاعدہ لیڈر اے

این پی کے خلاف کھل کر سامنے آگئے تو طالبان کے دوسرے حامی گروپوں نے بھی اے این پی کو ٹارگٹ بنانا شروع کر دیا۔ 2002ء کے الیکشن میں اے این پی کی شکست کی دوسری وجوہات کے علاوہ سب سے بڑی وجہ ولی خان کی یہی پریس کانفرنس تھی جوانہوں نے امریکی حملے سے قبل کی تھی۔ ایم ایم اے کے لیڈروں اور امیدواروں نے الیکشن مہم کے دوران ولی خان کی اس پریس کانفرنس کو بڑی کامیابی سے اپنے حق میں استعمال کر کے اے این پی کو اسلام دشمنوں کی صف میں کھڑا کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگوں کے علاوہ اے این پی سے ہمدردی رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی 2002ء کے الیکشن میں اے این پی کے بجائے امریکہ دشمنی میں ایم ایم اے کو ووٹ ڈال دیئے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ 2002ء کے الیکشن میں وزیرستان اور بعض دوسری ایجنسیوں میں برسرپیکار طالبان گروپوں نے ایم ایم اے کے امیدواران قومی اسمبلی کا ڈٹ کر ساتھ دیا اور بعد کے سالوں میں بھی فریقین ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ دوسری طرف روشن خیال قبائلی مشران کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی پالیسی اپنائی گئی اور یہ پالیسی عین طالبان کی افغانستان والی اس پالیسی کے مطابق تھی جس کے ذریعے قبائلی اور سیاسی مشران کو راستے سے ہٹایا جانا تھا۔

افغانستان پر امریکی حملے اور قبضے کے بعد امریکی حملہ آوروں کے اے این پی کے قائدین کے ساتھ براہ راست رابطے قائم ہوئے تو مقامی اور غیر مقامی طالبان کو اے این پی کی یہ پالیسی قطعاً پسند نہیں آئی۔ انہوں نے پس منظر اور حقائق کو مدنظر رکھ کر سمجھا کہ اے این پی کو امریکہ سپورٹ کرنا چاہتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وقت آنے پر فاٹا اور صوبہ سرحد میں مذہبی اور عسکری قوتوں کو اے این پی ہی کے ذریعے کمزور کیا جائے۔ ان قوتوں کا یہ موقف اور اندازہ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ اے این پی کا دہشت گردی، افغانستان اور دوسرے خارجہ معاملات پر موقف بڑی حد تک واضح تھا اور یہ موقف بعض عسکری اور مذہبی قوتوں کی مخالفت پر مبنی تھا۔

کابل میں حامد کرزئی حکمران بنائے گئے تو اے این پی کے قائدین خصوصاً اسفند یار ولی خان اور افراسیاب خٹک نے متعدد بار کابل کے دورے کیے۔ ان کو وہاں ریاستی

مہمانوں کی طرح گارڈ آف آنر کے ساتھ مکمل پروٹوکول دیا گیا۔ 2007ء کے آخر میں اسفند یار ولی خان اور بیگم نسیم ولی خان ایک اعلیٰ سطحی وفد کے ہمراہ جلال آباد میں مرحوم باچا خان کے مزار اور کمپلکس کا افتتاح کرنے گئے تو حامد کرزئی اور متعدد گورنر، وزراء بھی کابل سے جلال آباد آ گئے جہاں پر ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا اور ان شخصیات نے کھل کر طالبان اور القاعدہ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اسی روز اسفند یار ولی خان اور افراسیاب خٹک کو حامد کرزئی کے خصوصی طیارے میں کابل لے جایا گیا جہاں انہوں نے ایک ہفتہ تک قیام کیا۔ اس دوران ان کی امریکیوں اور دوسرے یورپی حکام کے ساتھ ملاقاتیں کرائی گئیں۔ اس تمام تر رابطے اور قربت کو طالبان اور ان کے حامی پاکستانی گروپس بہت سنجیدگی سے مانیٹر کر رہے تھے۔

فریقین کے درمیان غیر علانیہ اختلاف اس وقت دشمنی میں تبدیل ہوگیا جب افراسیاب خٹک اور اسفند یار ولی خان امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی دعوت پر امریکہ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے اعلیٰ امریکی حکام سے افغانستان اور نانا کے بارے میں تفصیلی تبادلہ خیال کیا اور اس بات پر اتفاق رائے کا اظہار کیا کہ طالبان اور القاعدہ کے خلاف مشترکہ سیاسی حکمت عملی اپنائی جائے گی۔ اے این پی مخالف قوتوں نے اس دورے کو بہت اچھالا اور یہ الزام بھی لگایا کہ اے این پی اپنی خدمات کے عوض بڑی رقم کا پیکیج بھی طے کر چکی ہے۔ اے این پی نے اس دورے سے انکار کر کے اپنے بارے میں متعدد دوسرے خدشات کا راستہ بھی ہموار کیا حالانکہ بعد ازاں یہ ثابت ہوگیا کہ دونوں لیڈر واقعی امریکہ گئے تھے وہاں انہوں نے ملاقاتیں بھی کیں اور کچھ وعدوں کے ساتھ یقین دہانیاں بھی کرائی تھیں۔

اے این پی پر امریکہ کے حق میں پالیسی بدلنے کا الزام نائن الیون کے بعد کھل کر اس وقت لگا جب ممتاز دانشور اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے سابق چیئرمین افراسیاب خٹک نے اے این پی میں شمولیت اختیار کی اور دیکھتے دیکھتے پارٹی میں اہم مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ افراسیاب خٹک پر دوسروں کے علاوہ اے این پی کے بعض اہم لیڈروں کی جانب سے بھی امریکہ نوازی کا الزام لگایا جاتا رہا۔ ان لیڈروں کا کہنا تھا کہ اسفند یار ولی خان کو کابل اور واشنگٹن لے جانے والے اور ان پراجیکٹس پر کام کرنے والے بھی افراسیاب خٹک ہی تھے۔ ان لیڈروں کا خیال تھا کہ خطے کے موجودہ حالات اور پشتونوں

کے اسلام پسندانہ رویوں کے ہوتے ہوئے امریکہ کی قربت پارٹی کے لیے فائدے کے بجائے نقصان کا سبب بنے گا۔ جو لیڈر افراسیاب پر پارٹی لیڈر اسفند یار ولی خان کو غلط مشورے دینے کا الزام لگانے میں سرفہرست تھے ان میں بلور برادران، سینئر لیڈر اجمل خٹک اور بیگم نسیم ولی خان جیسی شخصیات بھی شامل تھیں۔

اس تمام عرصے کے دوران افراسیاب خٹک وقتاً فوقتاً کابل کا دورہ کرتے رہے جس کا افغانستان کے طالبان نوٹس لیتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو چارسدہ میں مقامی طالبان کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم وہ بچ گئے اور 30 کے قریب دوسرے لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ اسی اجتماع میں اسفند یار ولی خان نے بھی شرکت کرنی تھی تاہم وہ نہ آ سکے ورنہ حملہ آوروں کا مقصد دونوں لیڈروں کو نشانہ بنانے کا تھا۔ بعدازاں اسفند یار ولی پر ان کے گھر میں خودکش حملہ کیا گیا۔

اس سے قبل وزیرستان، باجوڑ اور مہمند ایجنسیوں میں اے این پی کے بعض سینئر لیڈروں کو ہلاک کرنے کا سلسلہ چل نکلا تھا اس منصوبے کا مقصد اے این پی کو ریڈ سگنل دینا تھا کہ یہ پارٹی امریکہ اور کرزئی کی حمایت کی پالیسی ترک کردے۔ بدقسمتی سے اے این پی نے ان تمام ہلاکتوں پر اس طرح کا ردعمل نہیں دکھایا جس کی ضرورت تھی۔ اس صورتحال نے اس پارٹی کے کارکنوں، عہدیداروں اور رہنماؤں کو طالبان کے سامنے بے بس کر کے رکھ دیا۔ اس تمام عرصہ کے دوران اے این پی نے کھل کر کوئی پالیسی اپنانے کے بجائے مبہم اور غیر واضح رویہ اپنائے رکھنے کو ترجیح دی جس نے پارٹی کے بارے میں اس تاثر کو جنم دیا کہ یہ پارٹی امریکہ کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتی اور مقامی مفادات کو سامنے رکھ کر ان پاکستانی مقتدر قوتوں سے بھی اچھا تعلق رکھنا چاہتی ہے جو خطے میں جہاد کی درپردہ سرپرستی کرتی رہی ہیں۔ 2007ء کو اے این پی نے باچاخان مرکز میں افغانستان اور قبائل کے بارے میں ایک کامیاب جرگے کا انعقاد کیا جس میں تمام سیاسی، مذہبی قوتیں اور نمائندہ تنظیمیں شریک ہوئیں اس جرگے میں اسفند یار ولی خان اور پی ایم اے پی کے سربراہ محمود خان اچکزئی نے کھل کر عسکریت پسندوں کی مخالفت کرتے ہوئے واضح کیا کہ قوم پرست قبائلی اور صوبہ سرحد کو کسی صورت عسکریت پسندوں کے مراکز بننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس جرگے نے بھی طالبان اور ان کے

حامیوں کو واضح پیغام دیا کہ اے این پی اب کھل کر ان کے خلاف میدان میں نکل آئی ہے۔ اے این پی کی اس پالیسی کو امریکا نواز پالیسی کا نام دیا گیا حالانکہ یہ بات ریکارڈ پر تھی کہ یہ پارٹی افغانستان اور پاکستان میں غیر ملکی مداخلت کی شروع دن سے ہی مخالف رہی تھی یا کم از کم اس ایشو پر اس پارٹی کی پالیسی میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس تمام عرصہ کے دوران جے یو آئی (ف) اور جماعت اسلامی کے صوبائی اور مرکزی قائدین اے این پی پر مسلسل امریکہ نوازی کے مؤثر الزامات لگانے میں مصروف رہے۔ دوسری طرف اے این پی اپنے ایک واضح اور مستقل مؤقف کے ہوتے ہوئے بھی اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت سے محروم دکھائی دی جس نے اس پارٹی کو دفاعی پوزیشن پر لا کھڑا کیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اے این پی اس خطرے کے باوجود اپنے ہم خیال لوگوں خصوصاً دانشوروں جن کی ایک کثیر تعداد طالبان مخالف تھی کو ساتھ لینے میں ناکام رہی۔ جہادی میڈیا، تنظیمیں اور پارٹیاں پراپیگنڈہ کے مختلف ذرائع سے لیس ہو کر اس پارٹی کے خلاف میدان میں نکل آئی تھیں۔

پارٹی نے بعض مواقع پر دوغلی پالیسیاں بھی اختیار کر کے اپنی حیثیت کو مشکوک بنا دیا مثال کے طور پر اکتوبر 2006ء کو امریکہ نے باجوڑ کے ایک مدرسے پر حملہ کیا تو اسفند یار ولی خان بعض روشن خیال لیڈروں کی مخالفت کے باوجود ایک بڑا جلوس لے کر باجوڑ چلے گئے تاہم انہوں نے باجوڑ جانے سے قبل اسی روز درگئی (ملاکنڈ ایجنسی) میں رک کر اس فوجی گراؤنڈ میں فوجی جوانوں کے لیے فاتحہ بھی پڑھی جن پر انتہاپسندوں نے کچھ دن پہلے خودکش حملہ کیا تھا۔ اس پالیسی کے باعث یہ سوال اٹھایا گیا کہ اے این پی عوام کا ساتھ دے رہی ہے، امریکہ کی حمایت کر رہی ہے یا یہ کہ پاکستانی فوج کو معاونت فراہم کر رہی ہے کیونکہ عوام، امریکہ اور پاکستانی فوج کی بعض پالیسیاں ایک دوسرے کے مفادات کی ضد پر چل رہی تھیں اور کسی بھی سیاسی قوت خصوصاً اے این پی جیسی روشن خیال قوم پرست پارٹی کے لیے بیک وقت ان تینوں کو سپورٹ کرنا ممکن نہیں تھا۔ متعدد بار واضح ہوا کہ اے این پی پاکستان کی جہادی اسٹبلشمنٹ کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اس پارٹی نے الیکشن میں بھی جانا تھا اور دوسری طرف افغانستان اور امریکہ کے ساتھ بھی معاملات بگاڑنا نہیں چاہتی۔ اس کنفیوژن نے اس پارٹی کو عوامی سطح پر متعدد خدشات اور سوالات کی صورتحال سے دوچار کر کے رکھ دیا۔ کیونکہ ظاہری

انڈرسٹینڈنگ اور اتحاد کے باوجود پاکستان کی مخصوص ملٹری اسٹبلشمنٹ اور امریکیوں کی پالیسی میں درحقیقت دہشت گردی کے خلاف جنگ جیسے بنیادی ایشو پر ایک دوسرے کے متصادم پالیسیاں چل رہی تھیں۔

اے این پی کے بارے میں یہ تاثر بھی منفی اثرات چھوڑ گیا کہ افراسیاب خٹک اپنے ساتھ این جی اوز سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آئے تھے۔ ان لوگوں کو نہ صرف یہ کہ اہم عہدے دیئے گئے بلکہ ان میں سے اکثر کو 2008ء کے الیکشن میں اسمبلیوں تک پہنچایا گیا۔ یہ لوگ اے این پی کے روائتی سیاسی پس منظر کے برعکس جدید طرزفکر پر عمل پیرا ہونے کے باعث ان عناصر کے لیے بہت ناپسندیدہ اور قابل اعتراض ٹھہرے جو جہادی فلسفے کو ذہن میں رکھ کر این جی اوز سے وابستہ لوگوں کی مسلسل مخالفت کر رہے تھے۔ اس گروپ کی وفاداریاں بھی ایک منظم پروپیگنڈے کے ذریعے امریکی مفادات سے نتھی کر دی گئیں۔

دوسری طرف اے این پی محمود خان اچکزئی کی پارٹی پشتونخواہ میپ کے ساتھ قائم کیے گئے اتحاد پشتون ڈیموکریٹک الائنس کو بھی مؤثر بنانے میں ناکام رہی اور یہ اتحاد چند مہینوں کے بعد ماضی کے ناکام تجربات کے باوجود ایک بار پھر دم توڑ گیا حالانکہ موجودہ سیاسی تناظر اور حالات میں دونوں قوم پرست پارٹیوں کا اتحاد نہ صرف یہ کہ وقت کا تقاضا تھا بلکہ اس کے انتہائی مثبت نتائج بھی برآمد ہوسکتے تھے۔

2008ء کے الیکشن قریب آتے گئے تو پاکستانی اسٹبلشمنٹ اور اے این پی کے درمیان رابطے تیز ہوگئے کیونکہ پاکستانی اداروں کا ایک مخصوص گروپ چاہ رہا تھا کہ صوبہ سرحد میں اے این پی کو برسراقتدار لا کر جہاں مذہبی جماعتوں کو آؤٹ کیا جائے وہاں افغانستان اور بھارت کے ساتھ تعلقات کی بہتری کے لیے اے این پی کا سیاسی کارڈ بھی بوقت ضرورت زیراستعمال لایا جائے۔

دوسری طرف مشرف کے بعض حامی عناصر نے اے این پی پر واضح کر دیا کہ یہ پارٹی خارجہ امور کے معاملے پر نئی بننے والی مشرف کی متوقع اتحادی حکومت کے فیصلوں میں مداخلت سے گریز کرے گی اور صرف صوبہ سرحد کے معاملات سے دلچسپی رکھ کر صوبائی حکومت

کا لطف اٹھائے گی چنانچہ اے این پی اقتدار میں آنے سے قبل ہی اس پالیسی پر آمادہ ہوگئی تاہم یہ پارٹی یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہی کہ قبائلی ایجنسیوں سے ملحقہ صوبہ سرحد میں اس وقت تک حکومت کرنا ممکن نہیں ہوگا جب تک قبائلی علاقوں میں امن نہیں ہوتا جبکہ اصل صورتحال تو یہ تھی کہ ملحقہ قبائلی علاقے نہ صرف شورش کی زد میں تھے جس پر براہ راست امریکی حملے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ اے این پی یہ اندازہ لگانے میں بھی ناکام رہی کہ اسی پاکستانی اسٹبلشمنٹ کا ایک گروپ محض اے این پی کو اس مقصد کے لیے حکومت میں لانے کی منصوبہ بندی کر چکا تھا کہ اس پارٹی کو صوبائی حکومت دے کر اس کو عسکریت پسندوں کے آگے جھکنے پر مجبور کیا جائے اور دوسرا مقصد یہ پورا کیا جائے کہ حکومت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈال کر اس پارٹی کو دوست ممالک افغانستان اور بھارت سے دور کیا جا سکے۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ حیدر خان ہوتی نے ایک ایسے وقت میں اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا جبکہ صوبہ سرحد شورش، بغاوتوں، سازشوں اور دوسری مشکلات کی زد میں تھا۔

حیدر ہوتی ایک سیاسی خاندان کے وارث ہونے کے باعث چند ہی ہفتوں میں ایک باصلاحیت اور پراعتماد منتظم ثابت ہوگئے تاہم ان کے والد کا سایہ ان کا پیچھا کرتا رہا۔ مخالفین نے ان کی نامزدگی کو پارٹی پر اعظم ہوتی کی بالادستی اور ولی باغ کی آمریت کا نام دے کر کافی مؤثر مہم چلائی۔ ایک منظم منصوبے کے تحت موبائل فونز اور اخباری بیانات کے ذریعے حیدر ہوتی اور ان کے والد اعظم ہوتی کی کردارکشی کی گئی۔ یہ صورتحال عسکریت پسندوں کے لیے ایک بار پھر اس وقت دلچسپی کا سبب بن گئی جب اے این پی کے صوبائی صدر اور طالبان کے ناپسندیدہ شخص افراسیاب خٹک کو وزیر کا درجے دے کر سفیر امن بنا دیا۔ افراسیاب خٹک کی کارکردگی اور کردار پر عسکریت پسند بہت پہلے سے معترض تھے۔ لیکن جب ان کو سفیر امن بنایا گیا تو طالبان کے کان حسب معمول پھر کھڑے ہوگئے۔ خٹک وزیر اعلیٰ کے ساتھ نہ صرف یہ کہ ہر اجلاس میں موجود رہے بلکہ غیر ملکی وفود اور اجلاسوں میں بھی ان کی موجودگی کو ناگزیر قرار دیا گیا تو ایک تاثر بنایا گیا کہ ناتجربہ کار حیدر ہوتی کے زیادہ تر معاملات اسفند یار ولی خان کی خواہش پر افراسیاب خٹک ہی چلا رہے ہیں۔ طالبان نے وزیرستان میں کیے گئے اپنے ایک اجلاس کے دوران اس معاملے پر تبادلہ خیال کیا اور فیصلہ کیا کہ ردعمل کے طور پر پشاور اور

دوسرے علاقوں سے غیرملکیوں کو نشانہ بنانے کا آغاز کیا جائے اور افراسیاب خٹک کے مشوروں پر چلنے والی اے این پی اور پی پی پی کی مخلوط حکومت کو ٹف ٹائم دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگست 2008ء کے دوران منعقدہ طالبان اجلاس کے دوران باضابطہ طور پر پہلی دفعہ صوبائی حکومت کے خلاف جنگ کی حکمت عملی وضع کی گئی اور مختلف کمانڈروں کی ذمہ داریاں لگا دی گئیں۔

باوثوق ذرائع کا کہنا ہے کہ اس اجلاس کے دوران تحریک طالبان کے امیر بیت اللہ محسود نے سوات کے طالبان کے لیے باضابطہ طور پر مخصوص فنڈز کی منظوری کا بھی اعلان کیا جس کے بعد اے این پی صوبائی حکومت اور ریاستی اداروں کے خلاف طالبان کی کارروائیوں میں یکدم شدت آ گئی اور نتیجے میں اے این پی اور پی پی پی کی صوبائی حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دیا گیا۔ تو ادھر حکومتی ارکان خصوصاً سوات کے ایم پی ایز اور پارٹی عہدیداروں کو بدترین انتقام کا نشانہ بنایا گیا تو وہ علاقہ چھوڑ کر پشاور میں مستقل ڈیرے ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ یوں سوات سمیت صوبہ سرحد اور فاٹا میں امن لانے کا اے این پی کا اعلان شدید مشکلات سے دوچار ہو کر لمبے عرصے تک محض ایک خواب کی صورت اختیار کر گیا۔

باب 9

سرحد کے اضلاع میں طالبان نیٹ ورک اور اس کی کارروائیاں

افغانستان سے اٹھی طالبان کی تحریک اور ان کی عملی سرگرمیاں پاکستان کے قبائلی علاقوں سے ہوتے ہوئے صوبہ سرحد کے 28 میں سے 16 اضلاع تک پھیل چکی ہیں۔ صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور سمیت تقریباً ایک درجن اضلاع میں طالبان کے تنظیمی ڈھانچے موجود ہیں۔ 2008ء کے دوران جن اضلاع میں طالبان نے عملی کارروائیاں کیں ان میں پشاور، نوشہرہ، مردان، صوابی، سوات، دیر (دو اضلاع) کوہاٹ، ہنگو، بنوں، ٹانک، ڈی آئی خان اور چترال شامل ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان اضلاع میں طالبان اتنے فعال ہیں کہ وہ اپنی موجودگی کا گاہے بگاہے ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں اور جب چاہیں عملی کارروائیاں بھی کر سکتے ہیں۔

صوبائی وزارت داخلہ کی ایک رپورٹ کے مطابق پشاور شہر میں 172 ایسے افراد موجود ہیں جن کی طالبان کے ساتھ باقاعدہ رکنیت کی حد تک وابستگی ہے۔ پشاور کے یکہ توت، متنی، پشتخرہ، چمکنی، بڈھ بیر،، سفید ڈھیری، لنگی روڈ، ورسک روڈ اور چارسدہ روڈ پر طالبان نہ صرف موجود ہیں بلکہ سال 2008ء کے دوران ایک سرکاری رپورٹ کے دوران یہ طالبان 21 سے زائد عملی کارروائیاں بھی کر چکے تھے۔ ان کارروائیوں میں بم دھماکے، خودکش

حملے، غیر ملکیوں کا اغوا، راکٹ حملے، ٹارگٹ کلنگ اور سکولوں پر براہ راست حملے شامل ہیں۔ پشاور کی کارروائیوں میں تحریک طالبان کے علاوہ لشکر اسلام، تنظیم نہی عن المنکر اور انصار الاسلام بھی ملوث رہے ہیں۔

تحریک طالبان نے نومبر 2008ء میں باڑہ خیبر ایجنسی میں ایک کیمپ قائم کیا جہاں پر گرفتار دو اہم کمانڈرز محمد مصطفیٰ ہجرت خان اور حسن خوگیانی اس گروپ کی نگرانی کرتے رہے یہ گروپ غیر ملکی سفارتکاروں پر فائرنگ، اغوا اور نیٹو کی سپلائی لائن پر حملوں میں ملوث رہے ہیں۔ جبکہ پشاور سے 50 کلومیٹر پر واقع درہ آدم خیل کے طالبان بوقت ضرورت ان کی معاونت کرتے ہیں۔

افغان سفیر عبدالخالق فراحی، ایرانی عہدیدار حشمت اللہ اطہرزادہ، بریگیڈیئر اللہ بخش بے ضمیر این جی او کے ڈائریکٹر شاکر اسحاق متعدد وزراء کے قریبی رشتہ دار ڈاکٹر سعید احمد اور دوسری اہم شخصیات کے اغوا اور غیر ملکیوں پر فائرنگ میں یہی لوگ ملوث بتائے گئے۔

وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق 2008ء میں 210 افراد کو اغوا کیا گیا جن افراد کو ان وارداتوں میں نامزد کیا گیا ان کی تعداد 243 تھی ان میں سے جن 95 افراد کو گرفتار کیا گیا ان میں 48 کا عسکریت پسند تنظیموں سے تعلق تھا۔

پشاور کے حیات آباد کا فیز 6 عسکریت پسندوں کا بڑا مرکز بتایا جاتا ہے۔ باڑہ قدیم (بندوبستی علاقہ) ہی سے عرب کمانڈر ذبیح الطائفی اور ان کے 6 ساتھیوں کو گرفتار کیا گیا تھا اسی روز رنگ روڈ پشاور پر طالبان کمانڈر حسن خوگیانی کو گرفتار کیا گیا۔ پشاور کے حیات آباد، یونیورسٹی ٹاؤن، راحت آباد، ورسک روڈ، اصحاب بابا اور باڑہ روڈ پر القاعدہ اہلکاروں کی موجودگی کی مصدقہ اطلاعات موجود تھیں۔ پشاور اور آس پاس کے علاقوں میں سنٹرل ایشین جنگجوؤں کی موجودگی اور سرگرمیوں کی مصدقہ اطلاعات بھی پائی جاتی رہیں۔

ذبیح الطائفی سمیت دوسرے عرب باشندوں اور حسن خوگیانی کو 22 جنوری 2009ء کو گرفتار کیا گیا تھا۔ جبکہ پشاور ویلی کو درہ آدم خیل سے مولانا طارق اور اجمل خان نامی کمانڈر ابتداء میں ڈیل کرتے رہے ہیں۔

صوبائی دارالحکومت میں بے شمار طالبان عسکریت پسند موجود رہے ہیں۔ سرحد

پولیس کو جنوری 2009ء میں ایک ایسی فہرست ہاتھ آئی جس میں 24 اعلیٰ شخصیات کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا ان میں افراسیاب خٹک، وزیر اعلیٰ حیدر علی ہوتی، وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین، وزیر جنگلات واجد علی خان، وزیر سائنس و ٹیکنالوجی ایوب خان آشاڑے، وزیر سوشل ویلفیئر ستارہ ایاز اور بعض این جی اوز کے سربراہان کے نام شامل تھے۔ پشاور کے علاقوں سفید ڈھیری، پچگی روڈ، چمکنی، بڈھ بیر، ورسک روڈ اور چارسدہ روڈ پر طالبان باقاعدہ گشت کرتے رہے ہیں۔ جبکہ یکہ توت کے علاقے اور راحت آباد کے دو مدارس میں باقاعدہ بھرتیاں بھی کی گئیں۔ ان مدارس سے باجوڑ اور مہمند ایجنسیوں کو بھی جنگجو بھیجے جاتے تھے۔ فروری 2009ء کو سربنر کے علاقے میں دو خواتین کو فحاشی کے الزام میں قتل کیا گیا جبکہ 10 فروری کو سردار احمد خان کالونی میں ایک اور خاتون کا سر کاٹ دیا گیا اور اسے بھی فحاشی کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ 10 فروری ہی کے روز پولیس نے یونیورسٹی ٹاؤن سے 4 شدت پسند گرفتار کیے جن میں ایک غیر ملکی بتایا گیا۔

ضلع نوشہرہ کے علاقے چراٹ اور امان گڑھ میں بھی عسکریت پسندوں کی نشاندہی ہوئی۔ انہی علاقوں سے دسمبر 2008ء کو نوشہرہ چھاؤنی پر راکٹ پھینکے گئے تھے۔ جبکہ طالبان کے بعض ساتھیوں نے انہی دنوں چمکنی پولیس سٹیشن پر بھی حملہ کیا تھا جس کے دوران 2 گھنٹوں تک فائرنگ ہوتی رہی۔ 28 دسمبر کو نوشہرہ سے 2 طالبان اور ایک کم عمر خودکش حملہ آور کو گرفتار کیا گیا جس نے بتایا کہ نوشہرہ میں اس کے 12 دوسرے ساتھی بھی موجود ہیں۔

ضلع مردان میں عسکریت پسندوں کی تعداد 70 سے زائد بتائی جاتی رہی۔ بغدادہ، پارہوتی، شیخ ملتون اور بجلی گھر کے علاقوں میں ان کی موجودگی اور اجلاسوں کی اطلاعات بھی ملتی رہی ہیں۔ فوجی مارکیٹ سمیت دوسرے مختلف علاقوں میں ان لوگوں نے ہی حملے کیے تھے۔ دسمبر 2008ء کو وزیر اعلیٰ سرحد حیدر ہوتی کی رہائش گاہ پر 2 بار راکٹ حملے کیے گئے۔ یہ حملے موٹروے سائیڈ سے کیے گئے تھے۔ فروری 2009ء میں طالبان نے مردان کے تین بڑے بس سٹینڈز میں ایک تحریری حکم نامہ آویزاں کیا جس میں تمام ٹرانسپورٹروں کو گاڑیوں سے ٹیپ ریکارڈ اتارنے اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں سخت کارروائی کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس سے قبل رشکئی میں ایک نرس کو اغوا کرنے کے بعد بے دردی سے قتل کیا گیا اور خط میں اس کو بدکار قرار

دیا گیا۔ 8 فروری 2009ء کو مردان کے علاقے شیر گڑھ کے ایک سرکاری سکول کو بم سے اڑا دیا گیا جبکہ شیر گڑھ اور تخت بھائی کے بعض سکولوں کو دھمکی آمیز خط بھی بھیجے گئے۔

ضلع صوابی کے ایک علاقے گندف میں 2008ء کو پولیس کی ایک کارروائی کے دوران 9 عسکریت پسندوں کو اسلحہ سمیت گرفتار کیا گیا جنہوں نے دوران تفتیش انکشاف کیا کہ ٹوپی، نواں کلی، چارگئی، یارحسین اور تربیلا ڈیم کے نواحی علاقوں میں بھی ان کے ساتھی موجود ہیں۔ ان لوگوں نے بعض علاقوں میں 9 وارداتوں کا اعتراف بھی کیا۔

صوابی سے ملحقہ ضلع بونیر میں اگست 2008ء میں عوام، اے این پی کے کارکنوں اور فورسز کی ایک مشترکہ کارروائی کے دوران 8 عسکریت پسندوں کو ان کے ٹھکانے پر ہلاک کر دیا گیا جبکہ تورورسک اور پیربابا سے بھی متعدد طالبان کو گرفتار کیا گیا۔ ردعمل کے طور پر ضمنی انتخاب کے دوران پولنگ سٹیشن پر خودکش حملہ کیا گیا اور طالبان نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ سرکاری ذرائع کے مطابق 9 فروری 2009ء کو بونیر کے بعض علاقوں میں ایک خط تقسیم کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ووٹرز 10 فروری کے ضمنی الیکشن (این اے 20) میں ووٹ ڈالنے سے گریز کریں ورنہ خودکش حملہ کیا جائے گا۔

بونیر ہی میں طالبان کا ایک گروپ پانچ اپریل 2009ء کو ایک بار پھر داخل ہو گیا جس کے خلاف عوام نے لشکر ترتیب دے کر ان کو علاقہ چھوڑنے کی ڈیڈلائن دے دی۔

ملاکنڈ ایجنسی کے ہیڈکوارٹر بٹ خیلہ میں طالبان کی باقاعدہ تنظیم سازی جنوری 2009ء کو عمل میں لائی گئی۔ 2 فروری 2009ء کو ایک باقاعدہ حکم نامے کے ذریعے مقامی ڈاکٹروں کو دھمکی دی گئی کہ وہ اپنی فیسیں کم کریں۔ دوسری بات یہ کہی گئی تھی کہ ڈاکٹر حضرات اپنے کلینکس میں خاتون نرسوں کو کام کرنے سے منع کر دیں ورنہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ بٹ خیلہ کے مضافاتی علاقوں میں بعض طالبان کو گاڑیوں میں اسلحہ سمیت گشت کرتے دیکھا گیا اور ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ بٹ خیلہ کے قریبی ٹاؤن تھانہ میں بھی ایسے عناصر کی سرگرمیاں دیکھی جاتی رہیں۔ یہاں پر بعض تعلیم یافتہ خواتین اور سرکاری افسران کو مسلسل تحریری دھمکیاں ملتی رہی ہیں۔ اسی علاقے میں جنوری 2009ء کو ایک گلوکار سردار یوسف زئی پر اس وقت قاتلانہ حملہ کیا گیا جب وہ موسیقی کی ایک تقریب میں شرکت کے بعد واپس

آ رہا تھا۔ فائرنگ سے اس کا ساتھی انور خان جاں بحق ہوگیا۔ سردار کے ایک شاعر بھائی پروفیسر محمد اسلام ارمانی کو بھی شاعری نہ کرنے اور نوکری سے استعفیٰ دینے کی دھمکیاں ملتی رہی ہیں۔

حکمران طبقے کے شہر ضلع چارسدہ میں عسکریت پسندوں اور پولیس ایف سی کے درمیان 2008ء کے دوران چھ مرتبہ مقابلے ہوئے۔ یہاں پر آفتاب خان شیر پاؤ، افراسیاب خٹک اور اسفند یار ولی خان پر تین بار خودکش حملے کیے گئے جن میں سو کے قریب لوگ مارے گئے۔ چارسدہ کے علاقوں پڑانگ، شبقدر، سریاب اور دواسری (Dwa Sari) میں عسکریت پسندوں کی معقول تعداد کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ اسفند یار ولی خان پر خودکش حملے کے بعد گرفتاریوں اور تفتیش سے معلوم ہوا تھا کہ چارسدہ میں 42 سے زائد عسکریت پسند موجود ہیں جن میں 9 کا تعلق طالبان کے خودکش سکواڈ سے تھا۔ شبقدر کے علاقے کو عسکریت پسندوں کے مضبوط مرکز کی شہرت حاصل رہی ہے۔

دیر وہ علاقہ ہے جہاں پر تحریک نفاذ شریعت محمدی جیسی تنظیم نے جنم لیا۔ یہ علاقہ جماعت اسلامی اور حزب المجاہدین کے کئی جہادی کمانڈروں کا آبائی علاقہ ہے۔ 2008ء کے آخر میں دیر مقامی امن جرگہ اور لشکر کے باوجود عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ اس دوران مسجد پر خودکش حملے سمیت متعدد وارداتیں ہوئیں جبکہ اے این پی کے مرکزی لیڈر زاہد خان کے حجرے کو بھی اڑا دیا گیا۔ 2008ء ہی کو دیر سے دو چینی انجینئرز کو اغوا کر کے سوات کے پیوچار کیمپ میں منتقل کیا گیا۔ ان انجینئرز کو لوئر دیر کے ایک جہادی کارکن نے اغوا کیا تھا جو ہسبنڈ (Hasband) کا رہنے والا ہے۔ یہ گروپ اس سے قبل ہائیڈل پاور پراجیکٹ کے دوسرے چینی انجینئرز کو اٹھانے کی کوشش بھی کر چکا تھا۔

اس سے قبل لوئر دیر کے ہیڈکوارٹر تیمرگرہ میں خفیہ اداروں اور پولیس کی ایک کارروائی کے دوران القاعدہ کے 3 اہم ارکان اور ان کے کمانڈر کو جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد رسول کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا گیا۔ یہ واقعہ 2007ء کے آخر میں رونما ہوا تھا۔ اس گرفتاری کے خلاف جماعت اسلامی ضلع دیر نے ایک جلوس بھی نکالا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر محمد رسول کے ہاں القاعدہ کے کنٹری بیس کمانڈرز قیام کیا کرتے تھے اور

ان کے اکاؤنٹ میں 6 کروڑ روپے کی خطیر رقم کا بھی انکشاف ہوا تھا۔

جنوری 2009ء کو دیر میں کھلے عام طالبان کی تنظیم سازی عمل میں لائی گئی۔ (لوئر دیر) میں تنظیم کے کمانڈر نے ایک اخباری بیان کے ذریعے خودکش حملوں سمیت دوسری دھمکیوں کا سرعام اعلان بھی کیا اور حکومت سے فوری طور پر شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ ایک اور مقامی کمانڈر نے 8 فروری کو شریعت کی مخالفت کرنے والے افراد کو ایک بیان کے ذریعے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔

شانگلہ

یہ وہ علاقہ ہے جس سے ہوتے ہوئے شاہراہ ریشم کے راستے چین تک کا سفر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ملحقہ کالا ڈھاکہ نامی علاقے کو عسکریت پسندوں کے ٹھکانے کی شہرت حاصل رہی ہے۔ اسی علاقے سے عسکریت پسند اگر ایک طرف چین کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں تو دوسری سڑک پر مانسہرہ کے راستے کشمیر کا سفر بھی کرتے ہیں۔ سڑک ضلع سوات میں ملحقہ اس ضلع کے الپوری، مارتونگ اور سرنیجی میں عسکریت پسندوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ یہاں کے ایک دورافتادہ علاقے چکسیز میں القاعدہ کے ایک ایسے لیڈر اور اس کے ساتھیوں کی نشاندہی کی گئی تھی جو کہ سکھ شہری بن کر وہاں قیام پذیر تھے۔ یہ لوگ پولیس کی کارروائی سے قبل فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ سرنیجی میں 2008ء کو ایک گروپ نے ایک مسجد پر قبضہ کیا اور پھر 3 خودکش کھڑے کر کے لوگوں کو سدھرنے اور تعاون کرنے کی دھمکی دی۔ جس کے بعد ان کو دوسری جگہ پر ان کی شرائط پر آباد کیا گیا۔

شانگلہ سے سوات جانے والے ایک پہاڑی ٹریک پر القاعدہ کے 3 ارکان کو 2008ء میں اس وقت ہیلی کاپٹرز نے فائرنگ کر کے مارا جب وہ گھوڑوں کے ذریعے سوات کے علاقے میاندم منتقل ہو رہے تھے۔

کوہاٹ

2008ء کے دوران فورسز اور عسکریت پسندوں کے درمیان کوہاٹ کے مختلف علاقوں میں 12 جھڑپیں ہوئیں۔ کوہاٹ میں کارروائیاں درہ آدم خیل اور کرم ایجنسی کے

طالبان کرتے رہے ہیں۔ یہاں کے ایک علاقے جنگل خیل میں عسکریت پسندوں کا ٹریننگ سنٹر بھی کام کرتا رہا ہے۔ 2008ء کے دوران صرف کوہاٹ چھاؤنی پر 13 راکٹ حملے کیے گئے۔ اس شہر کو غیر محفوظ شہر سمجھا جاتا ہے۔ اس ضلع سے ملحقہ ضلع کرک کے ایک دورافتادہ علاقے سے بھی افغانی طالبان کے بعض افراد کو کچھ عرصہ قبل گرفتار کیا گیا تھا جن کو ایم ایم اے کے وزیراعلیٰ اکرم خان درانی کی ذاتی مداخلت پر رہائی دلائی گئی تھی۔ 6 فروری 2009ء کو کرک میں جے یو آئی سے تعلق رکھنے والے سابق صوبائی وزیر قانون ملک اعظم جب مسلم لیگ ن میں شامل ہو رہے تھے تو ان کو جلسہ کے انعقاد کے لیے مقامی طالبان سے باقاعدہ اجازت لینی پڑی تھی کیونکہ ان کو جے یو آئی نہ چھوڑنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔

ہنگو

ہنگو پاکستان کے بدترین شورش زدہ علاقے کی شہرت رکھتا ہے۔ اس شہر میں تحریک طالبان کے متعدد اہم کمانڈرز براہ راست کارروائیوں کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ دسمبر 2008ء کو عسکریت پسندوں نے عین اس وقت ایک پولیس سٹیشن کا محاصرہ کیا جب نئے تعینات ایس ایس پی ادریس خان چارج سنبھالنے ہنگو جا رہے تھے اور طالبان کے ساتھ مڈبھیڑ کے دوران متعدد طالبان کو ایس ایس پی کی قیادت میں گرفتار کیا گیا۔ طالبان نے پولیس سٹیشن پر حملہ کر کے محاصرے کے بعد اپنے ساتھی رہا کروا لیے۔ اس واقعے سے چند روز بعد ہنگو کے ٹل بس سٹینڈ پر القاعدہ کے ایک اہم عربی عہدیدار کو گرفتار کیا گیا۔ پولیس ذرائع کے مطابق ہنگو میں طالبان کی تعداد 300 سے زائد ہے۔

بنوں

بنوں ڈسٹرکٹ اور ایف آر بنوں میں وزیرستان سے تعلق رکھنے والے طالبان کی بڑی تعداد رہائش پذیر رہی ہے۔ 2007ء کو جب حکومت کے حمایت یافتہ کمانڈر مولوی نذیر نے غیرملکی عسکریت پسندوں کے خلاف وزیرستان میں کارروائیاں شروع کیں تو بے شمار کمانڈر اور ارکان ایف آر بنوں ڈسٹرکٹ بنوں اور ٹانک میں منتقل ہوگئے۔ جہاں پر ایم ایم اے کی صوبائی حکومت نے مقامی ایم این اے کی سرپرستی میں ان کو تمام ممکنہ تحفظ فراہم کیا بنوں میں

2008ء کے آخر میں عسکریت پسندوں اور فورسز کے درمیان 9 براہ راست جھڑپیں ہوئیں جبکہ یہ بندوبستی علاقوں کا وہ واحد ضلع تھا جہاں امریکی جاسوس طیاروں نے بھی حملے کیے۔ ایف آر بنوں اور ڈسٹرکٹ بنوں میں تمام کارروائیاں کمانڈر گل بہادر کی قیادت اور سرپرستی میں ہوتی رہی ہیں۔ ایف آر بنوں کا علاقہ بکاخیل طالبان کا مضبوط مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اسی علاقے سے خدیجۃ القطھار نامی کینیڈین لڑکی کو اٹھایا گیا۔ بنوں میں عسکریت پسندوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ بنوں کے امیر مولانا سیف اللہ نے 8 فروری کو پریس کلب میں کھلے عام اپنے ایجنڈے کا اعلان کیا اور بعض عناصر کو 25 فروری تک ڈیڈلائن دے کر چلا گیا۔

ٹانک اور ڈی آئی خان (ایف آر ز سمیت) بھی ہنگو اور بنوں کی طرح طالبان کے مؤثر ترین اضلاع ہیں۔ ان علاقوں میں القاعدہ کی موجودگی کی بھی مسلسل اطلاعات ملتی رہی ہیں۔ ٹانک اور بنوں میں خواتین کے خلاف سب سے زیادہ کارروائیاں رپورٹ ہوتی رہی ہیں۔ (سوات کے بعد) ان تین اضلاع کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کی خواتین کے ساتھ القاعدہ اور افغانی طالبان نے وزیرستان کے بعد سب سے زیادہ شادیاں رچائی ہیں ٹانک میں فورسز اور عسکریت پسندوں کے درمیان 2008ء کے دوران 11 مقابلے ہوئے۔ بے شمار خواتین کو ملازمتوں سے استعفے دینے پر مجبور کیا گیا۔ جبکہ بے شمار لوگ ہجرت کر کے پشاور منتقل ہو گئے۔ 6 فروری 2009ء کو ٹانک کے ایک علاقے میدان سے ایک لڑکی کو لوگوں کے سامنے بدکاری کا الزام لگا کر گلی کوچے میں مسلح طالبان نے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جبکہ دو دوسری لڑکیوں کو اس سے قبل ہلاک کر دیا گیا۔ ٹانک اور ڈی آئی خان بھی وہ اضلاع ہیں جہاں طالبان باقاعدگی سے اسلحہ سمیت گشت کرتے ہیں۔ ٹانک، ڈی آئی خان اور بنوں وہ اضلاع ہیں جہاں سے طالبان جنوبی پنجاب کی طرف نقل وحرکت کرتے ہیں اور ان اضلاع کو بیس کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ 10 فروری کو ڈی آئی خان کے علاقہ پہاڑپور سے ڈاکٹر شیر زمان کے گھر کی تین خواتین اٹھالی گئیں ان کو بھی دھمکیاں مل رہی تھیں۔

چترال

چترال وہ سرحدی ضلع ہے جہاں 2002ء کے بعد القاعدہ کمانڈروں اور اہلکاروں کی بڑی تعداد آ کر آباد ہوئی اور ان کے لیے یہ ضلع ایک محفوظ مقام ثابت ہوا۔ افغانستان کی سرحد

اس ضلع ... چند کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ تورابورا سے متعدد لوگ جلال آباد کے راستے چترال میں داخل ہوئے تھے۔ 2005ء کو ایک مقامی ہوٹل سے 6 القاعدہ ارکان گرفتار کیے گئے۔ یہ لوگ ایک مقامی این جی او اور آغا خان فاؤنڈیشن کے دفاتر کے خلاف کارروائیوں میں ملوث تھے۔ این جی او دفاتر ان کی دھمکیوں کے بعد بند کردیے گئے بعض خاتون ٹیچرز کے خلاف بھی اس عرصہ کے دوران کارروائیاں کی گئیں۔ چترال سے 20ء کے دوران افغانستان میں داخل ہونے والے متعدد افراد کو افغان فورسز نے گرفتار کیا ان کی تعداد 72 بتائی گئی۔ چترال کے جن علاقوں میں یہ لوگ رہائش پذیر رہے ہیں اور رہ رہے ہیں ان میں مٹرکو، دروش، بونی اور مستوج شامل ہیں۔

ہزارہ ڈویژن کے تین اضلاع ہری پور، مانسہرہ اور بٹگرام میں بھی طالبان کی موجودگی کی اطلاعات ملتی رہی ہیں۔ ہری پور کے علاقے غازی کے ایک مہاجر کیمپ کو اس مقصد کے لیے کچھ عرصہ قبل تک استعمال کیا جاتا رہا۔ اس علاقے میں کشمیری کمانڈر مقامی طالبان کو ٹریننگ بھی دیتے رہے۔ ہری پور کی ایک جدید بستی کلا بٹ میں بھی ایسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ حطار انڈسٹریل سٹیٹ میں متعدد بار ایسے لوگوں کو بھتہ خوری اور اغوا میں ملوث دیکھا گیا۔ دوسری طرف 9-2008ء کے دوران اے این پی کے آٹھ عہدیداروں اور وزراء پر حملے کیے گئے۔ ایک ایم پی اے بھی شہید کیا گیا۔

مجموعی طور پر ان اضلاع میں 2007ء اور 2008ء کے دوران طالبان کی تنظیم سازی کے عمل کا آغاز ہوا۔ ان تمام اضلاع میں طالبان کے اجلاس ہوتے رہے۔ ان کے بیانات جاری کیے جاتے رہے۔ ان کی گرفتاری عمل میں لائی گئی اور تقریباً تمام اضلاع میں ان کی عملی کارروائیاں رپورٹ کی جاتی رہیں۔ سوات میں طالبان کی کامیاب مزاحمت اور حکمت عملی کے بعد دوسرے اضلاع میں سرگرمیاں بڑھنی شروع ہوگئیں اور 9 سے 12 تک اضلاع میں ان کی ملٹری ونگز بھی قائم کیے گئے۔ ان تنظیموں کا تحریک طالبان پاکستان کے ساتھ مسلسل رابطہ ہوتا ہے۔ اہم کمانڈرز تحریک کے مرکزی شوریٰ کے اجلاسوں میں شرکت کر کے حکمت عملی وضع کرتے ہیں۔ ان کے اپنے لیٹر پیڈز ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ فاٹا اور افغانستان کے طالبان کے ساتھ بوقت ضرورت رابطے کا کام لیتے ہیں۔

مجموعی طور پر ایک محتاط اندازے کے مطابق صوبہ سرحد اور نیم قبائلی علاقوں (ایف آر ز) میں 47 علاقے ایسے ہیں جہاں طالبان یا ایسی دوسری ہم خیال تنظیموں کے ٹھکانے یا مراکز موجود ہیں۔

ان تمام تفصیلات کو مرتب کرنے کے لیے وزارت داخلہ صوبہ سرحد کو انٹیلی جنس رپورٹس، سپیشل برانچ پولیس، پولیس اور ایف سی کے ذرائع، طالبان سورس، مقامی صحافیوں کی رپورٹس، ایم آئی کی رپورٹس، طالبان سروس، افغان انٹیلی جنس کی رپورٹس، صوبہ سرحد پولیس کے علاوہ وفاقی وزارت داخلہ کی رپورٹس کو بنیاد بنایا گیا ہے لیکن یہ ایسی معلومات اور تفصیلات ہیں کہ جن کی صحت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اس تفصیل سے پڑھنے والوں کو افغانستان سے پسپا ہوکر آنے والے مجاہدین، طالبان اور القاعدہ ارکان کی سرگرمیوں کے ساتھ سیاسی اور معاشرتی ترجیحات کو جاننے میں مدد مل سکتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ان کی نظریاتی سمت کا بخوبی اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں جبکہ وفاقی وزارت داخلہ اور پمرا نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ ان علاقوں میں چلنے والے ایف ایم ریڈیوز کی تعداد 20 سے زیادہ تھی اور ان میں تو صوبائی وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین کے بقول کچھ تو ایسے تھے جو سائیکلوں پر لگائے گئے تھے لیکن ان کی نشریات جام کرنے کا کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا گیا حالانکہ کچھ لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ اگر اس علاقہ میں کوئی بڑا ریڈیو سٹیشن بنا دیا جاتا تو ان ایف ایم ریڈیوز کی نشریات خود بخود جام ہو جاتیں مگر کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خرابی یا لچک موجود تھی جس کے باعث یہ ریڈیو کم از کم سوات میں دندناتے رہے اور وہاں سے مولوی فضل اللہ اور دیگر طالبان لیڈروں کے پیغامات نشر ہوتے رہے۔ سرکاری ملازمین کو 'عوام' کی خدمت کے لیے طالبان کے ساتھ تعاون کرنے دھمکی کی ترغیبات دی جاتی رہیں۔

یہاں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ سوات میں فوج 2007ء میں اس وقت کی مجلس عمل کی صوبائی حکومت کی درخواست پر آئی تھی لیکن......طالبان نے ان کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ اس کے بالمقابل اے این پی اور پی پی پی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو مجرم قرار دے کر ان کے واجب القتل ہونے کی فہرستیں جاری کی گئیں۔ اسی باب میں ہم نے بتایا

ہے کہ لوئر دیر میں جماعت اسلامی کے ضلعی امیر کے گھر سے القاعدہ کمانڈر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری ہوئی تھی جس پر جماعت اسلامی نے احتجاجی جلوس بھی نکالا تھا لیکن حکومت کی طرف سے جماعت اسلامی کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی اور نہ ہی اس پر پابندی عائد کی گئی۔ ایک اور تاریخی سچ تو یہ بھی ہے کہ پرویز مشرف کے دور میں بھی راولپنڈی، کوئٹہ اور لاہور سے جماعت اسلامی کے لوگوں کے ہاں سے کچھ گرفتاریاں ہوئی تھیں لیکن اس جماعت کے خلاف اس وقت بھی کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔ حتیٰ کہ لاہور میں ایک پریس کانفرنس کے دوران وزیر اطلاعات شیخ رشید نے پابندی کو مسترد کر دیا تھا۔

باب 10

افغانی اور پاکستانی طالبان کا تقابلی جائزہ

تمام مکتبہ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ
اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے لیکن وہ کفر کے خلاف جہاد کا حکم بھی دیتا ہے۔
علامہ جاوید غامدی کہتے ہیں کہ جہاد کے کچھ تقاضے ہیں:
(1) اسلامی ریاست کا قیام، اور یہی ریاست جہاد کرسکتی ہے۔ کسی کو انفرادی حیثیت میں اس کی اجازت نہیں۔
(2) جہاد اس وقت ہوسکتا ہے جب آپ کو فتح کا مکمل یقین ہو۔ بے مقصد لوگوں کو مارنا اور مروانا کسی بھی طرح جائز نہیں۔ اس کی ذمہ داری اس شخص پر ہوگی جو جہاد کی ترغیب دے گا۔

یہ جہاد کا بنیادی فلسفہ ہے۔ اب ذرا سنت رسولؐ ملاحظہ فرمائیں:
حضور نبی کریمؐ نے ایک لشکر کو روانہ کرتے ہوئے ہدایات جاری کیں اور سختی سے حکم دیا۔
عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ قیدیوں کے ساتھ نرم سلوک کرنا اور ان پر ظلم نہ کرنا۔
اور پھر اگلے مرحلے میں کہا:
فصلیں نہ اجاڑنا۔ درخت بھی نہ کاٹنا۔

یہ جنگ کے لیے متعین کردہ اصول ہیں جو رحمت اللعالمینؐ نے دیئے تھے۔ اور جو آج اقوام متحدہ کے چارٹر کا بھی حصہ ہیں۔ لیکن یہ الگ بات کہ نئے جنگی ہتھیاروں نے ان اصولوں کو بھی تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

حضورؐ نے تو یہ کہا تھا کہ فصل تباہ نہ کرنا کہ یہ انسانوں کے لیے خوراک اور درخت مسافروں کے لیے سائے کا باعث ہوتے ہیں..... لیکن ہمارے یہ طالبان کیا کرتے ہیں۔ یہ کیسا اسلام ہے۔ اور کیسی سنت رسول؟ مجاہدین اور طالبان کس مذہب اور اس کے اصولوں کے غلبہ کے لیے یہ کام کر رہے ہیں؟ اور اس کے لیے جو مظالم روا رکھے ہوئے ہیں وہ کون سے اسلام کا حصہ ہیں۔

یہ وحشت، یہ بربریت، یہ سفاکی؟

زیرنظر باب میں ہم تقابلی جائزے کے ساتھ پاکستانی طالبان کے اسلام کے نام پر ڈھائے جانے والے مظالم کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ذرا غور کیجئے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں خود طالبان بھی اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں اگر انہیں ایک خاص زاویے میں دیکھنے سے فرصت ہو تو۔

پاکستان کی حکومت، فورسز اور طالبان مخالف دانشوروں اور عوام کے ذہن میں یہ سوال مسلسل سر اٹھاتا رہا ہے کہ پاکستانی عسکریت پسند افغانی طالبان کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر اور متشدد کیوں ہیں؟ اس سوال کا ایک حقیقی پس منظر موجود ہے کیونکہ پاکستانی عسکریت پسندوں نے 2004ء کے بعد شروع کی گئی اپنی کارروائیوں کے دوران نہ صرف یہ کہ فورسز کو بدترین انتقامی رویے کا نشانہ بنایا بلکہ انہوں نے حکومت اور طالبان مخالف سیاسی قوتوں کے حامی عام لوگوں کو ایسے ایسے وحشیانہ طریقے استعمال کر کے ٹھکانے لگایا جس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران وزیرستان، کرم اور باجوڑ کی قبائلی ایجنسیوں میں جن عام لوگوں کو امریکہ اور پاکستان کے جاسوس قرار دے کر ذبح کیا گیا ان کی تعداد 55 بتائی جاتی ہے۔

سوات میں بھی اسی عرصے کے دوران 34 کو جاسوس یا ایجنٹ قرار دے کر بے دردی سے جانوروں کی طرح ذبح کیا گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صرف بارہ، تیرہ مہینوں میں جاسوسی کے الزام میں سو کے قریب لوگوں کو ذبح کیا گیا۔ ان لوگوں کو نہ صرف

یہ کہ ذبح کیا گیا بلکہ متعدد کی نعشوں کو دفنانے کی اجازت دینے کے بجائے جانوروں کی خوراک کے لیے ویرانوں میں پھینک دینے کے متعدد واقعات بھی رپورٹ کیے جاتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ذبح کرنے کے لیے بھی دو طریقے استعمال کیے گئے۔ جو لوگ امریکہ کی جاسوسی کے الزام میں پکڑے گئے ان کو گردن (نیچے والے حصے سے) کی طرف سے ذبح کیا گیا تاکہ مرنے والے کو زیادہ اذیت مل سکے اور اس کے دم توڑنے میں کافی وقت لگ جائے جبکہ طالبان کی مخالفت کرنے اور پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے والوں کو قربانی کے جانوروں کی طرح گلے کی جانب سے ذبح کیا جاتا جو پہلے والے عمل کی نسبت ذرا آسان موت ثابت ہو سکتی تھی۔ امریکی جاسوسی کے الزام میں ذبح کرنے یا گولی مارنے والے شخص کی نعش کو دفنانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی بلکہ ایسی ہر نعش کو ویرانے میں پھینک کر، پرندوں اور جانوروں کی خوراک بنایا جاتا تھا وجہ اس کی یہ بتائی جاتی کہ اللہ کے احکامات سے روگردانی کرنے والے کو مٹی کے اندر دفن کر کے پاک مٹی کو پلید نہیں کرنا چاہیے۔

جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہونے والے ایسے ہر شخص پر باقاعدہ الزامات لگائے جاتے اور اس کو اس کے ''اعتراف جرم'' کے بعد ذبح کیا جاتا۔ متعدد ایسے لوگوں کی ویڈیوز بھی بنائی گئیں اور پھر ان کی ایک منظم نیٹ ورک کے ذریعے تشہیر بھی کی جاتی رہی۔ بعض افراد کو پورے کے پورے مجمعے کے سامنے ٹھکانے لگایا جاتا اور دم نکل جانے کے بعد خوشی کا اظہار فخر کے ساتھ بھی کیا جاتا۔

دوسرے طریقے کے ذریعے ایسے افراد کو مجمع کے سامنے لا کر کلاشنکوف سے گولیاں مار کر ہلاک کیا جاتا۔ یہ اکثر وہ لوگ ہوتے جو یا تو طالبان کے مخالف تھے یا ان پر قتل اور اس قسم کے دوسرے جرائم ثابت ہو جاتے۔ ان کی لاشوں کی بھی بے حرمتی کی جاتی یا تو پھینک دی جاتیں یا اس شرط پر رشتہ داروں کے حوالے کی جاتیں کہ ان کی نماز جنازہ ادا نہیں کی جائے گی۔

جو سرکاری اہلکار خصوصاً ایف سی اور آرمی کے جوان لڑائی لڑتے عسکریت پسندوں کے ہاتھوں پکڑے جاتے ان کے ساتھ بھی یہی عمل دہرایا جاتا۔ ان کا ویڈیو کیمرہ کے سامنے ندامت اور معافی پر مبنی بیان ریکارڈ کیا جاتا۔ ان کو مرنے سے قبل منتیں کرتے اور معافیاں

مانگتے دکھایا جاتا اور اس کے بعد کیمرہ ریکارڈنگ کرتے ہوئے کلاشنکوف سے چھلنی کر دیا جاتا۔بعض لاشوں کو جلائے جانے کے واقعات بھی 2006ء کے دوران وزیرستان میں رپورٹ کیے گئے۔ ویڈیوز کے جاری کرنے کا مقصد سرکاری فورسز اور اپنے مخالفین کو ہراساں کرنا اور ان کو اپنے فرائض سے روکنا تھا۔ وحشت اور بربریت کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیرستان آپریشنز کے دوران بے شمار فوجی جوان اور ایف سی اہلکار یا تو اپنے اپنے مورچوں سے بھاگ گئے یا انہوں نے خود کو طالبان کے حوالے کر دیا۔

اس قسم کے واقعات 2007ء میں سوات آپریشن کے دوران بھی پیش آئے۔ مثلاً پشاور کے ایف سی ہیڈکوارٹر سے ایک ٹرک 30 اہلکاروں کو لے کر سوات روانہ ہوا لیکن ڈرائیور اور انچارج کو ملاکنڈ کی وادی پار کرنے کے بعد پتہ چلا کہ تیس میں سے پندرہ یا بیس وادی میں گاڑی سے اتر کر بھاگ چکے ہیں۔ اس سے قبل وزیرستان میں مہمند رائفلز اور ایف سی کے بے شمار جوان نہ صرف یہ کہ محاذ جنگ سے بھاگ گئے تھے بلکہ اکثر نے فرار کے بعد اپنے اپنے یونٹس میں آنا بھی گوارا نہیں کیا۔ فورسز کے اس عمل کی بنیادی وجہ بھی یہی تشدد اور بدترین انتقامی کارروائی تھی جو کہ عسکریت پسندوں کی جانب سے ابتداء میں کی جاتی رہی جبکہ ایک نیٹ ورک کے ذریعے اس کی پبلسٹی بھی کی جاتی تھی۔

ادھر سوات میں بھی یہی پالیسی اپنائی گئی وہاں پر سرکاری اہلکاروں، فورسز کے ارکان اور مخالفین کو ذبح کر کے یا گولی مار کر نہ صرف یہ کہ درختوں اور چوکوں میں لٹکایا گیا بلکہ قابل ذکر مخالفین کو مارنے کے بعد ان کی نعشوں کو گاڑیوں کے آگے یا پیچھے باندھ کر آس پاس کے علاقوں کی ''سیر'' بھی کرائی جاتی۔ ایسے ہر اقدام کے بعد علاقے پر سکوت طاری ہو جاتا اور فورسز بدترین عدم تحفظ اور خوف کی صورتحال سے دوچار ہو جاتیں۔ یہی وہ پس منظر تھا جس کے باعث مینگورہ سوات کی ایک جگہ گرین چوک کو عالمی میڈیا نے خونی چوک کا نام دے دیا کیونکہ صبح کے وقت جب لوگ گھروں سے نکلتے تو انہیں کوئی نہ کوئی نعش اس چوک میں لٹکی ہوئی ملتی۔

کہا جاتا ہے کہ ذبح کرنے اور نعشیں لٹکانے کے اس عمل کا آغاز کشمیر جہاد میں خاص فیز کے دوران مقبوضہ کشمیر سے کیا گیا تھا۔ وہاں پر بعض پاکستانی جہادی تنظیمیں بھارتی

اہلکاروں یا ان کے حامی مسلمانوں کو پکڑ کر ان کو ایسی سزائیں دیا کرتی تھیں۔

پاکستان کے برعکس افغانستان میں اس قسم کے عمل یا تشدد کی مثالیں بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ملتی ہیں۔ افغانستان میں فورسز یا مخالفین کو ذبح کرنے کے واقعات دو یا تین فیصد سے زیادہ کبھی رپورٹ نہیں ہوئے۔

اس قسم کی کارروائیاں افغانستان میں 96-1995ء کے دوران صرف اس وقت سننے کو ملی تھیں جب طالبان نے شمالی اتحاد کے بعض رہنماؤں اور کمانڈروں کو شمالی افغانستان میں نشانہ بنایا تھا۔ تاہم ان کارروائیوں میں بھی عام لوگوں کو کبھی اس طرح غیر انسانی ظلم کا نشانہ نہیں بنایا گیا جیسا کہ پاکستان میں بعد میں دیکھنے کو ملا۔ افغانستان میں مخالفین کو ذبح کرنے یا ان کی نعشوں کی بے حرمتی کے بجائے گولی مار کر ہلاک کیا جاتا تھا۔ امریکی قبضے کے بعد بھی افغانستان کے طالبان کی پالیسی یہی رہی کہ عام شہریوں، سیاسی کارکنوں یا حکومتی اہلکاروں کے ساتھ ممکنہ حد تک نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور اپنے حملوں کو سکیورٹی فورسز اور ٹاپ لیڈرشپ تک محدود رکھا جائے۔ افغانی طالبان نے یہاں تک رعایت کا رویہ اپنایا کہ حملوں کے مواقع پر افغان نیشنل آرمی یا پولیس کے بجائے امریکی اور نیٹو فورسز کو نشانہ بنایا۔

ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں طالبان کے ہاتھوں مارچ 2008ء سے لے کر مارچ 2009ء کے درمیان کے ایک سال کے دوران 550 عام لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ان میں سوات کے سینکڑوں ہلاک شدگان شامل نہیں ہیں۔ اسی عرصے کے دوران پاکستان کے مختلف علاقوں میں 63 خودکش حملے کیے گئے جبکہ فورسز کے 180 افراد کو نشانہ بنایا گیا۔ (سوات کے علاوہ)۔ سال 9-2008ء کے دوران عسکریت پسندوں کے ہاتھوں پاکستان میں مجموعی طور پر ایک محتاط اندازے کے مطابق پانچ ہزار سے زائد لوگ مارے گئے ہیں جن اہم لوگوں کو نشانہ بنایا گیا ان میں بے نظیر بھٹو شہید، اسفند یار ولی خان، افضل خان لالہ، افراسیاب خٹک، بشیر بلور، مولانا حسن جان (جے یو آئی)، سینیٹر مولانا محمد خان شیرانی، میاں افتخار حسین، سید عاقل شاہ، ایم پی اے عالمزیب خان، آفتاب خان شیرپاؤ، ایم این اے مولانا نورالحق قادری، لطیف آفریدی، ایم پی اے پیر محمد خان، ایم این اے امیر مقام، سابق صوبائی وزیر میاں گل، اسفندیار زیب، باڑہ کی ایک تنظیم کے سربراہ حاجی نامدار خان، نامزد

افغان سفیر عبدالخالق فراحی اور ان کے دو ساتھی، امریکی قونصلر برائے پشاور، ایرانی کمرشل اتاشی حشمت اطہر زادے۔ (فورسز، حکومت کے حکام اس کے علاوہ ہیں) اور متعدد دیگر شامل ہیں۔

دوسری طرف پاکستان میں اس عرصہ کے دوران 52 کے قریب غیر ملکی سفارتکاروں، ان کے سٹاف اور ڈونرز اداروں کے اہلکاروں کے خلاف بھی اغوا اور اقدام قتل سمیت دوسری وارداتیں کی گئیں۔

اس کے برعکس افغانستان میں مارچ 2008ء سے مارچ 2009ء تک ایک سال میں 32 خودکش حملے کیے گئے۔ وہاں پاکستان کے مقابلے میں سیاسی، حکومتی اور سفارتی شخصیات کے خلاف کی گئی کارروائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہی جبکہ ہلاک شدگان کی شرح بھی انتہائی کم رہی۔

ان مختصر اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے عسکریت پسند نہ صرف فورسز، حکومتی اہلکاروں، سفارتکاروں، سیاسی قائدین اور عوامی نمائندوں کے خلاف جارحانہ پالیسی اپنائے ہوئے ہیں بلکہ وہ عام لوگوں کو ہلاک کرنے کے ایجنڈے پر بھی عمل پیرا ہیں۔ پاکستان کے مقابلے میں افغانستان میں طالبان نے نہ صرف یہ کہ اپنی کارروائیاں فورسز تک محدود رکھیں بلکہ انہوں نے پاکستان کی طرح طالبان عدالتوں کے قیام یا سزائیں دینے جیسے اقدامات سے بھی مکمل گریز کیے رکھا۔

افغانستان میں مساجد، جرگوں، حجروں یا دوسرے عوامی مقامات کا تقدس اور احترام برقرار رکھتے ہوئے ان جگہوں کو سیاست اور جنگ سے باہر رکھا گیا۔ جبکہ پاکستان میں ایسے مقامات کو خصوصی طور پر ٹارگٹ بنا کر سینکڑوں افراد کو شہید کیا گیا۔ پاکستان کے برعکس اس ہمسایہ ملک میں جرگہ کی اہمیت اور کردار کو طالبان کے زیر کنٹرول علاقوں میں بھی بڑی حد تک برقرار رکھا گیا جبکہ 2009ء کے دوران فاٹا کے علاوہ ہنگو، دیر اور بعض دوسرے علاقوں میں جرگوں کو ٹارگٹ بنا کر درجنوں افراد کو شہید کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ان دو اضلاع کے علاوہ باجوڑ، درہ آدم خیل، کرم اور اورکزئی ایجنسی کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جہاں پر جرگوں کو خودکش حملوں کے ذریعے نشانہ بنایا گیا۔

بعض تجزیہ نگاروں کی رائے ہے کہ مخالفین کو ذبح کرنے، کوڑے مارنے اور خواتین کے خلاف سخت کارروائیوں کا خطرناک اور ظالمانہ فارمولا افغانی یا پاکستانی طالبان کا دریافت کردہ نہیں ہے بلکہ یہ فارمولا عرب اور سنٹرل ایشین جنگجو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اس طریقے کو قرآن و سنت کی رو سے درست ثابت کرنے کے دلائل رکھتے ہیں بلکہ ان طریقوں پر عمل درآمد کو فرض بھی سمجھتے ہیں۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ ذبح کرنے کے عمل کی ابتداء کشمیر کے ساتھ ساتھ افغانستان میں 87-1988ء کے دوران صوبہ ہلمند کے ایک مجاہدین کیمپ سے کی گئی تھی۔ جہاں پر ایک جہادی تنظیم نے بائیں بازو کی جماعت خلق پارٹی کے ایک درجن سے زائد افراد کو ذبح کیا اور اس واقعہ کی ویڈیو بعد میں جاری کی گئی۔

پاکستان میں 2004ء کے بعد طالبان کی کارروائیوں میں شدت آنے سے لے کر اب تک ان کی مخالفت میں پانچ برسوں میں قبائلی علاقہ جات اور شورش زدہ اضلاع میں ایک بار بھی سیاسی یا عوامی سطح پر کوئی جلوس نکالا گیا اور نہ ہی کوئی مظاہرہ کیا گیا (صرف کوئٹہ میں ہڑتال کی گئی) اس کے برعکس افغانستان میں شہریوں پر امریکی حملوں (فرینڈلی فائر) کے ساتھ ساتھ طالبان کے خلاف بھی متعدد مظاہرے کیے گئے تاہم طالبان نے ردعمل کے طور پر مظاہرین کو کبھی انتقام کا نشانہ نہیں بنایا۔ ان مظاہروں میں خواتین کے چار مظاہرے بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور پر مخالفین کے ساتھ افغانی طالبان کا رویہ نرم رہا۔

افغانستان میں 1999ء کے بعد ثقافت سے متعلق ان کے سخت رویے میں کافی حد تک نرمی دیکھی گئی جبکہ لباس، حلیے اور بعض دوسرے معاملات میں بھی رعائتیں دیکھنے کو ملیں اس کے برعکس پاکستانی طالبان نے ان ایشوز پر نہ صرف سخت ترین رویہ اپنایا بلکہ خلاف ورزی کرنے پر متعدد افراد کو ہلاک بھی کیا۔ مثال کے طور پر جنوری 2009ء میں سوات کے علاقے مٹہ میں ایک وکیل کو محض اس وجہ سے ہلاک کیا گیا کہ اس نے شلوار کے پائنچوں کو طالبان کے حکم کے برعکس متعین کردہ جگہ سے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس طرح کے دوسرے واقعات بھی گاہے بگاہے رونما ہوتے رہے۔

ذبح کرنے، سرعام گولیاں مارنے، جرگوں، مساجد کو نشانہ بنانے، لاشوں کی بے حرمتی کرنے اور عام لوگوں کو ہلاک کرنے کے واقعات نے جہاں ایک طرف طالبان کے تشدد

کے باعث بدترین خوف و ہراس کا ماحول بنایا وہاں ان کے حامیوں میں بھی بے چینی کی لہر دوڑادی۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ طالبان کی جانب سے بعض واقعات اور کارروائیوں کے بعد آنے والے ردعمل کے دوران نہ صرف یہ کہ متعدد ایسے اقدامات کی مذمت سامنے آتی رہی بلکہ متعدد بار (خصوصاً سوات میں) ان کی جانب سے یہ الزام بھی لگایا جاتا رہا کہ فلاں واقعے سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ فورسز اور خفیہ ادارے خود ایسا کر کے طالبان کو بدنام کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں تاکہ طالبان کے لیے عوام کی حمایت کو کم کیا جاسکے اور طالبان کو ظالم قرار دیا جائے۔ متعدد سکولوں، ہسپتالوں، پلوں اور دوسری سرکاری عمارتوں کو اڑانے سے بھی طالبان گاہے بگاہے لاعلمی کا اظہار کرتے گئے۔ طالبان بعض مواقع پر مخالفین یہاں تک کہ اے این پی کے عہدیداروں اور ارکان اسمبلی کے خلاف بعض کارروائیوں سے بھی لاتعلقی کا اظہار کرتے رہے۔ کسی اہم شخص کے خلاف کارروائی ہوئی تو طالبان کے کمانڈروں نے نہ صرف لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ پیغام بھجوا کر متاثرہ شخص سے ہمدردی بھی جتائی۔ متعدد واقعات کے بعد خفیہ اداروں یا بیرونی ہاتھ کے ملوث ہونے کے اشارے کیے گئے۔ تاہم ریاست نے کوئی سنجیدہ نوٹس نہیں لیا۔

یہ افغانستان کے طالبان کی نرم اور معتدل پالیسی ہی کا نتیجہ ہے کہ عوام کا ایک بڑا حصہ ان کی حمایت کرتا رہا ہے جبکہ ادھر پاکستان کی عوام محض خوف اور دباؤ کا باعث طالبان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ افغانستان کے طالبان نے حکومت سے اختلاف کے باوجود ملکی سلامتی اور ساکھ کو کبھی داؤ پر نہیں لگایا بلکہ ان کے متعدد رہنماؤں اور حامیوں نے گزشتہ انتخابات میں حصہ بھی لیا جبکہ پاکستانی طالبان کی نظر میں جمہوری اور پارلیمانی نظام کفر کے مترادف ہے اسی پس منظر کے ہوتے ہوئے انتہاپسند قوتوں نے جہادی ریاستی اداروں اور افراد کے ساتھ مل کر بے نظیر بھٹو جیسی شخصیت کو الیکشن مہم کے دوران شہید کر کے راستے سے ہٹا دیا۔ افغانستان کے طالبان میں مولوی عبدالسلام راکٹی، سابق وزیر خارجہ متوکل اور ان جیسے کئی معتدل مزاج رہنما بھی شامل رہے ہیں تاہم پاکستانی طالبان کی نظر میں اعتدال پسندی غداری کے زمرے میں آتی ہے اور ان کے خیال میں اعتدال پسند افراد کے لیے طالبان کی صفوں میں کوئی جگہ

نہیں ہے۔ اسی طرح افغانستان کے طالبان غیرملکیوں پر انحصار کرنے کے بجائے کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم پاس رکھتے آئے ہیں جبکہ پاکستانی طالبان غیرملکی کمانڈرز پر نہ صرف انحصار کرتے ہیں بلکہ ان کی پلاننگ اور فیصلوں کو بھی آگے بڑھاتے ہیں۔ایک محتاط اندازے کے مطابق وزیرستان اور بعض دوسرے علاقوں میں امریکی ڈرون حملوں کے نتیجے میں اب تک 18 سے زائد القاعدہ کمانڈرز کونشانہ بنایا جاچکا ہے۔ان کی موجودگی اور ہلاکت اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ غیرملکی کمانڈرز اور جنگجو نہ صرف پاکستان میں موجود ہیں بلکہ وہ طالبان کے استادوں اور منصوبہ سازوں کا کردار ادا کرنے کے علاوہ آپریشنل ذمہ داریاں بھی نبھاتے ہیں۔

افغان طالبان پاکستانی طالبان کی طرح فرقہ وارانہ معاملات میں بڑے پیمانے پر کبھی ملوث نہیں رہے حالانکہ شیعہ آبادی نہ صرف طالبان کی کھلی مخالفت کرتی رہی ہے بلکہ طالبان کی حقیقی اپوزیشن یعنی شمالی اتحاد جہاں شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے ازبک اور تاجک باشندوں کی نمائندگی کرتا ہے وہاں ایران فیکٹر کے باعث طالبان کے لیے انتہائی ناپسندیدہ بھی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں شیعہ مسلک کی تنظیموں، افراد اور لوگوں کے خلاف نہ صرف بے شمار کارروائیاں کی گئیں سینکڑوں افراد کو ہلاک کردیا گیا بلکہ شیعہ دشمنی پاکستانی طالبان کی بنیاد میں شامل ہے۔

بنیادی طور پر اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کے طالبان افغانی طالبان سے زیادہ سخت، پرتشدد اور جارح ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ایک ہی طرز فکر کے حامل ان طالبان میں بنیادی فرق جنگ کے قواعد وضوابط اور بنیادی ایشو کا بھی ہے۔افغان طالبان نے جنگ اور مخالفین کے لیے ایک منظم سیاسی، عسکری قوت کی طرح قوانین اور اہداف مقرر کررکھے ہیں اور وہ ان قوانین پر چل کر ہی مزاحمت کررہے ہیں جبکہ پاکستانی عسکریت پسند جنگ اور مخالفین کے معاملے پر اس قسم کے کسی فارمولے یا ضابطۂ اخلاق سے محروم چلے آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پاکستانی طالبان کسی خاص ٹارگٹ کے بجائے بیک وقت امریکہ، پاکستانی فورسز، سیاسی قوتوں، جمہوری اداروں، مخالف مسالک اور یہاں تک کہ معصوم شہریوں کے خلاف سخت ترین کارروائیوں میں مصروف عمل رہتے ہوئے آگے بڑھتے جارہے ہیں۔

افغانستان کے طالبان مرکزی شوریٰ کے فیصلوں کا ہمیشہ ایک مربوط تنظیمی نظام کے تحت احترام کرتے ہیں اور کمانڈروں میں سے ہر ایک اس بات کا پابند اور جوابدہ ہوتا ہے کہ وہ مرکزی شوریٰ یا سپریم کمانڈر کے فیصلوں، احکامات پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کے طالبان اس قسم کا کوئی مؤثر تنظیمی ڈھانچہ نہیں رکھتے۔ پاکستانی طالبان بعض بڑے اہداف اور مقاصد پر مشترکہ لائحہ عمل اپنانے کے سوا دوسرے معاملات میں مقامی فیصلوں اور اقدامات کی روشنی میں اپنے اپنے نیٹ ورک چلا رہے ہیں۔ یہ لوگ متعدد بار ایک دوسرے کے خلاف بھی نہ صرف مورچہ زن ہوئے بلکہ باہمی جھگڑوں کے باعث بے شمار لوگ بھی لقمہ اجل بن گئے۔ اس ضمن میں بیت اللہ محسود اور حاجی نذیر کے علاوہ خیبر ایجنسی میں دو متحارب گروپوں کے باہمی جھگڑوں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن کے نتیجے میں متعدد اہم کمانڈر اور بے شمار کارکن زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

افغانستان کے طالبان مسلکی معاملے پر بھی پاکستانیوں کے برعکس بہت واضح سوچ اور پالیسی رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان کبھی بھی اس معاملے پر کشیدگی یا اختلاف دیکھنے کو نہیں ملا تاہم پاکستانی طالبان کے مختلف گروپ مختلف مسالک اور فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی بنیادی چیز ان کو اس سطح پر متحد نہیں ہونے دے رہی جس کی ان کو اپنی قوت مجتمع کرنے کے لیے ضرورت ہے۔

افغانی طالبان نے اپنے دور اقتدار میں اپنی شوریٰ فوجی نظام اور حکومتی سیٹ اپ کے دوران اہم عہدوں کے لیے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ مشکوک کردار یا منفی ریکارڈ رکھنے والے کسی شخص کو اہم ذمہ داری نہ سونپی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور اقتدار اور تحریک کے دوران نہ صرف امن وامان اور انصاف کے معاملے پر کئی بہتر نتائج دیکھنے کو ملے بلکہ جرائم پیشہ، منشیات فروش اور دوسرے مشکوک گروہوں، افراد کے گرد بھی گھیرا تنگ کیا گیا اس کے برعکس پاکستانی طالبان تنظیموں میں اس اہم معاملے کو بری طرح نظرانداز کیا گیا۔ پاکستانی عسکریت پسندوں کی صفوں میں معاشرے کے بعض مشکوک متنازعہ اور برے لوگ بھی داخل ہوئے جبکہ کچھ لیڈروں کا بھی ماضی صاف نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک اور مزاحمت کے دوران ایسے عناصر کی وجہ سے طالبان کی شہرت یا نیک نامی میں اضافے کے بجائے کمی

واقع ہوگئی۔ بے شمار جرائم پیشہ گروپ یا افراد طالبان کی صفوں میں گھس گئے اور ان کو محض اس وجہ سے اپنے ساتھ رکھا گیا کہ طالبان کی حمایت یا تعداد میں اضافہ ہو لیکن پھر انہیں مجرمانہ ذہنیت سے روکنے کے احکامات بھی جاری کرنا پڑے۔

افغانستان کے طالبان بعض ایشوز پر قوم پرست بن کر سامنے آئے جبکہ ان کے اندر خود احتسابی کا ایک نظام بھی موجود رہا تاہم پاکستانی طالبان نے قوم پرستی کی حامل قوتوں کو دشمن نمبر ایک قرار دے کر ان کو بدترین انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا جبکہ ان کے اندر خود احتسابی یا جوابدہی کا نظام بھی قائم نہ ہوسکا۔ ان چند چیدہ چیدہ نکات سے پاکستانی اور افغانی طالبان گروپوں کے فرق کو واضح کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکستانی عسکریت پسند زیادہ خطرناک اور پرتشدد ہیں۔ ان کی نہ صرف تنظیموں اور گروپوں کی تعداد زیادہ ہے بلکہ ان کے آپس کے تنازعات اور اختلافات بھی بہت سے مسائل کو جنم دینے کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو متحد رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لیے ماضی قریب میں ملا عمر، جلال الدین حقانی، ملا داد اللہ اور بعض دوسرے اہم رہنما وقتاً فوقتاً وزیرستان آتے رہے لیکن انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

پاکستان کے قبائلی علاقوں میں زیرِتعلیم عام بچوں کی حالت زار۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب 11

فنون لطیفہ پر پابندیوں سے طالبانائزیشن کی ابتدا

فنون لطیفہ کی مختلف شکلیں کسی بھی قوم کی ثقافتی اور تہذیبی شناخت ہوتی ہیں۔ یہی وہ شناخت ہے جو ایک تسلسل میں آگے بڑھتے ہوئے تاریخ کا حصہ بنتی جاتی ہے اور پھر آنے والی نسلوں کو اپنے ماضی کی شاندار روایات سے آشنا کرتی اور مستقبل کے خدوخال بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

پشتون بھی ایک تاریخی ثقافتی پہچان کے مالک ہیں۔ جس کے ایک پہلو ادب میں اگر رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک جیسے لوگ ہیں جن کی روایت کو حمزہ شنواری، غنی خان، اجمل خٹک اور قلندر مومند جیسے لوگوں نے آگے بڑھایا ہے۔ عوام کو شعور اور ماضی کی روایات میں ہم آہنگی کے ساتھ راستوں کا تعین دیا ہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ رحمان بابا کے مزار کو بموں سے اڑانے کی کوشش کی گئی کہ کوئی ان کے مزار پر پھولوں کی چادر نہ بچھا سکے۔ کیونکہ ان کے نظریات اس کی اجازت نہیں دیتے۔

لیکن ایک اور سچ تو یہ بھی ہے کہ...... قدامت پرستی اور انتہاپسندی ہر اس چیز کی نفی کرتی ہے جو اجتماعی معاشرتی شعور کے ارتقاء کا باعث ہو جو عوام کو نئے اور جدید نظریات سے ہم آہنگ ہو کر چلنا سکھاتی ہو۔ وقت اور حالات کے ادراک کے ساتھ مستقبل کی طرف دیکھنے پر مائل کرتی ہو۔ یہی وہ نکتہ ہے کہ جس میں ثقافتی اور تہذیبی اقدار کو بھی ایک مخصوص سانچے

میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اگر ایسا ممکن دکھائی نہ دیتا ہو تو اس کو مٹا دینے کے لیے طاقت کے استعمال سے دریغ بھی نہیں کیا جاتا۔

ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ......مذہب نے کون سی حدود و قیود مقرر کی ہیں اور جو کچھ مذہب بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس میں قبائلی روایات کتنی ہیں اور وہ کونسی روایات ہیں جن کو مذہب کا حصہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن جو کچھ کہا جاتا ہے وہ مذہب کا حصہ نہیں ہے۔ مذہب معاشرتی اور ثقافتی روایات پر اس وقت تک کوئی پابندی عائد نہیں کرتا جب تک وہ مجموعی تاثر میں معاشرے کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں سب سے پہلا حملہ ہی انہی اقدار پر ہوا تھا جن کی چیخیں آج بھی سنائی دیتی ہیں۔

2002ء کے بعد قبائلی علاقہ جات اور 2006ء کے بعد صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع میں تشدد پسند طالبان اور عسکریت پسند گروپوں کے جو عناصر معاشرے میں پھیل گئے انہوں نے افغانستان کے طالبان جیسا طرزِ عمل اپناتے ہوئے فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی، ڈرامے اور فلم کے شعبوں کو سخت ترین کارروائیوں کا نشانہ بنا کر ان شعبوں سے متعلقہ افراد کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی پالیسی اپنائی۔ دوسری طرف صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ جات میں سی ڈیز کی ایک ایسی قسم متعارف کرائی گئی جس کے ذریعے عسکریت پسندوں، مجاہدین اور طالبان کے کارناموں کے علاوہ ان کی کارروائیوں کو مؤثر انداز میں متعارف کروا کر پرامن اور تعلیم یافتہ لوگوں کو ہراساں کیا جاتا رہا۔

2002ء میں جب صوبہ سرحد میں امریکہ مخالف جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایم ایم اے کی اکثریتی صوبائی حکومت قائم کی گئی تو اس حکومت نے دوسرے انتہاپسندانہ اقدامات کے علاوہ صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور کے واحد تفریحی ہال نشتر ہال کو تالے لگا کر تمام سٹیج شوز، موسیقی کے پروگرامز اور دوسری تفریحی تقریبات کے انعقاد پر غیر علانیہ پابندی لگا دی۔ اس اقدام سے صوبہ سرحد کے درجنوں فنکار، پروڈیوسرز، موسیقار اور گلوکار آمدنی کے ایک مستقل ذریعے اور عوام تفریح کے مواقع سے یکسر محروم ہو گئے۔ نشتر ہال میں 2002ء سے لے کر 2008ء تک کوئی بھی شو پیش نہیں کیا جا سکا۔ حالت یہ تھی کہ ایم ایم اے کے دور حکومت میں محکمہ ثقافت ہی کو ختم کر کے رکھ دیا گیا اور اس اہم شعبے کے لیے کسی وزیر کو کابینہ میں نہیں رکھا

گیا۔

انہی سالوں کے دوران جب وزیرستان میں طالبان کا ظہور ہوا تو ان لوگوں نے ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈز، ڈش انٹینا اور سی ڈیز پر سخت پابندی عائد کرنے کے علاوہ گاڑیوں میں ٹیپ ریکارڈ لگانے والوں کو سزائیں بھی دینا شروع کر دیں اسی پالیسی کی تقلید میں ایم ایم اے کی صوبائی حکومت نے 2004ء کو پبلک ٹرانسپورٹ میں سے ٹیپ ریکارڈز اور ٹی وی سیٹ نکالنے کے سخت احکامات جاری کیے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی تصاویر والے سائن بورڈز اور سنیما گھروں سے بورڈ بھی ہٹا دیئے گئے جس کے باعث متعدد ملٹی نیشنل کمپنیوں نے حکومت پاکستان سے شدید احتجاج کیا اور صوبہ سرحد کے لیے متعدد عالمی مالیاتی اداروں کی امداد بھی بند کر دی گئی۔ اس صورتحال نے صوبہ سرحد اور فاٹا میں ثقافتی سرگرمیوں کو جرم اور کفر میں تبدیل کر کے پشتون ثقافت کو بہت بڑے نقصان سے دوچار کر دیا۔

ایم ایم اے کی حکومت نے پولیس کے ذریعے بعض نامور گلوکاروں کو ہراساں کر کے ان کو اظہارِ فن سے لاتعلقی پر مجبور کیا۔ پشتو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکاروں خیال محمد اور گلزار عالم کے دفاتر اور گھروں پر چھاپے مارے گئے۔ فنون لطیفہ کے تاریخی مرکز ڈبگری گارڈن میں 15 سے زائد گلوکاروں اور موسیقاروں کے آلات سڑکوں پر پھینکے گئے جبکہ گلزار عالم کے گھر پر چھاپہ مار کر اسکے دو صاحبزادوں کو دو دن تک زیر حراست رکھا گیا۔ قمر گلہ اور شاہ ولی جیسے نامور گلوکار امریکہ اور کینیڈا منتقل ہو گئے جبکہ سردار علی ٹکر اور نغمہ جیسے گلوکاروں کو پشاور سے ہجرت کر کے اسلام آباد جانے پر مجبور کر دیا گیا۔

سٹیج اور ٹی وی فنکاروں نے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے متبادل کے طور پر سی ڈی ڈرامے بنانے شروع کیے جن کے لیے صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، افغانستان اور مڈل ایسٹ میں اتنی بڑی مارکیٹ بن گئی کہ پشتو فلموں کا ریکارڈ بھی ٹوٹ گیا۔ پرائیڈ آف پرفارمنس اسماعیل شاہد، عمر گل، طارق جمال، آصف خان، جہانگیر خان، ارباز خان، سید رحمان شینو، عالم زیب مجاہد، ڈاکٹر نیاز علی، افتخار قیصر اور سلطان حسین کے علاوہ سی ڈیز کے شعبے میں ایک درجن کے قریب فنکارائیں بھی کام میں مصروف ہو گئیں۔ تاہم یہ سلسلہ بھی اس وقت ختم ہو کر رہ گیا جب طالبانائزیشن نے 2007ء کے اواخر میں وادی پشاور کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ عسکریت

پسندوں نے سی ڈی کے مشہور مرکز اور (مقامی رائل پارک) نشتر آباد کی متعدد دکانوں کو بم لگا کر پولیس کی ناک کے نیچے اڑا دیا اور متعدد دکانداروں اور فنکاروں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔

صوبہ سرحد میں فروری 2008ء کے بعد جب اے این پی اور پی پی پی کی حکومت قائم ہوئی تو فنکاروں اور گلوکاروں کے خلاف کارروائیوں میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا اور یوں درجنوں فنکار فاقہ کشی کے علاوہ اپنی سلامتی کے مسئلے سے بھی دوچار ہو گئے۔

قابل تشویش بات یہ تھی کہ اے این پی کی غیر معمولی دلچسپی اور وزیراعلیٰ کے اعلانات کے بعد نشتر ہال کو تو کھولا گیا تاہم یہاں پر ابتدائی ماہ کے دوران محض تین ہی پروگرامز بندوقوں کے سائے میں منعقد کیے جاسکے۔ لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود اس ہال میں کوئی ثقافتی پروگرام منعقد نہ ہو سکا۔

تعلیم یافتہ اور مقبول زمانہ گلوکار گلزار عالم کا کہنا تھا ''اے این پی کی حکومت کے باوجود صوبہ سرحد میں فنون لطیفہ خصوصاً سٹیج اور موسیقی کے حوالے سے کوئی بہتری نہیں آئی۔ مجھے ایم ایم اے دور حکومت میں صوبہ سے باہر رہنے پر مجبور کیا گیا۔ مجھ سے زبردستی داڑھی رکھوائی گئی اور 20 ممالک میں فن کا اظہار کرنے کے باوجود مجھے اس قدر مجبور ہونا پڑا کہ پشاور میں کباب کا ہوٹل اور بعدازاں کراچی میں ٹیکسی چلا کر اپنے 9 بچوں کا پیٹ پالنا پڑا۔ پی ایچ ڈی ہولڈر گلوکار ہارون باچا کو امریکہ جا کر پناہ لینا پڑی جبکہ مجھ پر کئی قاتلانہ حملے کیے گئے۔ اے این پی اور پی پی پی کی حکومت قائم ہوئی تو میں کراچی میں تھا۔ وزیراعلیٰ سرحد حیدر خان ہوتی اور متعدد وزراء نے بذات خود رابطے کر کے مجھے پشاور بلایا کیونکہ میں ولی خان، ڈاکٹر نجیب اللہ، اسفند یار اور دوسرے قوم پرست لیڈروں کے بہت قریب رہا ہوں جبکہ افراسیاب خٹک میرے رشتہ داروں میں سے ہیں تاہم پشاور آ کر بہت پچھتایا۔ یہاں حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے تھے اس لیے میں نے پیٹ پالنے کے لیے پھر سے نقل مکانی کا راستہ اپنایا۔''

گلزار عالم کا کہنا تھا کہ ان پر دسمبر 2008ء میں ورسک روڈ پر دن کے 11 بجے فائرنگ کی گئی۔ تاہم مقامی پولیس ان کی رپورٹ بھی درج کرنے سے انکاری تھی۔ 400 سے زائد آڈیو البمز کرنے والے اس گلوکار کو 2001ء کے بعد شدید مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔

دسمبر 2008ء ہی کو پی ٹی وی کے ایوارڈ یافتہ اداکار ارشد حسین کو پشاور سنٹر سے

مردان جاتے ہوئے مردان کی حدود میں اغوا کیا گیا۔ ان کو 6 روز بعد تاوان ادا کر کے بازیاب کرایا گیا۔ ارشد حسین ذہنی اذیت کا شکار رہا کیونکہ اس کی ملازمت اس سے محض اس وجہ سے چھن گئی کہ ایک غیر ملکی این جی او کے مطابق ان کی موجودگی ادارے کے لیے نقصان کا سبب بن رہی تھی۔

دسمبر 2008ء کے پہلے ہفتے کے دوران 200 سے زائد پشتو، اردو اور پنجابی فلمیں پروڈیوس کرنے اور تین سینماؤں کے مالک لالہ سردار خان کے پروڈیوسر بیٹے تنویر خان کو پشاور میں چارسدہ روڈ سے قیمتی گاڑی سمیت اغوا کیا گیا اور رہائی کے بدلے کروڑوں روپے کا تاوان طلب کیا گیا۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں تھانہ ملاکنڈ ایجنسی سے تعلق رکھنے والے نوجوان گلوکار سردار یوسف زئی پر اس وقت ملاکنڈ میں فائرنگ کی گئی جب وہ دیر سے اپنی ٹیم کے ہمراہ تھانہ آ رہے تھے حملے میں نامور طبلہ نواز انور خان ہلاک ہوگیا جبکہ سردار زخمی ہوگیا اور علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ اس سے قبل ''پہلے تو کبھی کبھی غم تھا'' فیم سانگ کے اصلی گلوکار ہارون باچا (پی ایچ ڈی) مسلسل دھمکیوں کے بعد موسیقی سے ناطہ ختم کر کے امریکہ شفٹ ہوگئے حالانکہ وہ آئی ایس آئی کے نامور کردار میجر (ر) عامر کے سگے بھانجے ہیں اور بڑے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

جنوری 2009ء کے پہلے ہفتے کے دوران سوات کے شہر مینگورہ میں شبانہ نامی سی ڈی آرٹسٹ کو بے دردی سے قتل کیا گیا جبکہ 13 جنوری 2009ء کو پشاور ٹی وی اور سٹیج کے اداکار عالم زیب مجاہد کو دن دہاڑے حیات آباد سے اس وقت اغوا کر کے خیبر ایجنسی لے جا کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا جب وہ اپنی گاڑی پارک کر رہا تھا۔ عالم زیب مجاہد اب تک 300 سے زائد ڈراموں میں پرفارم کر چکا تھا۔ اس کو خیبر ایجنسی کی ایک مذہبی تنظیم کی اس شرط پر رہائی دلائی گئی کہ وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ 40 دن لگائے گا اور آئندہ سے شوبز میں آنے کا ارادہ بھی نہیں کرے گا۔

پشاور میں فن کاروں اور گلوکاروں کی بے بسی کا یہ عالم رہا ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن جیسے مضبوط ریاستی ادارے نے عید کے شوز پشاور کی بجائے ایبٹ آباد جا کر ریکارڈ کیے کیونکہ پی ٹی وی کو بھی موسیقی کے پروگرام ریکارڈ نہ کرنے کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ پشاور میں آڈیو

البمز کی ریکارڈنگ اور مارکیٹنگ کا سلسلہ ختم ہوکر رہ گیا ہے جس کے باعث آڈیوسٹوڈیوز اور بڑی دکانوں سمیت سینکڑوں کی تعداد میں آڈیو اور سی ڈی دکانیں بند ہونے کے قریب پہنچ گئیں۔ اس سے قبل پشاور، کوہاٹ، بنوں، مردان اور مینگورہ سے ہر سال 80 سے لے کر 150 تک نئی آڈیو البمز اور 50 سے 100 تک ویڈیو البمز اور ڈرامے تیار ہوکر شائقین کو تفریح فراہم کرتے تھے۔ اس کاروبار سے ہزاروں افراد کا روزگار وابستہ تھا جو کہ اب ختم ہونے کو ہے۔ اس صورتحال نے پشتو فلم کے کاروبار کو بھی بری طرح متاثر کیا کیونکہ ایک تو صوبہ سرحد میں کہیں پر بھی شوٹنگ کی گنجائش نہیں رہی۔ دوسرا یہ کہ امن وامان کی بدترین صورتحال کے باعث عوام سنیماؤں اور سی ڈی شاپس کا رخ کرنے کا رسک نہیں لے سکتے حالانکہ گزشتہ 9 سال کے دوران پاکستان فلم انڈسٹری میں پنجابی کے بعد پشتو فلمیں تعداد کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر بنائی گئیں۔ اس وقت پشاور کی سی ڈی مارکیٹ پر ان گروپوں کی سی ڈیز اور آڈیو کیسٹس کا قبضہ ہے جو کہ طالبان اور دوسری جہادی تنظیموں کے متعلقہ شعبوں کے زیرانتظام ہزاروں کی تعداد میں تیار کی جارہی ہیں اور جن میں جہاد کی ترغیب دینے کے علاوہ جنگی کارناموں اور پرتشدد واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ دوسرے اضلاع کی حالت تو یہ ہے کہ وہاں پر لوگ اپنی دکانوں، گاڑیوں اور ہوٹلوں میں موسیقی سننے کا رسک بھی نہیں لے سکتے۔ مختصراً یہ کہ صوبہ سرحد میں طالبانائزیشن کی ابتداء ثقافت سے متعلقہ لوگوں کے خلاف کارروائی سے کی گئی تھی۔ جس کے نتائج فنکاروں کی بھوک اور بیماری، بے روزگاری اور لاچاری کی شکل میں سامنے آچکے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اے این پی اور پی پی پی کی مخلوط حکومت کے قیام سے جس تبدیلی کی امیدیں پیدا ہوئی تھیں وہ بھی خاک میں مل گئی ہیں۔ خصوصاً اے این پی کی طرف سے سوات کو طالبان کے حوالے کرنے کے بعد تو تمام امکانات معدوم ہوگئے ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ سوات کو ماڈل بنا کر نظام عدل یا 'طالبان ازم' کو صوبہ سرحد کے دیگر علاقوں میں بھی وسعت دی جائے گی۔

باب 12

مذہبی انتہاپسندی اور جہادی میڈیا

جدید دنیا میں میڈیا کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ایک زمانہ تھا جب اس کو محض 'جنگی ہتھیار' کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا تھا۔لڑنے والوں کی جرأت و بہادری کی داستانیں اور قربانیاں اور فتوحات کے چرچے ہوا کرتے تھے جن میں دشمنوں کی کمزوریوں اور شکست کے ساتھ پسپائیاں اور اس کے بالمقابل اپنی فوجی کارروائیوں کو نہ صرف بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا بلکہ ہر قدم پر پیش رفت کی نشاندہی کی جاتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں اس کے مظاہر کھل کر سامنے آئے۔لیکن اس کے بعد میڈیا میں الیکٹرانک ٹیکنالوجی آ گئی تو پھر اس کے مقاصد و ترجیحات بھی تبدیل ہوگئیں۔الیکٹرانک میڈیا چونکہ لوگوں کے ڈرائنگ روموں سے بھی آگے بیڈروموں تک رسائی حاصل کر چکا تھا اس لیے اس میں پراپیگنڈا کے نئے مقاصد بھی شامل ہوگئے۔اور یہ ایک نیا جنگی ہتھیار بن گیا......جس کا کام ثقافتی اور تہذیبی یلغار کے ساتھ مخالفین کی مجموعی قومی شناخت اور معاشرتی اخلاقیات پر براہ راست حملہ آور ہونا بھی شامل تھا۔کیونکہ وہ قومیں جن کی اپنی شناخت اور پہچان میں رخنہ پڑ جاتا ہے یا پھر اس میں دراڑیں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کمزور ہوتی جاتی ہیں اور ان پر جنگی ہتھیار زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

عالمی سامراج نے افغانستان کی سوویت یونین کے خلاف جنگ میں مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کیا تو اس کے نتیجہ میں ہی مجاہدین اور فلسفہ جہاد کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی تھی

چنانچہ ہم دیکھتے تھے کہ اس جنگ کے دوران بین الاقوامی میڈیا نہ صرف اسلام کا حمایتی تھا بلکہ وہ مجاہدین کے کارناموں کو بھی غیر معمولی انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا رہا تو ادھر پاکستان میں بھی صورتحال کچھ اس سے مختلف نہیں تھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ طالبانائزیشن یا مذہبی انتہاپسندی کے فروغ میں پاکستانی میڈیا اور جہاد کے حامی تجزیہ نگاروں نے بھی اہم ترین کردار ادا کیا۔ پاکستانی میڈیا نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد جہاد کے حق میں مہم چلانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ پہلے تو مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی مبینہ بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج کے ساتھ تعاون کے لیے البدر اور الشمس جیسی جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیموں کے ذریعے سامنے آیا تھا لیکن یہ افغان جہاد کے دوران اپنے نکتہ عروج پر پہنچ گیا۔ جماعت اسلامی سے ہمدردی رکھنے والے صحافیوں اور بعض اخبارات و رسائل نے اس ضمن میں بنیادی کردار ادا کر کے جہادیوں کو نہ صرف یہ کہ غیر معمولی اہمیت اور کوریج سے نوازا بلکہ جہادی کرداروں کے کارناموں کو مؤثر انداز میں افسانوی اور رومانوی انداز دے کر معاشرے خصوصاً نوجوانوں میں جہاد اور مزاحمت کے بارے میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کرنے کا راستہ ہموار کر دیا گیا۔

افغان جنگ کے دران جماعت اسلامی اور پاکستان کے خفیہ اداروں نے اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ میڈیا کے راستے نہ صرف یہ کہ مخالفین کی کردار کشی کی مہم کو مؤثر بنایا جائے بلکہ مجاہدین کے کارناموں کو کچھ اس انداز سے پیش کیا جائے کہ لوگ جہاد کے پس منظر، شرائط، نتائج اور اثرات پر غور و فکر کے بجائے شارٹ کٹ کے ذریعے جہاد کی طرف راغب ہوں۔ اس مقصد میں جہاد کی حامی قوتیں بڑی حد تک کامیاب ہوگئیں اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد عملی جہاد میں بڑے شوق سے حصہ لینے لگی۔ یوں دینی مدارس کے بعد جہادی میڈیا ہی جہاد کی جانب لوگوں کو راغب کرنے کا دوسرا بڑا ذریعہ بن کر سامنے آ گیا۔

پاکستان ٹیلی ویژن، ریڈیو پاکستان اور ٹرسٹ کے اخبارات کے علاوہ درجنوں کی تعداد میں روزناموں اور ماہناموں نے جہاد اور انتہاپسندی کے فروغ سے متعلق ایشوز پر برسوں تک کسی وقفہ کے بغیر بھرپور توجہ دے کر قوم خصوصاً نئی نسل کے ذہنوں میں جہاد کا ایسا بیج بو دیا جس کی فصل نے پاکستان کو واقعتاً ایک انتہاپسند ریاست کے مقام پر لا کھڑا کیا۔

افغانستان کے جہادیوں کی پبلسٹی میں بین الاقوامی میڈیا، بی بی سی کی ریڈیو سروس کا مرکزی کردار رہا کیونکہ وہاں پاکستان کی طرح پرنٹ میڈیا یا ٹیلی ویژن کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں اور افغانیوں کا 80 فیصد انحصار ریڈیو پر تھا۔ یاد رہے کہ اس وقت یہ میڈیا سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے خود جنگ کا ایک حصہ بنا ہوا تھا۔

افغان جہاد کے دوران بائیں بازو کے سیاسی رہنما اور دانشور کھلے عام کہتے رہے کہ بی بی سی نہ صرف یہ کہ افغانیوں کی رائے عامہ تبدیل کرنے کے لیے ان کے مخالفین کے پاس سب سے مؤثر ہتھیار ہے بلکہ یہ ریڈیو افغانستان کی سیاسی تقدیر بدلنے میں بھی خطرناک کردار ادا کرسکتا ہے۔ پاکستان کے بعض بڑے صحافی طالبان کی حمایت میں اس قدر مشہور اور نیک نام ہوئے کہ پشاور کے ایک سینئر صحافی کو ایک پشتون قوم پرست لیڈر نے جرگے کے دوران ہزاروں افراد اور صحافیوں کی موجودگی میں طالبان کا سفیر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

روس کے بارے میں جہادی میڈیا نے انتہائی مہارت کے ساتھ جنگی مظالم، اسلام دشمنی، انسانی اخلاقیات کی پامالی اور دوسرے ایشوز پر ایسی ایسی کہانیاں شائع کیں کہ عام لوگوں کے علاوہ تعلیم یافتہ طبقے بھی روس کو انسانیت، مسلمانوں اور مظلوموں کا سب سے بڑا دشمن قرار دینے لگے۔ عین یہی پالیسی بھارت کے بارے میں بھی اپنائی گئی۔

افغان جہاد کے کاریگر اعظم ڈاکٹر عصام (Azaam) نے ایک ماہر ٹیم کے ذریعے پشاور میں دفاتر قائم کر کے میڈیا کے لیے خصوصی سیل قائم کیے۔ یہ لوگ ہم خیال صحافیوں، تجزیہ نگاروں، اخباری مالکان اور نیوز ایجنسیوں کے ساتھ نہ صرف قریبی رابطہ رکھتے بلکہ انہوں نے پوسٹرز، وال چاکنگ، بینرز، پمفلٹس اور کتابوں کے ذریعے انتہائی مؤثر پراپیگنڈہ کر کے مخالفین کے حواس اڑا کر رکھ دیئے۔ غیر ملکی امداد کے ایک بڑے حصے کو میڈیا کے لیے مختص کیا گیا۔ یکطرفہ پروپیگنڈے نے وہ نتائج دیئے جو کہ عملی جہاد کے ذریعے بھی شاید کہ ممکن نہ تھے جس کے بعد جہادی قوتوں اور گروپوں نے بھی اس کامیاب تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف اوقات میں اسے اپنے حق میں کامیابی سے استعمال کیا۔

افغان مجاہدین اور کشمیری گروپوں کے بعد طالبان، القاعدہ اور پاکستانی عسکریت پسندوں نے بھی میڈیا کو بطور ہتھیار استعمال کر کے خود کو برحق، طاقتور، ناقابل شکست اور

فاتحین کی صورت میں پیش کر کے جہادی ہیروازم کا نیا فارمولا نہ صرف متعارف کروایا بلکہ مطلوبہ نتائج بھی حاصل کر لیے۔

اس کے برعکس لبرل، ڈیموکریٹک اور قوم پرست قوتوں کی کارکردگی یا جوابی کارروائی اس تمام عرصہ کے دوران عملاً نہ ہونے کے برابر رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام یکطرفہ مہم سے متاثر ہوکر نہ صرف جہادیوں کے حامی بن گئے بلکہ وہ جہاد سے متعلق دوسروں کی رائے کو کفر قرار دینے کے رویے کے ایک طرح سے عادی بن گئے۔

ایک رپورٹ کے مطابق 1984ء سے لے کر 1994ء کے دوران پاکستان میں جہاد کی تبلیغ کرنے والے اخبارات اور رسائل کی تعداد 200 سے زائد تھی۔ یہ اخبارات و رسائل پشتو، اردو، فارسی، انگریزی اور عربی زبان میں شائع ہوتے اور ایک مؤثر نیٹ ورک کے ذریعے لاکھوں افراد کے مطالعے کے لیے بھجوائے جاتے تھے۔ اب بھی درجنوں اخبارات اور میگزین لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر جہادیوں کی پبلسٹی کا فریضہ بخوبی انجام دینے میں مصروف ہیں۔

یہ اسی افغان جہاد کا نتیجہ تھا کہ سرکاری سرپرستی میں پاکستانی صحافیوں اور تجزیہ نگاروں میں دو گروپ کچھ ہی عرصے کے دوران نمایاں اور اہم بن کر سامنے آ گئے۔ ایک وہ جہاد کا حامی تھا انہیں سرکاری اور غیر سرکاری سرپرستی میں ایک مستقل پالیسی کے تحت ان کے اداروں میں اہم عہدوں پر فائز کیا گیا اور ان کے ذریعے ایسی ایسی کہانیاں اور رپورٹس شائع کی گئیں جن کے ذریعے جہاں ایک طرف جہادی اسٹیبلشمنٹ کے مقاصد پورے ہو رہے تھے تو دوسری طرف عالمی میڈیا بھی ان کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

آج پاکستان میں جتنے بھی اہم، بڑے اور بارسوخ صحافی اور تجزیہ نگار ہیں بنیادی طور پر وہ افغان اور کشمیر جہاد ہی کی پیداوار ہیں۔ اس ضمن میں لاتعداد قابل ذکر لوگوں کی نہ صرف مثالیں دی جا سکتی ہیں بلکہ یہ لوگ پاکستان کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر اب بھی چھائے ہوئے اور اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ جہاد کے حامی میڈیا نے جہادیوں کی پبلسٹی کے علاوہ ان کے نظریے، مقاصد، ارادوں اور کامیابیوں کی تشہیر میں بھی بھرپور معاونت فراہم کر کے ان کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کیا ہے۔

اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بعد جب انٹرنیٹ اور موبائل کی سہولتیں سامنے آ گئیں تو ان دونوں سہولیات کا بھی جہادی قوتوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ القاعدہ جیسی تنظیم کی پبلسٹی، اعلانات اور دھمکیوں کا اب بھی سب سے بڑا ذریعہ انٹرنیٹ اور موبائل ٹیکنالوجی ہے۔

اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق دنیا میں اس وقت وہابیت اور جہاد کی ترغیب دینے والے ریڈیوز اور ٹیلی ویژن چینلز کی تعداد 200 سے زائد ہے۔ یہ مختلف زبانوں میں اپنے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ اسی انسٹی ٹیوٹ کا دعویٰ ہے کہ جہادی ویب سائٹس کی تعداد ٹی وی چینلز اور ریڈیوز سے بھی زائد ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان چینلز اور ویب سائٹس کو روزانہ کروڑوں افراد دیکھتے اور وزٹ کرتے ہیں اور دیکھنے اور پڑھنے والوں میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی شامل ہیں۔

2007ء کے دوران سی آئی اے کی جاری کردہ ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ جہادی اخبارات، چینلز، ریڈیوز اور ویب سائٹس نہ صرف یہ کہ لوگوں کو اپنے حامی اور ہمنوا بنانے کے علاوہ مختلف عسکری، جہادی تنظیموں کی قیادت اور کمانڈروں کے درمیان محفوظ ترین طریقے سے معلومات کے تبادلے اور کارروائیوں کے پیغامات، احکامات کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ یہ ذرائع عسکریت پسندوں کے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہیں جس سے نمٹنا اب ریاستی اداروں کے بس کی بات بھی نہیں رہی۔ مختلف ممالک کے ہم خیال عسکریت پسند انہی ذرائع کے ذریعے ایک مؤثر فارمولے کے تحت اپنے اہداف، عزائم اور حکمت عملی کو ایک دوسرے کے علم میں لاکر ان سے محفوظ ترین پیغام رسانی کا کام لے لیتے ہیں۔ پاکستان کے بے شمار صحافی اس تمام عرصہ کے دوران افغانی طالبان، حزب اسلامی اور دوسرے گروپوں کی سرگرمیوں، حملوں اور کامیاب کارروائیوں کو پشاور، کوئٹہ اور اسلام آباد میں بیٹھ کر رپورٹ کرتے رہے ہیں۔

پاکستان میں طالبانائزیشن کا سلسلہ شروع ہوا تو طالبان اور ان کے ہم خیال گروپوں نے القاعدہ، جماعت اسلامی، حزب اسلامی اور حزب المجاہدین کی میڈیا پالیسی کی پیروی کرتے ہوئے میڈیا کے تمام ذرائع کو اپنے حق میں استعمال کرکے بہترین نتائج حاصل

کیے۔

ان لوگوں نے محدود پیمانے پر اپنے میڈیا سیل بھی قائم کیے ان کے ذریعے وہ اپنے نظریات کی تشہیر کے علاوہ اطلاعات کے تبادلے اور مخالفین کو ڈرانے دھمکانے جیسے کام بھی لیا کرتے۔ پاکستانی طالبان نے محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے ابتداء میں سی ڈی سسٹم کے ذریعے مخالفین کو مرعوب کرنے اور خوفزدہ کرنے کا فارمولا بڑی کامیابی سے آزمایا۔ فورسز کی گرفتاری کے بعد ان کے انٹرویوز اور ہلاکتوں کی سی ڈیز نے نہ صرف فورسز کا مورال گرایا بلکہ مخالفین اور عوام کے خوف میں بھی اضافہ کا راستہ بھی ہموار کیا۔ سی ڈیز کے ذریعے عسکریت پسندوں کی کامیاب کارروائیوں کو کروڑوں افراد تک پہنچایا گیا۔ اہم کمانڈروں کے طرز زندگی، ان کی تقاریر اور ہدایات کو بھی مؤثر طریقے سے لوگوں تک پہنچایا گیا۔ خودکش حملہ آوروں کی ٹریننگ ان کے بیانات اور متاثر کن خود اعتمادی جیسی چیزوں نے عوامی سطح پر اگر ان کی دہشت اور خوف کا تاثر چھوڑا تو بے شمار لوگ ان کا جذبہ اور ان کی قربانی دیکھ کر متاثر بھی ہوئے۔

پاکستانی عسکریت پسندوں کے پاس اپنی پبلسٹی اور نظریات کی تشہیر کا دوسرا بڑا ذریعہ عالمی میڈیا یا خصوصاً ریڈیو سٹیشن اور پاکستانی اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق سال 2008ء کے دوران پاکستانی فوج کے ترجمان اور دو مختلف وزراء اطلاعات کے مقابلے میں طالبان کے ترجمانوں کے بیانات اور اعلانات کے اخبارات میں چھپنے اور سامنے آنے کی مجموعی تعداد دس فیصد زائد تھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی ریاست اپنے مخالف گروپوں کو کالعدم قرار دیتی ہے تو ان کے لیڈروں یا ترجمانوں کے بیانات پر اس ملک کے ریاستی اور نجی میڈیا پر چھاپنے یا نشر کرنے پر پابندی ہوتی ہے تاہم پاکستان میں اس فارمولے پر عمل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ تو کیوں اس سوال پر شدت سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ 2008ء کے دوران پاکستانی طالبان کے مختلف ترجمان حاجی عمر، مولوی فقیر محمد، حاجی مسلم خان وغیرہ ملکی میڈیا پر چھائے رہے۔ پاکستانی میڈیا ان لوگوں کو غیر معمولی وقت اور کوریج دیتا رہا جبکہ ان کے حامی صحافی اور تجزیہ نگار درجنوں کے حساب سے سینکڑوں مباحثوں، پروگراموں اور انٹرویوز کے دوران ان کا مقدمہ لڑتے رہے۔ اس کے مقابلے میں ریاستی مؤقف یا طالبان کے مخالفوں اور متاثرین کو بیس فیصد نمائندگی بھی

نہیں ملی۔

پاکستانی عسکریت پسندوں کو ابتداء ہی سے ان کے نجی ایف ایم ریڈیوز کی سہولیات میسر رہی ہیں۔ایک اندازے کے مطابق پاکستان کے قبائلی علاقوں کے علاوہ سرحد کے متعدد اضلاع میں 30 کے قریب غیر قانونی ایف ایم ریڈیوز کام کر کے مختلف جہادی گروپوں کے پروپیگنڈے، دھمکیوں، اعلانات اور نظریات کے پرچار کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ان میں لشکر اسلام (خیبرایجنسی) اور مولانا فضل اللہ (سوات) کے ریڈیوز نے حکومت اور مخالفین کے خلاف ایک ایسے مؤثر ہتھیار کا کردار ادا کیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔شورش کے دوران اپنے کمانڈروں اور جنگجوؤں کو کوڈورڈز میں جنگی حکمت عملی سے متعلق ہدایات بھی دی جاتی رہی ہیں۔

مولانا فضل اللہ کے ریڈیو نے تو اتنی شہرت حاصل کی کہ وہ ملکی اور عالمی میڈیا میں ''ملا ریڈیو'' کے نام سے مشہور ہوگئے۔اس ریڈیو کے سامعین میں عام لوگوں اور تحریک کے حامیوں کے علاوہ عسکریت پسندوں کے مخالفین بھی شامل رہے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا موصوف اور ان کے دو اور ساتھی اس پلیٹ فارم کے ذریعے نہ صرف مخالفین کو ڈرا دھمکا کر سنگین نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنے کا انتباہ کر دیتے بلکہ ان کے خلاف ایک چارج شیٹ پیش کر کے بعض کارروائیوں کی ذمہ داری بھی قبول کرتے۔

ان ریڈیوز کے ذریعے اگر ایک طرف علاقے کے عوام کی دینی تربیت کی جاتی اور ان کو جہاد اور مزاحمت پر قائل کرنے کے لیے دلائل دیئے جاتے تو دوسری طرف مخالفین کو سنگین دھمکیاں دینے کے علاوہ ان کو نازیبا القابات اور الفاظ سے بھی تواتر کے ساتھ نوازا جاتا۔

مذکورہ سی ڈیز اور ایف ایم ریڈیوز کے خلاف فورسز، انٹیلی جنس اداروں اور حکومتوں نے کبھی بھی کوئی کارروائی نہیں کی۔تشدد پر مبنی سی ڈیز پشاور کے کارخانو مارکیٹ اور دوسری مارکیٹوں میں ہزاروں کی تعداد میں انتہائی سستے زخوں پر کھلے عام فروخت کی جاتی رہیں مگر ریاستی اداروں نے ان کو اٹھانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ریڈیوز کے بارے میں تو حکومت یا فورسز کی حکمت عملی کا اندازہ ترجمان پاک فوج کے ترجمان ادارے کے اس بیان سے لگایا جا

سکتا ہے کہ ایٹمی قوت کے مالک پاکستان کے پاس ایم ایف ریڈیوز کو جام کرنے کی ٹیکنالوجی موجود نہیں ہے۔(18 فروری 2009ء۔اسلام آباد)

دوسری طرف پاکستانی میڈیا خصوصاً ٹیلی ویژن چینلز پر دہشت گردی، طالبانائزیشن، القاعدہ اور پاک افغان ایشوز پر اکثر ان تجزیہ نگاروں کو تواتر کے ساتھ بلایا جاتا جو کہ یا تو سابقہ ادوار میں خفیہ اداروں کے افسران اور سفارتکار تھے یا پاک فوج کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور یہ تمام لوگ غیر جانبداری کے بجائے القاعدہ اور طالبان کی حمایت اور وکالت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

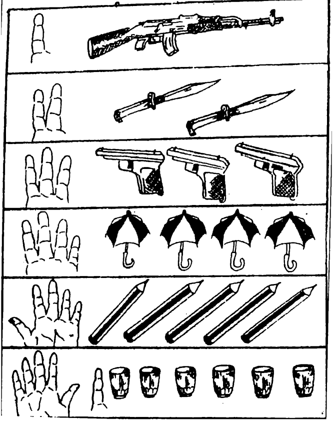

Special Syllabus For Afghan Educational Institutions

- A Allah
- B Battle
- C Cruel
- F Fire
- G Gun
- J *Jehad*
- K Kalashnikov
- M Martyr
- R Russian
- T Tank

باب 13

تشدد کے ماحول میں
اے این پی کا عدم تشدد کا فلسفہ

سیاست عوام کی خدمت کا فریضہ ہے۔ایک عبادت ہے جس میں صلے اور بدلے کی خواہش نہیں ہوتی۔ بہت کچھ لٹانا پڑتا ہے۔اپنی ذاتی زندگی، اپنی مصروفیات، اپنا وقت!! سب کچھ عوام کی بہتری اور ملک کی خدمت کے لیے وقف کرنا پڑتا ہے۔اپنی دولت اور جائیداد بھی سیاسی سرگرمیوں کے لیے مختص کرنا پڑتی ہیں۔

یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے......لیکن تیسری دنیا کے ملکوں میں شاید ایسا نہیں ہوتا۔ سیاست اور مفادات ایک ساتھ چلتے ہیں۔سیاسی جماعتیں بنتی تو نظریاتی بنیادوں پر ہیں۔لیکن تمام نظریے اقتدار کی غلام گردشوں میں کہیں گم ہوجاتے ہیں سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے،صرف اقتدار کی کرسی پر ہی نظر ہوتی ہے۔

کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ......ہر سیاسی جماعت کے قیام کا بنیادی مقصد عوام کی طاقت اور حمایت سے اقتدار تک رسائی حاصل کرنا اور پھر اقتدار و اختیار کی طاقت سے ایسی پالیسیاں وضع کرنا ہوتا ہے جو عوام کی بہتری اور فلاح کے لیے معاون ثابت ہوں۔اسی لیے تو......سیاسی جماعتیں منشور بناتی ہیں، سیاسی پروگرام دیتی ہیں اور پھر جب انتخابات کے ذریعے اقتدار کے امکانات کو نزدیک ترین محسوس کرتی ہیں تو پھر اس کے لیے باقاعدہ ہوم

ورک' بھی کرتی ہیں اور اپنی ترجیحات بھی مرتب کرتی ہیں۔

صوبہ سرحد میں عوامی نیشنل پارٹی طویل سیاسی جدوجہد کی لمبی تاریخ رکھتی ہے اور اس کا ایک سیکولر اور قوم پرستانہ کردار بھی ہے۔ یہی وہ کردار ہے جس کی بنا پر وہ اس صوبے کی سب سے بڑی جماعت کا درجہ رکھتی ہے اور اسے اسی کردار کی بنا پر 2008ء کے انتخابات میں کامیابی دے کر عوام نے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ اس خطے میں پھیل جانے والی انتہاپسندی اور دہشت گردی کا خاتمہ کر کے امن وامان بحال کرے گی۔ لیکن اس نے 'عدم تشدد' کا نعرہ بلند کر کے سوات میں تحریک نفاذ شریعت محمدی اور تحریک طالبان کے ساتھ معاہدہ کر کے جس 'کردار' کی نشاندہی کی ہے وہ اہل فکرودانش میں ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ امن کی تلاش کا یہ آسان راستہ صوبے کے عوام کے ساتھ خود اس کے لیے مستقبل میں کتنی مشکلات کا باعث ہوگا یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ لیکن اس وقت ہم ماضی کی بازگشت سے ابھرنے والی حال کی کچھ صدائیں سناتے ہیں۔

عوامی نیشنل پارٹی کا فلسفہ عدم تشدد صوبہ سرحد اور فاٹا میں انتہاپسند قوتوں کی حوصلہ افزائی اور طاقت کی ایک بڑی وجہ قرار دیا گیا ہے۔ خدائی خدمتگار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان نے جب 1930ء کی دہائی میں اپنی سیاست کی بنیاد رکھی تو انہوں نے اپنے لیے انجمن اصلاح افغانیہ کے نام سے پلیٹ فارم کا انتخاب کیا۔ ابتداء میں یہ بری رسوم کی مخالفت اور تعلیم کے فروغ کا ایک پلیٹ فارم تھا۔ تاہم دوسری جنگ عظیم کے دوران باچا خان نے اس تحریک کو سیاسی جدوجہد میں اس وقت تبدیل کیا جب وہ افغانستان، روس اور بھارت کے سیاسی لیڈروں کے ساتھ رابطوں میں آگئے اور انہوں نے پشتونوں کی آزادی اور حقوق کا سیاسی نعرہ بلند کیا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے عدم تشدد کا فلسفہ اپنایا اور مؤقف اپنایا کہ حقوق کے لیے تشدد کے بجائے پرامن جدوجہد کا راستہ اپنانا زیادہ بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔ ان کے اس فلسفے کو بعض زیرک تجزیہ نگاروں اور دانشوروں نے تنقید کا نشانہ بنایا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پشتونوں کے قومی مزاج اور قبائلی پس منظر کے ہوتے ہوئے عدم تشدد کا فلسفہ ہندوؤں کے لیے تو موزوں ثابت ہوسکتا تھا تاہم اس خطے کے عوام اور یہاں کے ماحول کے لیے یہ راستہ فی الوقت سودمند ثابت نہیں ہوگا کیونکہ پشتون مزاجاً جنگجو اور تشدد پسند تھے۔

باچاخان کے اسی فلسفے نے اگر ایک طرف ان کی تحریک کو ایک مؤثر قوت بنایا تو دوسری طرف ان کے قوم پرست ساتھیوں کو بدترین ریاستی اور سیاسی جبر کی مسلسل صورتحال سے بھی دوچار کیا۔ مثلاً بابڑہ (چارسدہ) میں عبدالقیوم خان کے کہنے پر پرامن جلوس پر گولیاں برسائی گئیں اور نتیجے میں 600 سے زائد خدائی خدمتگار خواتین، بوڑھوں اور بچوں کو بے دردی سے مارا گیا۔ تاریخ میں پہلی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ جن لوگوں کو مارا گیا تھا بعد میں ان کے رشتہ داروں سے ان گولیوں کی قیمت بھی وصول کی گئی جو کہ پولیس نے ان کو ماری تھیں۔ بے شمار لوگوں اور بچوں کو زندہ دریائے کابل میں ڈبو کر ہلاک کیا گیا تو درجنوں کی لاشیں دریا میں بہائی گئیں تاہم بعد میں نہ تو قیوم خان کا کسی نے کچھ بگاڑا اور نہ ہی اپنی حفاظت کے لیے دوسرے اقدامات اٹھانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

یوں اس پارٹی کے بارے میں مشہور ہوا کہ یہ لوگ اپنے کارکنوں کا نہ تو بدلہ لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔ بابڑہ ہی کی طرز پر ہاتھی خیل (بنوں) اور تکر (مردان) سمیت ایسے ہی بے شمار سانحات رونما ہوتے گئے جن میں سینکڑوں خدائی خدمتگاروں کو ہلاک کیا گیا اور ان کی اولاد یا خاندان کے بارے شاہی باغ یا ولی باغ نے بعد میں پوچھنا تک گوارا نہیں کیا۔ یوں پشتونوں کے لیے مخصوص معاشرتی ماحول میں ایک ایسی قوم پرست پارٹی اور اس کی پالیسی کو ہضم کرنا ایک سوال بن کر رہ گیا تھا۔ عدم تشدد کے فلسفے پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا رہا کہ یہ کسی سیاسی تحریک کے لیے مخصوص حالات میں حکمت عملی تو ہوسکتی ہے مگر اس کو پالیسی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

عدم تشدد ہی کے فلسفے کا نتیجہ تھا کہ تحریک آزادی کے دوران جواہرلال نہرو کو صوبہ سرحد کے موقع پر باچاخان کے ہوتے ہوئے ایک بار خیبر ایجنسی (لنڈی کوتل) اور دوسری بار ملاکنڈ میں مسلم لیگیوں نے تشدد کا نشانہ بنایا۔ عدم تشدد کے فلسفے پر باچاخان کے دو صاحبزادوں خان عبدالغنی خان اور خان عبدالولی خان کو بھی وقتاً فوقتاً تحفظات کا اظہار کرتے پایا گیا۔ تاہم ولی خان نے جب اپنے والد کی سیاسی وراثت سنبھالی تو انہوں نے بھی اسی فلسفے کو بنیاد بنا کر اپنی سیاست کو آگے بڑھایا۔ اسی صورتحال نے پشتونوں کی سیاسی قیادت اور قبائلی مشران، معززین کو مخالفین کے لیے آسان ٹارگٹ بنا کر رکھ دیا یہی وجہ ہے کہ 1978ء کی افغان جنگ

کے بعد جب آئی ایس آئی اور سی آئی اے کے زیر اہتمام افغان مجاہدین اور ان کے کمانڈروں کو پشاور لاکر بسایا گیا تو اے این پی کو اپنی مصروفیات اور معمولات چلانے میں بھی شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خان عبدالغفار خان کئی سالوں تک افغان انقلاب کی حمایت سے گریز کرتے دیکھے گئے انہوں نے اس انقلاب پر اس وقت رائے دینی شروع کی جب قوم پرست ببرک کارمل کابل تخت پر بیٹھ گئے۔ اس خاموشی کی وجہ بھی یہی بتائی جاتی رہی کہ ان کو مجاہد کمانڈروں کی جانب سے خوف لاحق تھا۔ ان کمانڈروں کا صوبہ سرحد کی سیاست اور معاملات میں اتنا اثرورسوخ قائم ہوا کہ گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی نے 1988ء اور 1991ء کے انتخابات میں ولی خان کے چارسدہ والے حلقے میں کھل کر ان کی مخالفت کی اور حزب اسلامی کے فنڈز بھی استعمال کیے۔

سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ اگر اے این پی نے اس اہم موڑ پر مجاہدین کی مخالفت کرتے ہوئے صوبہ سرحد خصوصاً پشاور میں ممکنہ مزاحمت کی ہوتی تو افغانستان کے حالات بعد میں اتنے خراب نہیں ہو جاتے اور پشاور عرب اور افغان مجاہدین کے لیے بیس کیمپ کی صورت اختیار نہ کرتا۔ اس عرصے کے دوران اے این پی کی خاموشی نے نہ صرف جہادیوں کے لیے صرف افغانستان کے خلاف بھرتیوں سمیت دوسری کارروائیوں کی کھلی سہولت کا راستہ ہموار کیا بلکہ ان کو یہ موقع بھی فراہم کیا کہ وہ پشاور سمیت صوبہ سرحد اور قبائلی خطے کو اپنے مقاصد اور اپنی سرگرمیوں کے لیے کسی رکاوٹ کے بغیر استعمال کر سکیں۔ اس تمام عرصہ کے دوران مختلف افغان حکمرانوں اور سیاستدانوں کو مسلسل اے این پی سے یہی شکایت رہی کہ اس پارٹی نے افغانستان کے جہادی مخالفین کی اس انداز سے کبھی مخالفت نہیں کی جس کی ان سے توقع کی جا رہی تھی۔ افغان حکمران اس عرصے کے دوران اے این پی کو فنڈز اور اسلحہ دینے پر بھی بار بار اصرار کرتے رہے تاہم اس پارٹی نے انتہا پسندوں اور جہادیوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا اور نتیجے کے طور پر پشاور ان عناصر کا محفوظ اور مضبوط ترین گڑھ بن گیا۔

ایک رپورٹ کے مطابق 82-1981ء کے دوران صرف پشاور میں مجاہد تنظیموں اور ان کے حامیوں کے دفاتر کی تعداد 80 سے زائد تھی۔

اس تمام مدت کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے دوران اے این پی نے قبائل کی سیاست

اور معاملات سے عملاً خود کو الگ رکھا جبکہ بلوچستان کے پشتونوں سے بھی یہ پارٹی لاتعلق رہی۔ ایک وقت میں یہ پارٹی محض وادی پشاور کی سیاست تک محدود رہی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری سیاسی، مذہبی قوتوں خصوصاً جمعیت علمائے اسلام (ف) اور جماعت اسلامی کو مذکورہ پشتون علاقوں میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے مواقع مل گئے۔ یہ پارٹیاں چونکہ جہاد کی حامی تھیں اس لیے انہوں نے جہادی اور انتہاپسند عناصر اور گروپوں کو ہر ممکن تحفظ فراہم کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روشن خیال اور پرامن لوگ بدترین عدم تحفظ کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اس کے برعکس بلوچستان کی پشتون بیلٹ میں پشتون قوم پرست قوت پختونخواہ ملی عوامی پارٹی نے نہ صرف یہ کہ ایک طرح سے عسکری ونگ قائم کیا بلکہ اس پارٹی نے مجاہدین اور بعد میں طالبان کی بھی کھل کر مخالفت کی جس کے سبب کوئٹہ نہ صرف نسبتاً قوم پرستوں کے ہاتھ میں رہا بلکہ چمن کا بارڈر بھی لنڈی کوتل اور طورخم بارڈر کے مقابلے میں نسبتاً کم استعمال ہوتا رہا اور آج بھی بلوچستان کی پشتون بیلٹ کو صوبہ سرحد کی نسبت زیادہ پرامن اور محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ یہ حقیقت اب کھل کر سامنے آچکی ہے کہ پشتونخواہ میپ کا نسبتاً سخت رویہ بعد میں اس پارٹی اور بلوچستان کے پشتونوں کے تحفظ کے معاملے پر اے این پی کے مقابلے میں زیادہ سودمند ثابت ہوا۔

اے این پی کی فاٹا سے لاتعلقی نے قبائل کو ایک طرح سے مذہبی قوتوں اور بعدازاں عسکریت پسندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ یہاں کے عوام نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے مذہبی قوتوں کے ساتھ وابستگی اختیار کر لی اور بعد میں اپنے تحفظ اور خوف کے باعث مقامی اور غیر مقامی طالبان کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اگر اے این پی نے ابتداء میں افغانستان پر اور بعد میں قبائل کے مسئلے پر سخت اور دوٹوک سٹینڈ لیا ہوتا تو صورتحال یکسر مختلف ہوتی۔ اس پارٹی کے پاس 2005ء تک قبائل، بلوچستان اور سندھ کے پشتونوں سے متعلق ایشوز پر کوئی ٹھوس پالیسی ہی نہیں تھی۔ اس کوتاہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تین علاقوں کے پشتونوں نے مایوسی اور مجبوری کے عالم میں دوسرے راستے اختیار کیے اور پھر ایک وقت وہ آ گیا جب 2002ء کے الیکشن میں ایم ایم اے کے امیدواروں نے اے این پی کے امیدواروں کو بدترین اور تاریخی شکست سے دوچار کر کے صوبہ سرحد میں ایک ایسی مضبوط اور اکثریتی حکومت قائم کی جو کہ صوبے میں طالبان طرز کا ایجنڈہ لے کر نہ صرف برسراقتدار آ گئی

بلکہ انہوں نے عملاً اس ایجنڈے کو اپنانے کی پالیسیاں بھی ایک حد تک اپنائیں۔ ایم ایم اے کے اقتدار کے دوران اے این پی کسی مؤثر سیاسی تحریک چلانے یا پارٹی کو منظم بنانے کے بجائے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا رہی۔

پاکستانی حکمرانوں کی طرح اے این پی یہ اندازہ لگانے میں بھی ناکام رہی کہ طالبان کی بڑھتی ہوئی قوت افغانستان میں کسی بھی شکست یا پسپائی کی صورت میں اگر قبائلی بیلٹ میں گھس آئے گی تو اس کے کتنے خطرناک اور منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ اس پارٹی نے دوسرے قوم پرست لیڈروں اجمل خٹک، افضل خان، لطیف آفریدی، افراسیاب خٹک، بسم اللہ خان کاکڑ اور ایسے دوسروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں بھی بڑی غفلت اور بڑی دیر لگا دی۔ اس پارٹی نے بلوچستان کی پشتون بیلٹ پر کوئی توجہ دی اور نہ ہی وہاں کی پشتون نمائندہ قوت پختونخواہ میپ کے ساتھ اتحاد کی کوئی سنجیدہ کوشش کی۔ جبکہ دوسری طرف عسکریت پسند اور ان کی حامی قوتیں نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ رابطوں میں رہیں بلکہ انہوں نے مختلف العقیدہ مذہبی گروہوں کو بڑی کامیابی سے ایم ایم اے کے پلیٹ فارم پر نہ صرف یہ کہ متحد کیا بلکہ 2002ء کے الیکشن میں صوبہ سرحد کو ان کی جھولی میں بھی ڈال دیا۔ اس ناکام پالیسی کا یہ نتیجہ یہ بھی نکلا کہ قوم پرست اور امن پسند عسکریت پسندوں کے مقابلے میں اپنی کوئی دفاعی حکمت عملی بنانے اور اپنانے میں بری طرح ناکام ہوگئے جبکہ دوسری طرف ایم ایم اے کی شکل میں طالبان، القاعدہ اور دوسری عسکری قوتوں کو صوبہ سرحد، فاٹا اور بلوچستان میں عملاً ایک مؤثر اور مضبوط سیاسی پلیٹ فارم اور ریاستی سیٹ اپ میسر آ گیا تھا جس کا ان قوتوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ایم ایم اے کے 5 سالہ دور اقتدار میں قبائل اور صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع میں طالبان نے اپنی جڑیں مضبوط کیں اور 2008ء کے الیکشن کے بعد جب عدم تشدد کی پیروکار اے این پی اقتدار میں آ گئی تو ان قوتوں نے اے این پی کو امریکہ کی حامی سمجھ کر اپنا پہلا ہدف بنا کر دیوار سے لگانا شروع کر دیا۔ اقتدار میں آنے کے بعد ہی اے این پی کو اندازہ ہوگیا کہ اس پارٹی کو کتنے شدید خطرات لاحق ہیں اور یہ کہ اقتدار اس پارٹی کے لیے رحمت کے بجائے زحمت بن کر کتنی مشکلات لے کر آیا ہے۔ پارٹی کے وزراء، لیڈروں، ممبران اسمبلی اور عہدیداروں کے لیے حرکت کرنا ایک مشکل کام بن کر رہ گیا۔ صوبائی حکومت حالات

کو کنٹرول کرنے میں اس کے باوجود ناکام دکھائی دینے لگی کہ پی پی پی کی وفاقی حکومت صوبے کے ساتھ مکمل تعاون کر رہی تھی جبکہ صوبائی حکومت کو بھی غیر معمولی اختیارات حاصل تھے۔ اس صورتحال نے ایک بار پھر عدم تشدد کے روایتی فلسفے کے بارے میں شدید قسم کے تحفظات پیدا کیے۔ غیر علانیہ طور پر یہ فلسفہ اس وقت دم توڑ گیا جب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ حیدر خان ہوتی نے 22 فروری 2009ء کو اپنے کارکنوں اور امن پسند لوگوں میں 30 ہزار خودکار ہتھیار تقسیم کرنے کے فیصلے کا اعلان کیا اور کھلے عام کہہ دیا کہ یہ اسلحہ ان لوگوں کو اپنی حفاظت کے لیے دیا جا رہا ہے۔ ایک نقطہ نظر میں یہ اقدام معاشرے میں مقابلے کی فضا پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ جو کسی بھی وقت خانہ جنگی یا انارکی کا باعث بن سکتا تھا۔ کیونکہ اگر ہتھیار رکھنا پشتون روایت کا حصہ ہے تو اس کو چلانا پشتون مزاج میں بھی شامل ہے۔

بہر حال اس سے قبل اے این پی کے بعض سینئر لیڈروں نے کوشش کی تھی کہ افغان جنگ کے پس منظر کو سامنے رکھ کر دفاعی حکمت عملی کے طور پر ایک عسکری ونگ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس سے قبل پشتون زلمے کے نام سے ایک تنظیم قائم بھی کی گئی تھی جس کے لیے بے شمار کارکنوں کو افغانستان میں تربیت بھی دی گئی تھی تاہم بعد میں اس تنظیم کو فعال نہیں رکھا گیا۔ افغان جنگ سے قبل 1970ء کی دہائی میں قلات میں اس وقت ایک تربیتی کیمپ کا قیام عمل میں لایا گیا جب ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل کی زیر قیادت نیشنل عوامی پارٹی کی صوبائی حکومت کو برطرف کر کے بلوچ قوم پرستوں کے خلاف فوجی آپریشن کا آغاز کیا تھا۔ آپریشن کے عرصہ میں بے شمار بلوچ اور متعدد پشتون رہنما اور کارکن افغانستان چلے گئے انہی میں سے متعدد کو قلات کیمپ میں تربیت دی گئی تھی۔ سینئر قوم پرست لیڈر اس بات کے قائل تھے کہ قوم پرستوں کو عسکری ونگز قائم کرنے چاہئیں۔ تاہم باچا خان اور ولی خان ایسے کسی عمل کے مخالف تھے۔ قلات کیمپ 1979ء تک قائم رہا۔ صوبہ سرحد کے سابق گورنر حیات احمد خان شیر پاؤ پشاور میں قتل کیے گئے تو بھٹو حکومت نے کیمپ کے تربیت یافتہ افراد اور پشتون زلمے تنظیم کے بے شمار افراد کو بدترین تشدد اور ریاستی کارروائیوں کا نشانہ بنایا۔

اے این پی کے برعکس بلوچ قوم پرست پارٹیوں اور پشتونخواہ میپ نے محدود پیمانے پر جو عسکری طرز کی تنظیمیں قائم کیں وہ شورش کے حالات میں فائدے کا سبب بنتے

ہوئے نہ صرف پارٹی لیڈرشپ کے تحفظ کا ذریعہ بنیں بلکہ متعلقہ پارٹیاں ان تنظیموں سے بوقت ضرورت اپنے سیاسی مقاصد کے معاملات پر پریشر گروپ کا کام بھی لیتی رہیں۔

ولی باغ کے بڑوں کو چھوڑ کر باقی جو پشتون قوم پرست لیڈر عسکری ونگز کے مختلف ادوار میں حامی رہے ان میں اجمل خٹک کے علاوہ محمد افضل خان، افراسیاب خٹک، لطیف آفریدی اور بلوچستان کے بسم اللہ خان کاکڑ شامل تھے۔ 1968ء کو قائم کی گئی پشتون طلباء کی تنظیم پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن اے این پی کی ایک ایسی اتحادی قوت رہی جو نظریاتی قوم پرست طلباء کا ایک موثر پلیٹ فارم تھا تاہم اس تنظیم کو ولی باغ کے بڑوں نے اس کے کردار کے حوالے سے بہت محدود رکھا۔ اس کے باوجود اس تنظیم میں تشدد کے حامیوں کی بڑی تعداد وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی۔ یہی وہ تنظیم ہے جس کے پلیٹ فارم سے دوسروں کے علاوہ اسفند یار ولی خان، محمود خان اچکزئی، افراسیاب خٹک، سینئر وزیر بشیر احمد بلور دوسرے وزراء سید عاقل شاہ اور واجد علی خان، ایوب آشاڑے، سردار حسین بابک، زرشید خان، میاں افتخار حسین اور پندرہ سے زائد موجودہ ایم پی ایز نے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ اس تنظیم کے کئی کارکن افغان جہاد کے دوران سرحد کے تعلیمی اداروں میں اسلامی جمعیت طلباء کے ہاتھوں قتل ہوئے اور تنظیم نے مزاحمت کی اجازت بھی مانگی تاہم پارٹی لیڈرشپ نے پرامن رہنے کی پالیسی دہرائی۔

✦……✦……✦

باب 14

نیٹو سپلائی لائن پر حملے اور حکومت کی ناکامی

نائن الیون کے بعد جب دہشت گردی کے خلاف جنگ اور افغانستان پر قبضہ کا فیصلہ ہوا اور پاکستان کی ضرورت و اہمیت بھی اجاگر ہوئی تو اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہوا کہ پاکستان کی 'مدد' کے بغیر اس مہم کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں اس وقت کے امریکی وزیرخارجہ کولن پاؤل نے پرویز مشرف کے ساتھ ٹیلی فون پر بات چیت کی اور مبینہ طور پر پاکستان کو کھنڈرات میں تبدیل کر دینے کی دھمکی دی۔ تو پرویز مشرف نے سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ بلند کرتے ہوئے امریکہ کی مدد کرنے کی حامی بھری۔

اب دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں دیگر فوجی تعاون کے علاوہ افغانستان میں لڑنے والی نیٹو افواج کے لیے ضروری سامان کی فراہمی کے لیے پاکستان کے زمینی راستے استعمال کرنا بھی شامل تھا۔ یہ ایک جغرافیائی حقیقت ہے کہ افغانستان کے اردگرد کہیں بھی سمندر نہیں اور اس کی سمندر تک رسائی ایران یا پاکستان کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایران کے ساتھ تو امریکہ کے تعلقات کشیدہ چلے آ رہے تھے لہٰذا پاکستان ہی ایسا ملک تھا جس کے ساحلوں کو سمندری جہازوں کے پڑاؤ کے لیے استعمال کیا جاتا اور پھر اس کی بندرگاہوں سے ان جہازوں کے ذریعے آنے والے سامان کی افغانستان تک ترسیل ہوتی ویسے ایک اور تاریخی حقیقت تو یہ بھی ہے کہ افغانستان کو پہلے بھی سپلائی کے لیے پاکستان کی بندرگاہیں ہی استعمال ہوتی رہی ہیں جس کے لیے ایک 'ٹریڈ ٹرانزٹ' معاہدہ بھی موجود ہے۔ جس کے لیے

باقاعدہ روٹس بھی مقرر ہیں یہی وہ روٹس ہیں جو نیٹو افواج کو ضروری فوجی اور غیر فوجی سامان کی ترسیل کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ شدت پسندوں کے پے در پے حملوں کی وجہ سے وہ بھی غیر محفوظ ہو گئے اور نیٹو کو کروڑوں ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

2008-9ء کے دوران نیٹو فورسز کو پاکستان کے راستے لاجسٹک سپورٹ کی فراہمی کا سلسلہ عسکریت پسندوں کے پے در پے حملوں کے باعث شدید مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار رہا ہے۔ پاکستانی فورسز نے جنوری کے اوائل میں افغان سرحد سے خیبر ایجنسی میں عسکریت پسندوں اور جرائم پیشہ گروپوں کے خلاف نیٹو، امریکہ اور افغانستان کی مسلسل تشویش اور شکایات کے بعد آپریشن کر کے 126 سے زائد افراد کو حراست میں لے کر نیٹو کی اس سپلائی لائن کو محفوظ بنانے کی کوشش کی تاہم اس کے باوجود اس بات کو مستقل طور پر یقینی نہیں بنایا جاسکا کہ نیٹو اور افغان حکام پاکستانی اقدامات سے مطمئن ہو جاتے۔ آپریشن کے باوجود 7 جنوری سے 14 فروری کے درمیان متعدد ٹینکرز اور کنٹینرز پر پشاور اور خیبر ایجنسی میں حملے کیے گئے۔

پاکستان کے راستے غیر ملکی فورسز کو سپلائی کا سلسلہ باقاعدہ طور پر 2002ء کے آخر میں شروع کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے چمن افغان بارڈر، طورخم افغان بارڈر اور نواپاس (مہمند ایجنسی) افغان بارڈر کو استعمال کیا جاتا رہا۔ نواپاس والی سپلائی لائن کو مہمند اور باجوڑ ایجنسی کے طالبان نے غیر موثر بنا دیا جبکہ چمن افغان بارڈر کو بھی کچھ ہی عرصے میں غیر محفوظ بنا دیا گیا جس کے بعد پشاور اور اس سے ملحقہ خیبر ایجنسی کو واحد مؤثر سپلائی لائن کے طور پر زیر استعمال لایا گیا۔

ابتداء میں کراچی کے علاوہ دوسرے شہروں صوبوں سے براہ راست ہوائی جہازوں کے ذریعے بھی افغانستان سپلائی کی جاتی رہی تاہم انڈس ہائی وے کی بار بار بندش اور درہ آدم خیل، خیبر ایجنسی میں مقامی عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں اور رکاوٹوں کے باعث فیصلہ کیا گیا کہ سپلائی لائن کو محفوظ اور مستقل بنانے کے لیے پشاور میں ٹرمینلز بنائے جائیں اس مقصد کے لیے کوہاٹ روڈ اور باڑہ روڈ سے ملحقہ رنگ روڈ پشاور پر مستقل ٹرمینلز قائم کیے گئے۔ یہاں ٹرمینلز کی تعداد 10 کے قریب تھی ان میں اہم ترین ٹرمینلز کے نام بلال، الفیصل، وینس (Venus)، الفلاح (Alfalah) اور ورلڈ فوڈ، سپلائی لاجسٹک تھے۔ آخرالذکر ٹرمینل تھا جس کے

ذریعے فوجی سازوسامان افغانستان بھیجا جاتا رہا۔ یہ ٹرمینلز 2006ء میں قائم کیے گئے تھے۔ ٹرمینلز کی حفاظت کے لیے ایک نجی ادارے کی خدمات حاصل کی گئیں جو بعدازاں ایک سنگین غلطی ثابت ہوئی اور نتیجے کےطور پر دسمبر 2008ء سے لے کر 14 جنوری 2009ء تک 350 سے زائد کنٹینرز، گاڑیاں اور کروڑوں کا سامان عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مسلسل حملوں کے باعث تباہ و برباد ہوگیا۔ ان حملوں میں 20 سے زائد افراد بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ پاکستان کی بدنامی اور مشکلات کا ایک نیا باب کھل گیا۔

ایک اطلاع کے مطابق نیٹو کی سپلائی لائن کا اربوں کا ٹھیکہ سابق پاکستانی صدر پرویز مشرف کے ایک قریبی رشتہ دار اور ان کے تین ساتھیوں کو دیا گیا۔ اس تمام نظام میں اس پارٹی کے شیئرز کا تناسب 70 فیصد تھا۔ یہ ٹھیکہ اب بھی ان لوگوں کے پاس ہے۔ مرکزی اور ایم ایم اے کی صوبائی حکومت نے ان لوگوں کو ہر ممکن تعاون فراہم کیا تھا۔ اس سلسلے میں سرحد حکومت کے وزیر اطلاعات اور ترجمان میاں افتخار حسین نے بتایا ''یہ بہت عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی نے ایک موقع پر اس سپلائی لائن کے خلاف نہ صرف ایک بڑا مظاہرہ کیا بلکہ اس کی بندش کے لیے باقاعدہ تحریک بھی چلائی حالانکہ اس سپلائی لائن کی منظوری کے وقت ایم ایم اے کی حکومت اس صوبے میں قائم تھی اور ٹرمینلز کی منظوری ان ہی کے دور میں دی گئی تھی۔ اب جاکر ان کو یاد آیا کہ پاکستان اور صوبہ سرحد کے راستے سپلائی نہیں ہونی چاہیے۔'' میاں افتخار کا مزید کہنا تھا کہ ابتداء میں سینکڑوں گاڑیاں اور کنٹینرز اس لیے تباہ کیے گئے کہ اس علاقے کی حفاظت کی ذمہ داری ایک نجی ادارے کی تھی جبکہ دوسری طرف ہمارے لیے یہ کافی مشکل تھا کہ ہم شورش زدہ صوبے میں سپلائی لائن کے لیے فورسز کی بھاری تعیناتی عمل میں لاتے کیونکہ ہمیں دوسرے امور نمٹانے کے لیے بھی پولیس اور ایف سی دستوں کی قلت کا سامنا تھا۔

ٹرمینلز کی جگہ سے کچھ ہی فاصلے پر باڑہ تحصیل کی حدود شروع ہوجاتی ہیں جہاں پر صوبائی حکومت کی عملداری ختم ہوجاتی ہے اور حملے بھی باڑہ اور ایف آر پشاور کے شورش زدہ علاقوں سے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہ سامان پشاور سے گزرتے ہوئے چند ہی کلومیٹر کے بعد خیبر ایجنسی کے راستے پر چلا جاتا ہے۔ ہم صرف ٹرمینلز کی حفاظت کی کوشش کرسکتے ہیں۔

اس سپلائی لائن میں مقامی آبادی کا سب سے بڑا کردار ٹرانسپورٹ کے شعبے میں تھا اور زیادہ تر ٹرانسپورٹرز خیبرایجنسی اور پشاور سے تعلق رکھتے تھے۔ جو گاڑیاں، ٹینکرز اور کنٹینرز استعمال ہوتے رہے ان کی تعداد 700 سے زائد تھی۔

جن میں سے صرف گاڑیوں کی تعداد چھ سو تھی۔ باڑہ سے تعلق رکھنے والے ایک ٹرانسپورٹر نے بتایا کہ اس نے ایک ٹرالر 80 لاکھ میں خریدا جس کی ماہانہ قسط 80 ہزار روپے ادا کرنا پڑتی تھی جبکہ 2007ء میں اس کے ایک آئل ٹینکر کو جو تیل کی سپلائی کے لیے استعمال ہوتا تھا خیبرایجنسی کی حدود میں راکٹ مار کر تباہ کر دیا گیا جس میں ڈرائیور اور کنڈ یکٹر بھی آگ میں جل کر کوئلہ بن گئے تھے۔

گویا اگر کوئی متبادل روٹ ہوتا تو وہ اس پر سفر کرنے کو ترجیح دیتے لیکن چونکہ یہی ایک واحد روٹ رہ گیا تھا اس لیے یہ ایک خطرناک اور مشکل کام ہوگیا جس کی وجہ سے کئی ٹرانسپورٹر اس سپلائی سے علیحدہ ہوگئے۔ دوسرا یہ کہ طالبان ان مالکان کو بھی دھمکیاں دیتے رہتے تھے جن کی گاڑیاں اور ٹرک اس سپلائی لائن کے لیے استعمال ہوتے تھے جبکہ ایک اور تلخ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ خیبرایجنسی کی ایک مذہبی تنظیم ان سے ہر ماہ باقاعدہ معقول رقم بھی لیا کرتی تھی۔

دوسری طرف 2002ء سے لے کر 2005ء تک اس سپلائی لائن کے لیے ریلوے اور این ایل سی کی ٹرانسپورٹ بھی استعمال کی جاتی رہی۔ تاہم فوجی حکومت ٹھیکیداروں کو نوازنے کے لیے نجی ٹرانسپورٹ بھی استعمال کرتی رہی۔

پاک افغان سرحد طورخم پر متعین کسٹم حکام کے مطابق طورخم کے راستے روزانہ 60 سے لے کر 300 تک ٹرالرز، ٹرک اور کنٹینرز افغانستان میں داخل ہوا کرتے تھے۔

یہ سامان طورخم کے راستے جلال آباد اور باگرام ایئربیس کابل لے جایا جاتا تھا۔

غیرملکی فورسز کی رسد کا 60 فیصد انحصار اس سپلائی لائن پر تھا۔

پشاور سے پاک افغان سرحد طورخم 60 کلومیٹر کے فاصلے پر، جلال آباد پاک افغان سرحد سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر ہے جبکہ باگرام ایئربیس طورخم سے 480 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یوں یہ سپلائی لائن سب سے موزوں ترین روٹ سمجھا جاتا رہا۔ تاہم پشاور کے

ٹرمینلز پر حملے اور خیبر ایجنسی میں ٹرانسپورٹ سسٹم پر خطرناک حملوں کے باعث یہ سپلائی لائن شدید خطرات کی زد میں آ گئی۔

نیٹو فورسز فوجی گاڑیوں سے لے کر پانی تک جیسی اشیاء اس سپلائی لائن پر انحصار کرتی رہیں۔ ورلڈ فوڈ اینڈ لاجسٹک ٹرمینل کے ذریعے بھاری فوجی گاڑیاں، بکتر بند گاڑیاں، جیپ، اسلحہ، راکٹ، فوجی جیکٹس اور دوسری اشیاء بھیجی جاتی رہیں۔ دوسری اہم چیز جو کہ یہاں سے ہوتے ہوئے افغانستان جاتی تھی وہ تیل اور پٹرولیم کی مصنوعات تھیں۔ اس مقصد کے لیے جن دو اہم اداروں سے تیل اور دوسری متعلقہ اشیاء کے معاہدے کیے گئے ان میں اٹک آئل ریفائنری اور پیر بابا آئل کمپنی (راولپنڈی) سرفہرست ہے۔ پیر بابا آئل کمپنی پر 2005ء میں خودکش حملے کی کوشش بھی کی گئی تھی جس میں وزیرستان کے عسکریت پسند ملوث تھے۔

جو دوسری اشیاء بھیجی جاتی رہیں ان میں جہازوں اور فوجی گاڑیوں کے پرزے، گندم، چاول، گوشت، میڈیسن، خیمے، وردیاں، جوتے، ڈرنکس، سوفٹ مشروبات اور پانی تک شامل تھا۔

جماعت اسلامی کے صوبائی امیر اور سابق سینئر وزیر سراج الحق کا کہنا تھا کہ لاجسٹک سپورٹ ایگریمنٹ کے وقت صوبائی حکومت کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ ''ہمیں یہ جان کر بہت شرمندگی ہوئی کہ ان گاڑیوں میں پشاور کے راستے سؤر کا گوشت، قیمتی شراب، بعض اخلاق سوز اشیاء یہاں تک کہ قیمتی کتے اور دوسرے جانور بھی بھیجے جاتے تھے۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم اپنی سرزمین اور روٹس کو مسلمانوں کے دشمنوں کے لیے استعمال کرنے پر خاموش رہتے۔ سراج الحق کا یہ بھی کہنا تھا کہ جو لوگ نیٹو کی سپلائی لائن پر حملوں میں ملوث ہیں وہ اسلام دشمنوں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ ہم ان کا بھرپور ساتھ دیں گے۔

پشاور پولیس نے دسمبر 2008ء کو پوش علاقے حیات آباد سے ایک انتہائی مطلوب اور اہم شخص کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا۔ ابتدائی طور پر اس شخص کا نام ہجرت خان بتایا گیا۔ خفیہ اداروں نے سرحد پولیس سے اس شخص کی حوالگی کا مطالبہ کیا تو سی سی پی او صفت غیور نے مؤقف اپنایا کہ صوبائی حکومت کی باقاعدہ اجازت کے بغیر اس شخص کو کسی اور ادارے کے سپرد نہیں کیا جائے گا۔ اس معاملے کو وزیراعلیٰ سرحد حیدر خان ہوتی کے علم میں لایا گیا

جنہوں نے سخت سٹینڈ لے کر پولیس کو اعلیٰ سطحی تفتیش کا حکم دے کر خفیہ اداروں کی ناراضی کو بھی مول لیا۔ دوران تفتیش حیرت انگیز انکشافات سامنے آئے۔ پتہ چلا کہ گرفتار شخص کا اصلی نام محمد مصطفیٰ عرف ہجرت خان ہے۔ یہ شخص طالبان کے دور حکومت میں صوبہ ننگرہار کے ایک علاقے کا کمانڈر (اولسوال ulaswaal) تھا۔ 2002ء کے بعد وہ وزیرستان شفٹ ہوگیا تھا اس دوران اس کو چھاپہ مار کارروائیوں کے لیے چمن افغان بارڈر بھیجا گیا جہاں اس کو یہی ٹاسک دیا گیا کہ وہ نیٹو کی سپلائی کو نشانہ بنا کر معطل کرے۔ اس کام میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوکر بہت شہرت پانے کے بعد وزیرستان واپس آ گیا۔ جہاں پر اس کے سراج الدین حقانی اور بیت اللہ محسود کے ساتھ انتہائی قریبی تعلقات قائم ہوگئے۔ 2007ء میں اس شخص کو جو کہ بنیادی طور پر قندھار کا افغانی ہے تحریک طالبان پاکستان کا اہم کمانڈر بنایا گیا وہ واحد غیر ملکی ہے جس کو تحریک طالبان پاکستان کا آپریشنل کمانڈر بنایا گیا تھا۔

2008ء کے دوران دونوں اطراف کے طالبان کمانڈروں نے اس شخص کو پشاور، درہ آدم خیل اور خیبر ایجنسی میں ٹی ٹی پی کی جانب سے حکومت مخالف کارروائیوں کے لیے منتخب کیا۔ اس نے اپنے ایک قندھاری ساتھی رحمان اللہ اور بیت اللہ محسود کے دو قریبی ساتھیوں کے ساتھ باڑہ خیبر ایجنسی میں بھی ایک ٹھکانہ قائم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے یہاں منتقلی کے بعد مصطفیٰ کامران اور جمشید شنواری کے ناموں سے بھی خود کو متعارف کروایا۔

اس شخص اور اس کے گروپ کے بارے میں سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ مغوی افغان سفیر عبدالخالق فراحی کے اغوا میں بھی ملوث تھے۔ اس دوران نیٹو کی سپلائی لائن پر حملوں کا فیصلہ کیا گیا تو اس شخص کو اس ٹاسک کا کمانڈر مقرر کیا گیا جبکہ رحمان اللہ قندھاری اس کی معاونت کرتا رہا۔

ان کمانڈروں کو 150 سے 300 تک ان عسکریت پسندوں کی حمایت حاصل تھی جو فورسز کے خلاف درہ آدم خیل، کوہاٹ روڈ اور بعض مقامات پر خیبر ایجنسی میں برسرِپیکار تھے۔

اس گروپ نے جدید ہتھیاروں سے لیس ہوکر گوریلا انداز میں انتہائی سرعت سے لیے عرصے تک سپلائی ٹرمینلز پر حملے کرکے 350 سے زائد گاڑیوں اور 20 سے زائد افراد کو ختم کردیا۔ ان حملوں کے لیے یہ لوگ باڑہ روڈ اور کوہاٹ روڈ کے روٹس استعمال کرتے رہے جبکہ

ان کو مقامی جرائم پیشہ گروپوں اور بعض مذہبی گروپوں کی عسکری حمایت بھی حاصل رہی۔ مصطفیٰ ہجرت لمبے عرصے تک سرحد پولیس کی حراست میں رہا جبکہ اس کا نائب رحمان اللہ اس گروپ کی قیادت اور کمانڈ کرتا رہا۔ اس شخص کی نشاندہی پر فوجی اور نیم فوجی دستوں نے 30 دسمبر سے 3 جنوری تک خیبر ایجنسی کے علاقوں جمرود اور لنڈی کوتل میں کارروائیاں کر کے 100 سے زائد افراد کو حراست میں لے لیا۔ اس کارروائی کا مقصد نیٹو کی سپلائی لائن کو محفوظ کرنا تھا۔ دوسری طرف خیبر ایجنسی کی مقامی تنظیم لشکر اسلام بھی محدود سطح پر سپلائی لائن کے خلاف کارروائیوں میں ملوث رہی تاہم بعدازاں مقامی آفریدی ٹرانسپورٹرز کے رابطوں اور مالی امداد کے باعث ان کے ساتھ شرائط طے کی گئیں تو وہ اس کام سے علیحدہ ہوگئی۔

نیٹو سپلائی لائن پر حملوں کا سلسلہ اپریل 2009ء کے دوران ایک بار پھر تیز ہوا تو صوبائی حکومت اتنی پریشان ہوگئی کہ وزیراعلیٰ سرحد حیدر خان ہوتی نے ایک انٹرویو کے دوران اس سپلائی لائن کو سب سے بڑا دردسر قرار دے کر وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس دردکوان کے سر سے ہٹا دیا جائے۔

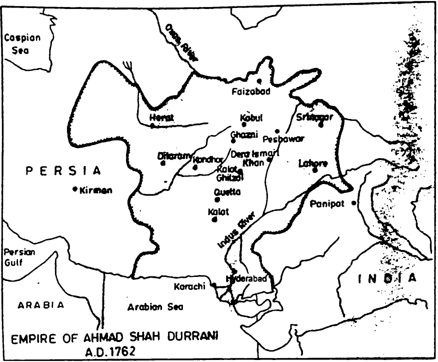

EMPIRE OF AHMAD SHAH DURRANI
A.D. 1762

باب 15

سوات کا جنگی میدان اور تورا بورا گروپ

قبائلی علاقوں میں طالبان کی طرف سے اپنی رٹ قائم کرنے کے بعد سوات ان کی سرگرمیوں کا سب بڑا مرکز بن گیا۔ سوات سمیت صوبہ سرحد کے دوسرے بندوبستی علاقوں میں طالبانائزیشن کا ظہور کسی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لیے برسوں سے کام جاری تھا۔ دیر، سوات اور چترال کی خودمختار ریاستوں کو جس طرح موجودہ پاکستان میں شامل کیا گیا اور جس طریقے سے اس بات کو نظرانداز کیا گیا کہ پاکستان میں ان علاقوں کا مستقبل کیا شکل اختیار کرے گا نسبتاً اچھے اور فعال نظام کے خاتمے کے بعد ان علاقوں کے عوام نے نئی ریاست کے بارے جو اچھی توقعات وابستہ کی تھیں اگر وہ پوری نہ ہوئیں تو ان علاقوں کے عوام کسی نئی آئیڈیالوجی پر کوئی بھی دوسرا راستہ اپنانے کا موقع خود ہی دریافت کر لیں گے۔

پاکستانی حکمرانوں نے آزادی کے بعد ان کے حقوق اور نمائندگی کو جس جس طریقے سے نظرانداز کیا اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کا ایک مخصوص مگر صاحب الرائے طبقہ اس تمام عرصہ کے دوران کسی متبادل نظام کی تلاش اور کوشش میں رہا۔ ایسے لوگ صوبہ سرحد کے تقریباً تمام اضلاع میں موجود تھے۔

دوسری طرف 1980ء کے دوران جب افغانستان میں جہاد اور اس کے بعد مقبوضہ کشمیر میں حق خودارادیت کے نام پر ضیاء آمریت کی چھتری کے نیچے جہاد کے لیے بھرتیاں شروع ہوئیں تو اس علاقے میں بھی بے شمار تنظیمیں وجود میں آ گئیں۔ ملاکنڈ ڈویژن، جنوبی

اضلاع اور ہزارہ ڈویژن کے بعض اضلاع میں بھی جہادیوں کی تنظیمیں قائم ہوگئیں۔ ان تنظیموں کے سربراہان اور کمانڈرز تو ابتداء میں پاکستانی خفیہ اداروں کی ہدایات پر چل رہے تھے لیکن عام جہادیوں کو گریٹ گیم اور کولڈ وار کی نزاکتوں اور تفصیلات کا زیادہ علم نہیں تھا۔ ابتداء میں وہ محض جہاد کے جذبے کے تحت ہی اس نیٹ ورک کا حصہ بنتے گئے مگر بعدازاں ریاستی اداروں کی پے درپے قلابازیوں اور غلطیوں نے ان عناصر میں بے چینی کی ایک ایسی کیفیت کو جنم دیا جس نے مختلف اوقات میں پاکستانی نظام اور اداروں کے لیے مختلف النوع مشکلات پیدا کیں۔ بے چینی کا یہ عنصر مشرف دور میں بام عروج پر پہنچ گیا۔

80ء کی دہائی میں صوبہ سرحد سے ملحقہ قبائلی علاقہ جہادیوں کے ایک محفوظ مرکز کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جنوبی اضلاع ان قبائلی علاقوں کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے جبکہ پشاور، نوشہرہ، صوابی اور بعض دوسرے اضلاع میں جہادی مہاجرین کے بے شمار کیمپس نہ صرف موجود تھے بلکہ وہاں ٹریننگ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ دوسری طرف مانسہرہ، بٹگرام، ہری پور اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی کیمپ موجود تھے۔ اسی دہائی کے آخر میں سوات میں ٹریننگ کیمپ کی بنیاد ڈالی گئی جبکہ باجوڑ ایجنسی اور افغانستان سے ملحقہ دیر کے دو اضلاع بھی جہادیوں کے مؤثر علاقوں میں شمار ہوتے تھے۔

1992ء کو اس علاقے میں صوفی محمد کی قیادت میں تحریک نفاذ شریعت محمدی کے نام سے ایک ایسی تحریک شروع ہوئی جس نے دیکھتے دیکھتے دیدہ اور نادیدہ قوتوں کی آشیرباد سے ملاکنڈ ڈویژن کے پانچ اضلاع خصوصاً دیر اور سوات میں مقبولیت حاصل کر لی۔ ابتداء میں ان لوگوں کا مطالبہ علاقے میں پاٹا ریگولیشن کے خاتمے کے بعد متبادل نظام کے طور پر شرعی عدالتوں کا قیام تھا تاہم بعد میں انہوں نے پرتشدد سرگرمیوں کا آغاز کر کے سوات، دیر اور ملاکنڈ کے زیادہ تر علاقوں میں حکومتی رٹ کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔

دیکھتے دیکھتے یہی تحریک آفتاب شیرپاؤ اور پی پی پی کے لیے گلے کا طوق بن کر رہ گئی اور اس سے خلاصی کے لیے پی پی پی کو ایک ناقص نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ کا اعلان کرنا پڑا۔ اس نظام کو 1999ء کے مسلم لیگی دور حکومت میں بعض ترامیم کے ساتھ دوبارہ نافذ العمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا مگر عملاً ان تبدیلیوں پر عملدرآمد ممکن نہیں ہوسکا۔

افغانستان میں طالبان کی تحریک زور پکڑ گئی اور بعدازاں ان کی حکومت بھی قائم ہوگئی تو مذہبی جماعتوں، جہادی دانشوروں اور بعض خفیہ ہاتھوں کے علاوہ ٹی این ایس ایم جیسی تنظیموں کو بھی نئی قوت حاصل ہوگئی۔ انیسویں صدی کے دوران اس خطے میں طاقت اور تشدد کے ذریعے طالبان کے اقتدار حاصل کرنے کا تجربہ جہادی طبقہ فکر کے لیے ایک نئے حوصلے اور نئی پلاننگ کی ابتداء تھی۔ جس کے بعد اس تجربے نے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ ملاکنڈ ڈویژن اور صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں کے جہادی طالبان کے فلسفہ جہاد اور طرز حکمرانی کو آئیڈیل سمجھ کر پاکستان میں بھی اسی قسم کی تبدیلی لانے کے لیے کوشش کرنے لگے۔ ان تنظیموں کو نہ صرف نیا حوصلہ اور راستہ ملا بلکہ ان کے طالبان کے ساتھ رابطے بھی قائم ہوئے جس کے سبب اس پورے علاقے میں ایسی تنظیمیں قائم ہوگئیں جو طالبان طرز حکومت کی نہ صرف وکالت اور تشہیر کر رہی تھیں بلکہ پاکستان کے اس خطے میں مناسب وقت پر ایسی ہی تبدیلی لانے کے لیے اندرون خانہ کوششیں بھی کرتی رہیں۔۔

فروری 2009ء کو وزارت داخلہ کی جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان خصوصاً فاٹا اور صوبہ سرحد میں طالبان سے متاثر چھوٹی بڑی تنظیموں کی تعداد 22 سے 30 کے درمیان تھی۔

طالبان حکومت کے قیام کے دوران جہاں نہ صرف یہ کہ القاعدہ افغانستان میں اپنی پوری آئیڈیالوجی، افرادی قوت اور وسائل کے ساتھ داخل ہوگئی بلکہ خطے کی جہادی قوتیں بھی افغانستان کی طالبان ریاست سے مستفید ہونے لگیں۔ یہ لوگ افغانستان جاکر سرکاری اداروں کے دورے کرتے۔ وہاں تربیت حاصل کرتے اور وسائل بھی حاصل کرتے۔ دوسری طرف طالبان کی شہ پر پاکستان کی جہادی تنظیموں اور گروپوں کے عسکری افراد کو کشمیر، فلسطین، چیچنیا، عراق اور یہاں تک کہ چین (سنکیانگ) کے جہادی گروپوں کی امداد کے لیے بھی بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ یوں یہ لوگ ایک عالمگیر تحریک کی شکل اختیار کر گئے جن کی بنیاد اس فلسفے پر قائم تھی کہ اسلام اور جہاد کے حامی علاقوں میں طالبان کی طرز پر حکومتیں قائم کی جائیں یا مروجہ حکومتوں پر دباؤ ڈال کر اپنی بعض شرائط منوائی جاسکیں۔

ان لوگوں کے نیٹ ورک کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ ہمسایہ دوست

ملک چین نے سابق صدر پاکستان جنرل (ر) پرویز مشرف کے دورۂ چین کے موقع پران کو 50 افراد کی فہرست پیش کر کے ان کی حوالگی کا مطالبہ کیا جنہوں نے وزیرستان، سوات اور مانسہرہ کے جہادی کیمپوں میں تربیت حاصل کی تھی۔ یہ صوبہ سنکیانگ کی تحریک آزادی کے اہم لوگ تھے اور چین کے بقول وزیرستان میں موجود تھے۔

ایم ایم اے کی صوبائی حکومت نے 2002ء کے الیکشن کی کامیابی کے بعد ایسی تنظیموں کو بھی غیر علانیہ بہت تعاون فراہم کر کے ان کی متشددانہ پالیسیوں اور کارروائیوں پر خاموشی اختیار کیے رکھی جس کے باعث یہ لوگ منظم اور مضبوط ہوتے گئے تو ساتھ ساتھ ان کے حوصلوں اور کامیابیوں کی شرح بھی بڑھتی گئی۔

اس دوران ایم ایم اے نے ووٹ بینک محفوظ بنانے کے لیے اسمبلی کے ذریعے حسبہ بل اور بعض ایسے دوسرے بل منظور کرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ بعدازاں جب سوات، ہنگو، بنوں اور دوسرے علاقوں میں اپنے مطالبات کے حل کے لیے طالبان نے بندوق اٹھائی تو ایم ایم اے نے ایک نئی دلیل کی بنیاد پر کہنا شروع کیا کہ اگر اسمبلی اور جمہوری اداروں کے ذریعے بعض ایسے مسئلے حل کیے جاتے تو تشدد اور بغاوت جیسے حالات کا راستہ روکا جاسکتا تھا۔ اس دلیل سے اس لیے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ طالبان اور ان کے حامیوں کے اہداف بالکل واضح تھے اور ان کو ہدایات افغانستان اور وزیرستان سے ملا کرتی تھیں۔

وزیرستان میں فورسز کی ایک حکمت عملی اور بعض مقامی کمانڈروں کی جانب سے غیر ملکی جنگجوؤں کے خلاف مزاحمت کا سلسلہ شروع ہوا اور امریکہ کے جاسوس طیاروں کے حملوں میں شدت آگئی تو ایک مربوط حکمت عملی کے ذریعے ان کو کرم ایجنسی اور باجوڑ منتقل کیا گیا۔ باجوڑ ایجنسی کے بعد اگلے سٹیشن کے طور پر لال مسجد آپریشن کے بعد صوفی محمد کے داماد مولوی فضل اللہ اور ان کی تحریک کو مضبوط کیا گیا اور اس مقصد کے لیے سوات کے پیوچار کیمپ کو ان عناصر کا مرکز بنایا گیا تو لشکر طیبہ، لشکر جھنگوی، حرکت المجاہدین اور جیش محمد کے کمانڈر بھی اس مزاحمت میں شامل ہو گئے جبکہ غیر ملکی بھی بڑی تعداد میں باجوڑ اور سوات منتقل ہو گئے۔ سوات میں 1990ء کی دہائی کا ٹی این ایس ایم والا پس منظر پہلے ہی سے موجود تھا۔ دوسرے مرحلے میں اس تحریک کو تحریک طالبان اور مذکورہ بالا دوسری تنظیموں کی گائیڈ لائن اور افرادی

قوت میسر آ گئی تو سوات میں ایسی خونریز لڑائی اور مظالم کی مثال قائم کی گئی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

موجودہ پاکستان کی سب سے بڑی مزاحمتی جنگ سوات کی وادی میں کچھ اس انداز میں لڑی گئی کہ انسانیت بھی حیران رہ گئی اور اس جنگ کی بازگشت پوری دنیا میں نہ صرف سنی گئی بلکہ امریکہ، برطانیہ، روس، بھارت، افغانستان اور بے شمار دوسرے ممالک بھی پریشان ہوکر احتجاج کرتے دکھائی دیئے۔ عالمی، علاقائی اور مقامی احتجاج اور چیخ وپکار کے باوجود پاکستان کی سکیورٹی فورسز، سیاسی اور مذہبی قیادت بھی حالات پر قابو پانے میں ناکام رہی اور یہ مزاحمت ایک منظم بغاوت کی صورت اختیار کرگئی۔

سوات کی منظم جہادی مزاحمت نے دوسرے اضلاع کو بھی تیزی سے لپیٹ میں لینا شروع کیا اور صوبہ سرحد کا ایک بڑا حصہ عملاً طالبانائزیشن اور عسکریت پسندی کے نرغے میں آ گیا۔ سوات صوبہ سرحد کے ان اضلاع میں شامل تھا جہاں کی شرح تعلیم مثالی تھی۔ یہاں بے پناہ قدرتی وسائل کی فراوانی تھی۔ تقریباً ہر گھر کا کم از کم ایک شخص باہر کے کسی ملک میں برسرروزگار تھا۔ سیاحت اور مقامی انڈسٹری اس خطے کی خوشحالی کا ایک اور ذریعہ تھا۔ یہ لوگ پشتونوں کے دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ، پرامن، مہذب اور زندہ دل تھے۔ جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ روزانہ سینکڑوں لوگ پشاور، اسلام آباد، لاہور اور کراچی کا سفر کرتے تھے۔ وہ قبائلی علاقوں کی طرح محدود نقل وحرکت اور روایتی سماجی ڈھانچے کی مجبوریوں میں بھی بندھے ہوئے نہیں تھے۔ اس لیے سوات کے طالبانائزیشن کے لیے انتخاب نے بہت سے سوالات کو جنم دیا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سوات کی سرحدیں افغانستان، چین اور بھارت کے قریب تھیں۔ اس علاقے کے مختلف ٹریکس اور راستے استعمال کرکے ان تین ممالک میں آسانی سے گھسا جا سکتا تھا۔ باجوڑ اور کنڑ کے راستے یہاں رسد اور افرادی قوت کی افغانستان سے فراہمی بھی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ سوات چونکہ سیاحت کا بڑا مرکز تھا اس لیے غیر مقامی اور غیر ملکیوں کی آمدورفت، قیام اور سرگرمیوں کا اس طریقے سے نوٹس نہیں لیا گیا جیسا کہ دوسرے علاقوں میں لیا جا سکتا تھا۔ مقامی آبادی یا انتظامیہ مؤثر چھان بین یا چیکنگ کی آڑ

میں ایسے عناصر سے پوچھ گچھ سے لاپرواتھی جس کے باعث ایسے عناصر بہت آسانی سے پاؤں جمانے اور مقامی آبادی کو اعتماد میں لینے میں کامیاب ہوگئے۔ جو کہ سیاحت کی آڑ میں محدود تعداد میں سوات آئے ہوئے تھے۔

پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن)، مسلم لیگ (ق) اور تحریک انصاف جیسی پارٹیاں بھی 1992ء کی صوفی محمد تحریک سے لے کر 2007ء کی فضل اللہ تحریک کے آغاز تک ان عناصر کا محض اس وجہ سے ساتھ دیتی رہیں کہ ان کو اپنے مقامی مفادات سے دلچسپی تھی۔ ان پارٹیوں کو ان عزائم اور آئیڈیالوجی سے متعلق ادراک بھی نہیں تھا۔ جن کی تکمیل کے لیے سوات کو مزاحمتی تحریک اور بغاوت کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ جے یو آئی اور جماعت اسلامی تو پہلے ہی سے ایسے گروپوں کی حوصلہ افزائی کی پالیسی پر عمل پیرا تھیں۔ صرف اے این پی ہی وہ واحد سیاسی قوت تھی جو کہ ان سرگرمیوں کے مقاصد سے بھی باخبر تھی اور ممکن حد تک ان سرگرمیوں کے خلاف احتجاج بھی کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سرحد میں اے این پی کی حکومت کے قیام کے بعد اے این پی ہی کو بدترین انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنا کر دیوار سے لگا دیا گیا۔

غیر مقبول اور ناکام فوجی آپریشن کے پہلے مرحلے اور سیاسی قوتوں کی نااہلی کے باعث سوات کے عوام کو عسکریت پسندوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بہت خطرناک اور دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ سوات پر عملاً طالبان کی حکومت قائم ہوگئی۔

جس کے بعد مقامی طالبان نے اپنے مخالفین اور سرکاری اہلکاروں کو جس بے دردی اور بے رحمی سے قتل کیا اس کی مثال افغانستان اور وزیرستان کی جنگوں کے دوران بھی نہیں ملتی۔ یہ سوال کئی بار شدت سے اٹھایا گیا کہ سوات کے عسکریت پسند افغانستان اور وزیرستان کے طالبان کے مقابلے میں اتنے سخت مزاج اور تشدد پسند کیوں ہیں؟ اس کی بڑی وجہ شاید یہی تھی کہ ایک منصوبے کے تحت یہ فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ اس بند وبستی علاقے میں اس تمام گیم کا فائنل راؤنڈ کھیلا جائے اور پاکستانی ریاست کو اس کی حیثیت یاد دلائی جائے۔ ان تمام کارروائیوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حکومت، سیاسی قیادت اور فورسز پر واضح کر دیا جائے کہ عسکریت پسند اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کوئی بھی انتہائی اور غیر معمولی اقدام اٹھانے کی طاقت اور

صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ یہ لوگ صوبہ سرحد کے کسی بھی بندوبستی علاقے کے عوام کو یرغمال بنا کر حکومتی اداروں کو چیلنج کرنے کی بھرپور قوت رکھتے ہیں۔ سوات امن معاہدے کے ذریعے اپنی شرائط منوانا اور معاہدے کے باوجود حکومت مخالف کارروائیاں اس بات کا ثبوت تھا کہ طالبان اوران کے دوسرے اتحادی گروپ اب ایک مسلمہ حقیقت اور قوت بن چکے ہیں۔ طالبان اس عرصہ کے دوران دوسرے متعدد محاذوں پر بھی برسرپیکار رہے جس سے ثابت ہوا کہ ان کی تحریک اور مزاحمت کا ہدف صرف سوات میں نظام عدل یا شریعت کے نفاذ تک محدود نہیں، کچھ اور علاقے بھی ہیں۔

سوات کے عوام کا ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس علاقے میں قبائلی علاقوں یا بعض دوسرے پشتون اضلاع کی طرح کا جرگہ نظام یا تو تھا نہیں یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں کے عوام سیاحت کے اثرات اور باہر کے ممالک میں بڑی تعداد میں رہنے کے باعث پشتونوں کے روایتی مزاج اور رسم و رواج سے بہت دور ہوگئے تھے اور ان کا سماجی ڈھانچہ ایک طرح سے شہری علاقوں کے مزاج کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ معاشی خوشحالی، سیاحت، غیر معمولی شرح تعلیم اور شہروں پر انحصار جیسی چیزوں نے یہاں کے عوام کو حجرے کے ذریعے آپس میں رابطے اور مشورے کے مواقع سے بھی بڑی حد تک دور کردیا تھا۔ یہ لوگ کسی بھی غیر مقامی حتیٰ کہ غیر ملکی کو نہ صرف چھان بین کے بغیر مہمان ٹھہراتے تھے بلکہ بعض کو کاروبار میں بھی شریک کرلیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سوات میں افغانیوں اور قبائلیوں نے ہوٹل اور ٹرانسپورٹ کے شعبوں میں بڑی سرمایہ کاری کی تھی۔ ماضی قریب میں سعودی عرب، کویت، سوڈان، لیبیا اور شام سے عرب شیوخ کی بڑی تعداد مساجد، مدارس کی تعمیر اور دوسرے فلاحی کاموں کے نام پر آزادانہ طریقے سے سوات آیا کرتی جہاں پر مقامی مولوی حضرات اور مقامی انتظامیہ ان کو خصوصی پروٹوکول سے نوازا کرتی۔ ان عربوں نے مقامی لڑکیوں سے وزیرستان کی طرح بڑی تعداد میں شادیاں بھی کیں۔ ان میں بھی بعض ایسے تھے جن کے القاعدہ اور طالبان کے ساتھ رابطے تھے۔ لیکن حکومتیں ان غیر ملکیوں کی چھان بین کو مجرمانہ طریقے سے نظرانداز کرتی رہیں جس کے باعث ایسے عناصر کے لیے سوات ایک محفوظ ٹھکانہ بنتا گیا جبکہ ادھر بعض محرومیوں کے باوجود سوات کے عوام صوبہ صرحد کے دوسرے اضلاع اور قبائلی علاقوں کے برعکس پاکستان

کے ساتھ غیر معمولی وابستگی اور وفاداری کا مظاہرہ کرتے رہے۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رمضان کے چاند اور عید کے اعلان جیسے معاملے پر سوات کے عوام نے صوبہ سرحد کے دوسرے اضلاع کی طرح مرکزی حکومت کے اعلان سے ایک بار بھی روگردانی نہیں کی۔ان لوگوں کی اکثریت پشاور کے بجائے اسلام آباد سے زیادہ گہری دلچسپی اور وابستگی رکھتی تھی۔اور یہی وجہ ہے کہ سوات ان عناصر کے لیے موزوں ترین جگہ ہوسکتی تھی جنہوں نے ایک منصوبے کے تحت وزیرستان کے بعد صوبہ سرحد کے بندوبستی علاقے میں طالبانائزیشن لانے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

سوات کے عوام کی پاکستان اور اسلام سے محبت اور عقیدت اپنی مثال آپ تھی لیکن افسوس کہ حکومتی پالیسیوں اور اداروں کی ترجیحات نے اس محبت کو نفرت میں تبدیل کر دیا جو 2008ء میں طالبان تحریک میں شدت کے ساتھ محسوس کی گئی۔مزید یہ کہ ان انتہاپسندوں کا راستہ روکنے کے لیے سیاسی قوتوں نے بھی کردار ادا نہیں کیا جس کی ضرورت تھی۔

ابتداء میں عربوں کے علاوہ کشمیر اور افغانستان کے جہادیوں کے درمیان 1980ء سے لے کر 2001ء تک کے تمام عرصہ کے دوران ایک دوسرے کی معاونت کا سلسلہ مسلکی اختلافات اور طریقہ کار مختلف ہونے کے باوجود جاری رہا۔لشکر طیبہ، حرکت المجاہدین، حرکت الجہاد اسلامی (الیاس کشمیری)، جیش محمد (مسعود اظہر، حاجی عبدالجبار) اور البدر مجاہدین (بخت زمین) وہ نمایاں جہادی تنظیمیں تھیں جنہوں نے پاکستانی متعلقہ اداروں کی حمایت سے کشمیر اور افغانستان دونوں ممالک میں جہاد کی کامیابی کے لیے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ طالبان کے افغانستان داخلے کے وقت دوسری تنظیموں کے علاوہ جیش محمد کے پاکستان سے تعلق رکھنے والے متعدد کمانڈرز اور کارکن افغانستان میں سرگرم عمل رہے۔ان لوگوں کے ابتداء ہی سے القاعدہ کی لیڈرشپ سے تعلقات اور رابطے قائم ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا فلسفہ جہاد محض افغانستان یا کشمیر تک محدود نہیں رہا۔ان لوگوں میں سے جن کمانڈرز نے طالبان اور امریکہ کے تصادم کے دوران شہرت پائی ان میں سے بعض کا سوات سے تعلق تھا ان سب نے جیش محمد کے پلیٹ فارم سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔یہی وہ گروپ تھا جس نے بعد میں تورابورا گروپ کے نام سے شہرت پائی۔

اس گروپ کے لیڈر حسین علی کا تعلق سوات کے علاقے پیوچار سے تھا۔ اسی حسین علی نے جہاد کے دوران جواد اور بعد میں تورملا کے نام سے شہرت حاصل کی۔ ان کے دوسرے ساتھیوں میں ابن امین، سیف الملوک، قاری مشتاق اور شاہ دوراں بھی شامل تھے۔ ان سب کا تعلق شورش زدہ سوات سے ہے۔ تورملا نے محض 12 سال کی عمر سے جہاد میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ وہ سوات کی مزاحمت سے قبل افغانستان، عراق، کشمیر اور چیچنیا میں بھی لڑ چکے تھے۔

وہ اسامہ بن لادن، ڈاکٹر ایمن الظواہری اور ملاعمر کے ساتھ بھی قریبی رابطوں میں رہے۔ افغانستان پر امریکی حملے کے دوران ان کو مزاحمت کرتے ہوئے شبرغان میں گرفتار کیا گیا جہاں وہ کافی عرصے تک شمالی اتحاد اور امریکیوں کے قبضے میں رہے۔ کچھ عرصہ بعد ان کو پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ بعد میں جب ان کو رہائی مل گئی تو وہ افغانستان کے بجائے پاکستان میں طالبان اور ان کے ہم خیال ساتھیوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف ہوگئے۔ سوات کی مزاحمت کے پس پردہ تورملا ہی کی پلاننگ کارفرما تھی۔ تورملا نہ صرف یہ کہ طالبان کے مختلف گروپوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوگئے بلکہ انہوں نے سوات آپریشن کے دوران طالبان کی کمانڈ بھی کی اور فورسز کی ایک کارروائی کے دوران مزاحمت کرتے وقت کبل کے علاقے میں جاں بحق ہوگئے۔ ان کی وفات کے بعد تورابورا گروپ کے دوسروں ساتھیوں نے ان کے مشن کو جاری رکھا جبکہ اس گروپ کو القاعدہ سمیت ایسی دوسری عالمی تنظیموں کی بھی حمایت حاصل رہی۔

تورابورا گروپ کا القاعدہ کے علاوہ جن دو اہم تنظیموں سے رابطہ تھا ان میں اسلامک موومنٹ آف ازبکستان اور تحریک طالبان پاکستان شامل ہے جو سوات میں سرگرم عمل رہی اور اس کے ملاعمر سے افغانستان میں بھی رابطے موجود تھے۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

باب 16

پیوچار ٹریننگ کیمپ کا پس منظر اور کردار

محل وقوع

پیوچار کیمپ سوات کے ضلعی ہیڈکوارٹر مینگورہ (سیدوشریف) سے تقریباً 90 کلومیٹر کے فاصلے پر تحصیل مٹہ کے علاقے میں واقع ہے۔ اس وادی (پیوچار) کے مغرب میں ضلع دیر اور اس سے متصل باجوڑ ایجنسی جبکہ شمال مغرب میں چترال واقع ہے۔ تحصیل ہیڈکوارٹر مٹہ سے اس کیمپ کا فاصلہ 40 کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس جگہ سے آگے عام سڑک بند یا ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں پر آبادی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کیمپ ایک ایسے مقام پر قائم کیا گیا ہے جس کے تینوں اطراف میں بلند پہاڑ اور ان کے اوپر گھنے جنگل ہیں۔ پیوچار گاؤں 50 سے 60 گھروں پر مشتمل ہے جہاں طالبان اور القاعدہ کے حامی سرکردہ مقامی افراد کے علاوہ باہر سے آئے جہادیوں کے خاندان رہتے ہیں اور یہ گھر ایک طرح سے کیمپ ہی کا حصہ کہے جا سکتے ہیں۔ کیمپ شمال مغرب کی طرف پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑی کے اوپر ٹریننگ کے لیے باقاعدہ جگہ بنائی گئی ہے۔ کیمپ کے دو اطراف میں 3 یا 4 غار ہیں جو کہ القاعدہ کی تورا بورا والی غاروں کے طرز پر بنائی گئی ہیں۔ ایک غار کو اسلحہ اور بارود جبکہ دو دوسری غاروں کو کمانڈرز اور اہلکاروں کی رہائش اور تربیت کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

سوات آپریشن کے دوران اس ایریا کو طالبان (عسکریت پسندوں) نے گوالیرئی کے مقام سے آگے کسی بھی غیر متعلقہ فرد اور سرکاری اہلکاروں کے داخلے کے لیے بند کر دیا تھا۔

مقامی آبادی اور انٹیلی جنس ذرائع کا کہنا ہے کہ یہ کیمپ غالباً 1988ء یا 1990ء میں قائم کیا گیا تھا۔ کیمپ کے قیام کی بنیاد اس علاقے میں موجود لشکر جھنگوی اور لشکر طیبہ اور جیش محمد کے مقامی کارکنوں یا کمانڈروں نے رکھی تھی۔ یہاں پر ایک عرصہ تک افغان جہاد کے لیے دیر، سوات اور شانگلہ کے جہادی عناصر کو ٹریننگ بھی دی جاتی رہی۔ جس کے بعد تعداد میں انتہائی کم ایسے لوگوں کو چترال اور باجوڑ کے راستے افغانستان میں داخل کیا جاتا تھا۔ جیش محمد سے تعلق رکھنے والے سوات کے گاؤں فتح پور کے ایک سرگرم کارکن کا کہنا ہے کہ بعض تربیت یافتہ لوگوں کو اس کیمپ سے شانگلہ اور مانسہرہ کے راستے کشمیر بھی بھیجا جاتا تھا جبکہ ایک وقت میں چین کے صوبے سنکیانگ کے مسلمان عسکریت پسندوں کو بھی یہاں محدود پیمانے پر تربیت دی جاتی رہی جو کہ بعدازاں شانگلہ اور شاہراہ قراقرم کے راستے جایا کرتے تھے۔

اسی طرح بعض دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کیمپ کو ابتدائی طور پر ایک مقامی جہادی کمانڈر عمر رحمان اور ان کے ساتھیوں نے قائم کیا تھا۔ عمر رحمان کو مٹہ کے علاقے شور (Shawar) سے 1998ء میں ایک حساس ادارے نے اس کے گھر سے گرفتار کیا اس پر پاکستان کے بعض اعلیٰ سرکاری حکام پر حملوں میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ چند برس قبل عمر رحمان کو سپریم کورٹ نے ایک حکم کے ذریعے رہا کر دیا جس کے بعد وہ پیوچار کیمپ کے انتظامی کمانڈر کے فرائض انجام دینے لگا۔

عمر رحمان کے علاوہ یہ ذمہ داری لشکر جھنگوی سے تعلق رکھنے والے تور ملا (Tor Mulla) کے ہاتھ میں بھی رہی۔ جس کو فورسز نے ایک کارروائی کے دوران نشانہ بنایا تھا۔

تحریک طالبان سوات کے ڈپٹی کمانڈر ابن امین اس کیمپ کے چیف ٹرینر کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں ان کا ایک اور بھائی ابن عقیل بھی تحریک کا اہم کمانڈر ہے۔ ابن امین سوات کبل کا مقامی باشندہ ہے اور وہ نمل گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ گزشتہ کئی برسوں سے عام مروجہ لباس کے بجائے کفن پہن کر گھوما کرتا ہے۔

مٹہ سے تعلق رکھنے والے عمر علی کا کہنا ہے کہ انہوں نے ابن امین کو علاقے میں کفن پہن کر گھومتے کئی بار دیکھا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ مٹہ کے علاقے سمبٹ آ کر لوگوں کو

جہاد کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ جبکہ وہ ایک بہترین منتظم اور ٹرینر بھی ہے۔

تحریک کا ایک اور کمانڈر شاہ دوراں بھی کیمپ میں بطور ٹرینر فرائض سرانجام دیتا رہا ہے جس کو بہترین عسکری مزاحمت کار کے طور پر شہرت حاصل رہی ہے۔ تحریک طالبان سوات کے امیر مولوی فضل اللہ کے ایک بھائی مولانا سمیع اللہ بھی یہاں سے تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ جن کو ڈماڈولہ حملے کے دوران باجوڑ ایجنسی میں ہلاک کیا گیا تھا جس کے بعد فضل اللہ کی سرگرمیوں میں بھی یکدم اضافہ ہوگیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے سسر مولانا صوفی محمد کی پرامن تحریک نفاذ شریعت محمدی کو لشکر جھنگوی، جیش محمد اور افغانستان کی القاعدہ، طالبان کمانڈروں کی مدد سے ایک عسکری اور پرتشدد تحریک میں تبدیل کر دیا۔

سوات کے مقامی صحافی کا کہنا ہے کہ انہوں نے چند ماہ قبل پیوچار کا دورہ کیا تو مولانا فضل اللہ، تور ملا اور شاہ دوراں وہاں موجود تھے۔ تاہم انہوں نے ان سے ایک گھر میں ملاقات کی جو کہ کیمپ کے نیچے نسبتاً میدانی علاقے میں واقع تھا۔ وہ پیوچار میں کسی قسم کے غار کی موجودگی سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے برعکس علاقے کے بے شمار لوگ ان غاروں کو بذات خود دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کی تعداد تین سے چار بتاتے ہیں۔

مقامی انتظامیہ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ پیوچار میں 2002ء کے بعد بے شمار غیرملکی دیکھے گئے ہیں۔ 2001ء تک یہاں پنجاب، صوبہ سرحد اور کشمیر سے تعلق رکھنے والے جہادیوں کی محدود آمد کا سلسلہ جاری تھا تاہم 2002ء کے بعد سعودی سوڈانی، بنگلہ دیشی، مصری، سنٹرل ایشنز اور افغان جہادی بھی آنا شروع ہوگئے۔

غیرمصدقہ اطلاعات کے مطابق القاعدہ چیف اسامہ بن لادن کے ایک صاحبزادے حمزہ بن لادن نہ صرف یہ کہ اس کیمپ کی سربراہی کرتے رہے ہیں بلکہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لمبے عرصے تک اس کیمپ میں موجود تھے تاہم ضلع دیر سے دو چینی انجینئروں کے اغوا کے بعد جب انٹیلی جنس اور فورسز نے پیوچار کو بہت زیادہ فوکس کیا تو حمزہ بن لادن اپنے ساتھیوں سمیت چترال کے راستے افغانستان کے صوبہ کنڑ منتقل ہوگئے۔

یاد رہے کہ اس سے قبل ایک فرانسیسی خبر رساں ایجنسی نے 2007ء میں خبر دی تھی کہ اسامہ بن لادن پیوچار کیمپ کے قیام کے دوران بیماری کے باعث جاں بحق ہو چکے تھے اور

اس ایجنسی نے ان کی موت کی مدت جون 2006ء بتائی تھی تاہم جنرل مشرف سمیت پاکستانی حکام ان کی موت کی تردید کرتے رہے۔

2004ء کو یہ کیمپ اس وقت منظرعام پر آیا جب مٹہ اور پیوچار کے درمیان چپریال (Chupriyal) نامی گاؤں کے ایک بینک پر 15 مسلح افراد نے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے انتہائی ڈرامائی اور جرآتمندانہ انداز میں دن دہاڑے (دن 2 بجے) حملہ کر کے بینک لوٹ لیا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ غالباً 25 لاکھ روپے لے کر تین چار لوگوں کو گولی مار کر روانہ ہو گئے تو مقامی پولیس نے عام لوگوں کے ساتھ مل کر ان کا تعاقب کیا۔ یہ لوگ قریبی پہاڑی پر چڑھ گئے جہاں انہوں نے ایک مسجد میں پناہ لے کر تعاقب کرنے والوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ تاہم پولیس نے اس وقت کے ایس ایچ او کالام خان (Kalaam Khan) کی قیادت میں ان کا محاصرہ کیا۔ (اب وہ ڈی ایس پی ہے) مسلسل فائرنگ اور مزاحمت کے باعث متعدد افراد جاں بحق جبکہ 9 گرفتار کیے گئے۔ گرفتار شدگان میں 3 غیرملکی (غالباً عرب) بھی شامل تھے۔ اس کارروائی کی اطلاعات جب سیدو شریف اور پشاور کے حکام کو دی گئی تو 3 غیرملکیوں کو لینے کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجا گیا اور ان کو نامعلوم مقام منتقل کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تینوں القاعدہ کے ارکان تھے اور ان میں ایک انتہائی اہم جنگجو کمانڈر بھی شامل تھا۔ اس واقعہ کی تحقیقات جب پولیس نے شروع کی تو پتہ چلا کہ اس واقعے کی پلاننگ پیوچار کیمپ ہی میں کی گئی تھی اور یہ لوگ بڑے عرصہ سے یہاں قیام پذیر تھے۔ مقامی پولیس نے تحقیقات کو آگے بڑھایا تو حساس اداروں نے نہ صرف ان کو روکا بلکہ ایس ایچ او کالام خان کو وہاں سے ہٹا بھی دیا گیا۔ عوام میں تجسس کا سلسلہ چل نکلا تو پتہ چلا کہ مٹہ اور آس پاس کے علاقوں کے بے شمار نوجوان نہ صرف ان لوگوں کے حامی ہیں بلکہ وہ ٹریننگ بھی لیتے رہے ہیں۔

سابق وفاقی وزیر محمد افضل خان لالہ کے گاؤں درشخیلہ کے ایک نوجوان جاوید خان کا کہنا ہے کہ قریبی علاقوں مٹہ، سمبٹ، گوالیرئی، چپریال اور سخرہ کے متعدد طالب علم بھی اس ٹریننگ کیمپ میں تربیت حاصل کرتے رہے جو 1990ء میں ڈگری کالج مٹہ میں اے این پی کی حمایت یافتہ پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن میں ان کی تنظیم کے سرگرم کارکن تھے۔

ان لڑکوں نے 1993ء کے الیکشن میں جمہوری عمل اور انتخابی سلسلے کے خلاف مہم بھی

چلائی۔ جاوید خان کا کہنا ہے کہ جہادی طبقہ فکر کے علاوہ پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن اور پی ایس ایف کے بے شمار لڑکے نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ مل گئے تھے بلکہ ٹریننگ لے کر باقاعدہ تنخواہیں بھی وصول کرتے تھے۔ علاقے کے عوام کو ان کی سرگرمیوں کا مکمل علم تھا۔ ان میں سے بعض مشرف کے بلدیاتی نظام میں اپنے علاقوں کے کونسلر اور ناظم بھی بنے۔

2007ء کے اواخر میں ایک اور واقعے نے بہت شہرت پائی۔ سوات پولیس نے انٹری پوائنٹ لنڈا کی چیک پوسٹ پر دیر سے آنے والے 2 ٹرکوں کو روک کر ان کی تلاشی لی تو ان سے انتہائی جدید اور بھاری اسلحہ برآمد ہوا۔ گرفتار ہونے والے چھ میں سے دو افراد نے انکشاف کیا کہ وہ یہ اسلحہ پیوچار کیمپ پہنچا رہے تھے۔ پولیس نے گاڑیاں اور لوگ تحویل میں لے کر اعلیٰ حکام کو اطلاع دی تو ان کو کہا گیا کہ وہ ان گاڑیوں اور لوگوں کو جانے دیں اور یہ کہ دوسرے ادارے اس واقعہ کی تحقیقات کریں گے۔

کالام خان کی طرح متعلقہ پولیس افسر کو بھی بعد ازاں وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس وقت کے ڈی سی او سوات نے اس واقعے کا سخت نوٹس لیا تو ان کو بھی ٹانگ اڑانے سے منع کیا گیا۔ یہ وہی ڈی سی او تھے جنہوں نے بعد ازاں مولانا فضل اللہ کے ریڈیو سٹیشن (ایف ایم) کے خلاف کارروائی کی تو ان کو کہا گیا کہ وہ سامان واپس بھیج دیں جو کہ وہ پولیس کے ذریعے کانجو کے ایک علاقے سے اٹھا کر لائے تھے۔ وہ آجکل سول سیکرٹریٹ پشاور میں ایک اہم عہدے پر فرائض انجام دے رہے ہیں۔

حکومتی آپریشن کے بعد مولانا فضل اللہ اہم ساتھیوں سمیت امام ڈھیری (مینگورہ) سے پیوچار کیمپ منتقل ہو گئے۔ تحریک کے رہنما پیوچار ہی سے کمانڈ اور آپریشنل سسٹم چلاتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ القاعدہ، طالبان اور تحریک طالبان پاکستان کے متعدد اہم لیڈر پیوچار کیمپ میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ کیمپ کی جانب فورسز کی پیدل پیش قدمی ناممکن تھی۔ اس لیے جیٹ جہاز استعمال کیے گئے۔ صوبائی حکومت کے بار بار مطالبے پر 13 سے زائد فضائی حملے کیے گئے جن میں 70 سے زائد افراد کی ہلاکت کے دعوے بھی کیے گئے تاہم غاروں اور بلند پہاڑوں کے حصار کے باعث کوئی قابل ذکر کامیابی سامنے نہیں آئی۔

کہا جارہا ہے کہ سابق وفاقی وزیر محمد افضل خان، تحصیل مٹہ کے ناظم عبدالجبار خان، ضلع ناظم جمال ناصر خان، صوبائی وزیر ایوب خان آشاڑے، ایم پی اے وقار خان اور صوبائی وزیر واجد علی خان کے بھائی سمیت اہم سیاسی، حکومتی شخصیات پر حملوں کی تمام پلاننگ پیوچار کیمپ میں کی جاتی رہی۔

ایسے ہی حملوں میں اہم شخصیات کے علاوہ صوبائی وزیر ایوب خان آشاڑے قوم پرست رہنما افضل لالہ کے دو ملازم، صوبائی وزیر واجد علی خان کے بڑے بھائی جو پولیس افسر تھے ایم پی اے وقار خان کے بھائی اور دو بھتیجے اور صوبائی وزیر میاں گل عالم زیب کو نشانہ بنایا گیا جبکہ اے این پی کے درجنوں کارکن دھمکیوں کے بعد قتل کر دیئے گئے۔

صوبائی وزیر سائنس، ٹیکنالوجی ایوب خان آشاڑے (اے این پی) کے مطابق وہ 2009ء سے سرکاری اور فوجی حکام کو وقتاً فوقتاً سیدو شریف اور پشاور میں کھلے عام کہتے رہے کہ پیوچار کیمپ کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور ان سرگرمیوں کا راستہ روکنا چاہیے تاہم ان کے اس مطالبے پر سرکاری حکام نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ ایوب خان کا کہنا ہے کہ انہوں نے پیوچار کیمپ کے پس منظر، ٹریننگ اور کردار سے نہ صرف حکام کو آگاہ کیے رکھا بلکہ وزیر بننے کے بعد گورنر سرحد، کور کمانڈر پشاور حتیٰ کہ صدر آصف علی زرداری کو بھی تفصیلات فراہم کیں اور یہ تمام چیزیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ ایوب خان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہمارے پاس اس بات کے شواہد اور ثبوت موجود ہیں کہ پیوچار کیمپ میں سینکڑوں ملکی، مقامی اور غیر ملکی خودکش حملوں کی تربیت، جیکٹس کی تیاری، بموں کی تیاری اور آپریشنل ٹریننگ ہوتی تھی۔

دوسری طرف پشاور میں موجود عسکری ذرائع کا کہنا ہے کہ پیوچار پر درجنوں فضائی حملے کیے جا چکے ہیں جن میں بے شمار عسکریت پسند ہلاک کیے گئے تاہم کیمپ کی جغرافیائی ساخت اور علاقے کی پیچیدگی کے باعث کیمپ پر کنٹرول حاصل نہیں کیا جا سکا۔ اس کے باوجود کیمپ کی سرگرمیاں، عسکریت پسندوں کی نقل و حرکت اور دوسرے معمولات بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔

عسکری حکام نے بتایا کہ کیمپ کو غیر موثر بنانے کے لیے جیٹ جہاز اور گن شپ ہیلی کاپٹرز استعمال کیے گئے جس کے بہتر نتائج برآمد ہوئے۔ کہا جاتا ہے اور اس کے شواہد بھی

موجود ہیں کہ بیوچار کیمپ عسکریت پسندوں کی ٹریننگ اور قیام کے علاوہ القاعدہ اور طالبان کمانڈروں اور لیڈرشپ کا سب سے بڑا اور محفوظ ٹھکانہ ہے جس پر کنٹرول حاصل کرنے میں پاکستانی فورسز گیارہ ماہ کی کوششوں کے باوجود کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اب تک جو جہادی رہنما اس کیمپ میں مختلف اوقات میں قیام کرچکے ہیں ان میں حافظ محمد سعید، مولانا مسعود اظہر، میجر مست گل، الیاس کشمیری، حاجی فقیر محمد، بخت زمین خان، عبداللہ محسود، ابوحمز، خاند السلمان، ابو عبداللہ، مولوی نذیر، فضل اللہ اور حمزہ بن اسامہ بن لادن شامل ہیں۔

+ ..... + ... +

باب 17

مولانا صوفی محمد سے مولانا فضل اللہ تک

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ملاکنڈ ڈویژن میں عسکریت پسندوں کی جاری تحریک کی بنیاد 1990ء کے دوران دیر اور سوات سے تعلق رکھنے والے سابق سرکاری افسران، خوانین، کاروباری افراد اور سمگلروں نے رکھی تھی۔ ان علاقوں میں پاٹا ریگولیشن کے خاتمے کا اعلان کیا گیا اور ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح کے قوانین لاگو کرنے کا اشارہ دیا گیا تو ان عناصر نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے اسلامی قوانین کا مطالبہ کرنا شروع کیا کیونکہ مروجہ پاکستانی قوانین کے نفاذ کے بعد متعدد ٹیکسوں کے نفاذ اور بعض خصوصی مراعات کے خاتمے سے مذکورہ بالا حلقوں کے مفادات کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ان عناصر کو علماء کی حمایت کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے ایک تاجک النسل مقامی عالم مولانا صوفی محمد اور ان کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ رابطے کر کے ان کو نفاذ شریعت کے مطالبے اور جدوجہد کے لیے تیار کیا۔ مولانا صوفی محمد ضلع دیر۔کے علاقے میدان میں ایک مدرسہ چلا رہے تھے۔ اس تحریک کی قیادت سے قبل وہ جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ تھے اور متعدد بار ڈسٹرکٹ کونسل کے انتخاب لڑ کر کامیاب ہو چکے تھے۔ بعدازاں وہ جماعت اسلامی سے بوجوہ ناراض ہو گئے اور جب مذکورہ بالا حلقوں نے ان کے ساتھ رابطے کیے تو وہ شریعت کے نام پر جدوجہد کے لیے تیار ہو گئے اور یوں انہوں نے 1992ء کو دیر ہی میں تحریک نفاذ شریعت محمدی کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈال دی۔ 1988ء کے الیکشن میں جب دیر کا رزلٹ آ گیا تو جماعت اسلامی نے پیپلز پارٹی کے

مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی تھی جس سے ثابت ہوا کہ اس علاقے میں جماعت اسلامی کا ہولڈ نہ صرف موجود تھا بلکہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس ہولڈ کے خاتمے کے لیے پی پی پی کے صوبائی صدر آفتاب خان شیر پاؤ نے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر دیر حبیب اللہ خان کے ذریعے دوسرے اقدامات کے علاوہ صوفی محمد کی نوزائیدہ تحریک کو مضبوط کرنے میں ذاتی دلچسپی لے کر ان کو ہرممکن مدد فراہم کی۔ بعد میں سوات کے ڈی سی محمد جاوید نے بھی ان سے ہرممکن تعاون کیا۔ یوں علاقے کے بااثر لوگوں اور جماعت اسلامی کی ضد میں پی پی پی کے صدر شیر پاؤ کے اس غیرسیاسی طریقہ واردات نے ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جس نے بعد میں پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے کر سیاستدانوں اور حکمرانوں کو پریشان کر کے رکھ دیا۔

1992-93ء کے دوران ٹی این ایس ایم کی شاخیں دوسرے اضلاع تک بھی تیزی سے پھیل گئیں۔ چونکہ دیر میں جماعت اسلامی اور پی پی پی کے علاوہ مضبوط قبائلی جرگہ نظام موجود تھا اس لیے جب 1993ء کو صوفی محمد کی تحریک نے شریعت کے نفاذ کے لیے تحریک چلانے اور احتجاج کرنے کا ارادہ کیا تو ان کو عوامی اور سیاسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور یوں یہ تحریک سازگار ماحول کی تلاش میں سوات منتقل ہوگئی جہاں پر نہ تو سیاسی قوتیں مضبوط تھیں اور نہ ہی دوسرے پشتون علاقوں کی طرح جرگہ نظام مؤثر تھا۔ آفتاب شیر پاؤ کے عرصہ اقتدار میں اس تحریک نے قوت پکڑنے کے بعد اتنا دباؤ ڈالا اور علاقے کو کچھ ایسے طریقے سے مفلوج کر کے رکھ دیا کہ 1994ء کو پی پی پی کی حکومت نے نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ کا اعلان کردیا۔ اس نظام کے حوالے سے چونکہ ملک یا خطے میں پہلے سے کوئی واضح انتظامی مثال موجود نہیں تھی۔ اس لیے یہ نظام نہ صرف یہ کہ محض معاون قاضیوں کی تعیناتی تک محدود رہا بلکہ اس کے باعث انصاف کے طلب گار لوگ، وکلاء، جج اور دوسرے متعلقہ لوگ مزید مشکلات سے دوچار ہوگئے۔

ان نقائص کے باعث کچھ عرصہ بعد پھر سے تحریک شروع ہوئی اور 1999ء کو نوازشریف کے دور حکومت میں ایک اور نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔ اب کی بار بھی نہ تو اس نظام پر اعتماد کا اظہار کیا گیا نہ ہی ترامیم کو عملی جامہ پہنایا جاسکا اور نہ ہی اس عدالتی اور قانونی خلا کو پورا کیا گیا جو سوات ڈویژن میں کافی برسوں سے موجود تھا۔

مولانا صوفی محمد جمہوریت کے سخت مخالف تھے وہ اس نظام کو کافرانہ نظام کہہ کر اس کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریک کے عروج کے بعد اتنے سخت گیر قوانین وضع کیے جن کی اس خطے میں طالبان کی افغانستان میں آمد کے عرصے تک مثال نہیں ملتی تھی۔ عین انہی دنوں جب طالبان افغانستان پر قابض ہونے لگے تو انہوں نے صوفی محمد کے ساتھ بھی رابطے قائم کیے اور یوں فریقین ایک دوسرے کے ساتھ رابطوں میں بندھ گئے۔ صوفی محمد اتنے سخت گیر مذہبی لیڈر بن کر ابھرے کہ وہ تصویر اتارنے یا لگانے کو بھی خلاف اسلام قرار دیتے تھے۔ کالی پگڑی ان کا خصوصی نشان بن گیا اور پورے ڈویژن کو اپنے ماتحت لانے میں کامیاب ہوگئے۔ تحریک کے احتجاج میں دوسروں کے علاوہ پی پی پی کے ایم پی اے بدیع الزمان کو بھی ہلاک کیا گیا۔ ٹی این ایس ایم کی تحریک کے دوران وہ پاکستانی عناصر بھی ڈویژن کا رخ کرنے لگے جو جہاد کی سرپرستی کرتے آئے تھے اور چاہتے تھے کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے لیے پاکستان کے اندر حالات خراب کیے جائیں چنانچہ یوں بھی ہوا کہ بے نظیر کے دور حکومت میں طالبان افغانستان پر جبکہ ٹی این ایس ایم والے ملاکنڈ ڈویژن میں چھا گئے۔

ایک اور دلچسپ اتفاق تو یہ بھی ہے کہ مولانا صوفی محمد ہر سال اپریل مئی میں اپنے مطالبات پورا کروانے کے لیے احتجاجی تحریک شروع کرتے تھے جس کے باعث گرم موسم میں سیاحت کے لیے سوات آنے والے رک جاتے اور دیگر مقامات کا رخ کر لیتے جس سے اس علاقے کی سیاحت بھی متاثر ہوئی۔ ہوٹلنگ کا کاروبار تباہ ہو کر رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس پس منظر میں انہیں مری کے کاروباری حضرات کی مدد بھی حاصل ہوتی جبکہ مقامی ٹمبر مافیا بھی انہیں مکمل سپورٹ کرتا تھا۔

مولانا صوفی محمد چونکہ مروجہ سیاسی تربیت اور طریقوں سے نابلد تھے اس لیے وہ اپنی مقبولیت کو پہلے کی طرح برقرار نہ رکھ سکے اس کے باوجود ان کی تنظیم نہ صرف موجود رہی بلکہ اس کے اجلاس وغیرہ بھی ہوتے رہے۔ صوفی محمد کے نسبتاً پرامن رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی جدوجہد کے دوران افغانستان اور پاکستان میں طالبان اور عسکریت پسندوں کی وہ حیثیت اور اہمیت نہیں تھی جو افغانستان پر امریکی حملے کے بعد بنی اور جس کے نتیجے میں عسکریت پسند وزیرستان اور دوسرے پاکستانی علاقوں میں اپنی حیثیت بنانے میں کامیاب

ہوئے۔

افغانستان کے طالبان بھی اپنی فتوحات اور حکومت کے استحکام کی کوششوں میں مصروف تھے۔ انہی وجوہات کا نتیجہ تھا کہ صوفی محمد کی تحریک تشدد یا جنگ کی پوزیشن میں آنے سے قاصر رہی۔

2001ء کے بعد جب افغانستان پر امریکی حملے کی تیاری ہونے لگی تو صوفی محمد ملاکنڈ ڈویژن سے اپنے حامیوں کی بڑی تعداد (چار ہزار سے چھ ہزار تک) لے کر باجوڑ کے راستے امریکہ اور اتحادیوں سے لڑنے افغانستان میں داخل ہوگئے۔ اس وقت کے گورنر سرحد افتخار حسین شاہ نے متعلقہ حکام کو ہدایت کی کہ وہ نہ صرف اس قافلے کو بلارکاوٹ سرحد پار کرنے دیں بلکہ ان کی ہرممکن امداد بھی کی جائے۔

ان لوگوں کو امریکی حملوں کے آغاز کے بعد کابل سے قندھار جاتے ہوئے ''بی ففٹی ٹو'' کے ایک حملے کے دوران نشانہ بنایا گیا جس سے ہزاروں جاں بحق ہوگئے۔ باقی کو شمالی اتحاد کی حکومت نے گرفتار کرلیا۔ صوفی محمد کو بعض ساتھیوں سمیت کرم ایجنسی کے راستے پاکستان میں داخل ہوتے وقت گرفتار کیا گیا جہاں سے ان کو ڈی آئی خان جیل منتقل کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ صوفی محمد کے خلاف اس واقعے کے بعد عوام میں کافی اشتعال پیدا ہوا کیونکہ جن لوگوں کے رشتہ دار افغانستان میں جاں بحق یا گرفتار ہوئے تھے۔ انہیں خاصا رنج تھا۔

ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ مولانا صوفی محمد کو ان کے سرپرست عناصر نے ہی افغان سرحد پر گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا تھا کیونکہ ان کے علاقے میں ان کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوچکی تھی اور یہ تاثر عام تھا کہ صوفی محمد ان کے رشتہ داروں کی نعشیں اور گرفتار افراد کو شمالی اتحاد کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود پاکستان آگئے ہیں۔ صوفی محمد نے ڈیرہ جیل میں قیام کے دوران ساتھیوں کے مشورے کے باوجود عدالت کے فیصلے کو چیلنج کرنے یا رہائی کے لیے دوسری کسی کوشش سے ہمیشہ گریز کیا۔ اس ضمن میں ان کا مؤقف تھا کہ وہ چونکہ پاکستان کے عدالتی نظام کو نہیں مانتے اس لیے ان سے رجوع نہیں کریں گے۔ 2006ء تک ان کی تنظیم ان کی غیرموجودگی کے باعث دم توڑتی دکھائی دی۔ تاہم اس کا تنظیمی ڈھانچہ موجود رہا اور بعض

سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔

2006ء کو ڈماڈولہ باجوڑ ایجنسی کے ایک مدرسے پر امریکیوں نے حملہ کر کے درجنوں طلباء کو شہید کر دیا تو باجوڑ میں فقیر محمد اور عمر خالد کی قیادت میں طالبان اور سوات میں صوفی محمد کے داماد فضل اللہ کی قیادت میں ٹی این ایس ایم کی سرگرمیاں پھر سے شروع ہوگئیں۔

مولانا فضل اللہ کا اصل نام فضل حیات ولد بہادر خان ہے وہ امام ڈھیری ضلع سوات کے رہائشی ہیں۔ ان کے والد تحریک نفاذ شریعت محمدی کے حامی رہے ہیں۔ فضل اللہ مولانا صوفی محمد کے نہ صرف شاگرد رہے ہیں بلکہ وہ ان کے داماد بھی ہیں۔ ڈماڈولہ حملے کے دوران جس مدرسے کو نشانہ بنایا گیا اس میں فضل اللہ کا بھائی سمیع اللہ بھی ہلاک ہوا تھا۔ انہی دنوں مولوی فقیر محمد اور بیت اللہ محسود کے ساتھ فضل اللہ کے رابطے ہوئے اور فضل اللہ نے سوات میں اپنی سرگرمیوں کی ابتداء کر دی۔

ڈماڈولہ حملے کے بعد ہی وزیرستان، باجوڑ اور سوات کے طالبان کے درمیان ایک مشترکہ لائحہ عمل اور جدوجہد پر اتفاق رائے کیا گیا۔ اسی اتفاق رائے نے مولانا فضل اللہ کو پرامن جدوجہد کے بجائے تشدد کے راستے پر اکسایا اور ان کو اپنے ساتھی مل گئے جنہوں نے 2007ء کے بعد پاکستانی فورسز کو شدید مشکلات سے دوچار کر کے سوات پر طالبان کے قبضے کا راستہ ہموار کر دیا۔

جولائی 2007ء کو لال مسجد کے معاملے نے جنرل (ر) مشرف کی حکومت اور عسکری مذہبی قوتوں کو ایک دوسرے کے سامنے لاکھڑا کیا تو سوات کے طالبان کی سرگرمیوں میں یک دم اضافہ ہوگیا۔ مولانا فضل اللہ نے اس موقع پر اپنے ایف ایم ریڈیو کے ذریعے حکومت اور ان کے حامیوں کے خلاف انتہائی سخت اور انتہاپسندانہ لہجہ اپنا کر اس ریڈیو سے اپنی تنظیم کی مقبولیت اور ابلاغ کا کچھ ایسے انداز میں کام لیا کہ وہ ''مولانا ریڈیو'' کے نام سے ہی شہرت پا گئے۔ کچھ دوسرے ریڈیو بھی اس دوران کام کرتے رہے۔

اس سے قبل شمالی وزیرستان میں فورسز نے غیرملکی جنگجوؤں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر کے اپنے دو حامی کمانڈروں کے تعاون سے ان کا گھیرا تنگ کیا تو القاعدہ کے حامی طالبان کمانڈرز بیت اللہ محسود اور سراج الدین حقانی نے مولوی فقیر محمد (باجوڑ) سے رابطے

کر کے غیر ملکی جنگجوؤں خصوصاً سنٹرل ایشین جنگجوؤں کو باجوڑ منتقل کرنا شروع کیا۔ ان جنگجوؤں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو کہ چین کے مسلم علاقوں میں آزادی کی تحریک چلانے کے علاوہ چیچنیا اور دوسری ریاستوں میں القاعدہ کی مدد سے برسرپیکار رہے تھے۔

باجوڑ میں فورسز کی کارروائیاں شروع ہوئیں اور امریکہ کے مزید حملوں کا خدشہ بڑھتا گیا تو فقیر محمد نے ان عناصر کو مولانا فضل اللہ کے پاس بھیج دیا جہاں پر پہلے ہی سے پیوچار کیمپ کی شکل میں ملکی اور غیر ملکی جنگجوؤں کا ٹھکانہ موجود تھا۔ باجوڑ سے ان لوگوں کی سوات منتقلی اس لیے بہت آسان تھی کہ دونوں علاقے ضلع دیر کے ایک محدود فاصلے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

یہی وہ مرحلہ تھا جب مولانا فضل اللہ نفاذ شریعت یا نظام عدل کے مقامی مطالبے یا تحریک کے ساتھ ساتھ طالبان کے علاقائی نیٹ ورک کا باقاعدہ حصہ بن گئے۔ تو دوسری طرف بعد کی پرتشدد تحریک کے دوران ان غیر ملکیوں نے نہ صرف یہ کہ فورسز کے خلاف کارروائیوں میں باقاعدہ حصہ لیا بلکہ وہ سوات میں سرکاری اہلکاروں اور سیاسی کارکنوں کو ذبح کرنے سمیت اس طرح کے دوسرے غیر مروجہ طریقوں کے بھی ذمہ دار تھے۔

3 جولائی کو شروع ہونے والے لال مسجد آپریشن کے بعد سوات میں پولیس فورس اور دوسرے ریاستی اداروں کے خلاف کارروائیاں شروع ہوئیں اور اس کا باقاعدہ آغاز 12 جولائی کو مینگورہ میں پولیس کی گاڑی پر خودکش حملے سے ہوا جس میں 4 پولیس اہلکار جاں بحق ہو گئے۔

جولائی سے لے کر اکتوبر کے پہلے ہفتے تک طالبان نے نہ صرف یہ کہ ریاستی اداروں خصوصاً پولیس کو مفلوج کر کے رکھ دیا بلکہ انہوں نے شرعی عدالتوں کے قیام اور فیصلوں سمیت بعض دوسرے ایسے اقدامات بھی کیے جو ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں آتے تھے۔ اکتوبر 2007ء ہی کو سوات میں فوجی کارروائیوں کی ابتداء کی گئی۔ فورسز کی تعیناتی اور نقل و حرکت کے دوران ان پر متعدد خودکش حملے کیے گئے جبکہ سنٹرل پولیس لائن اور دوسری سرکاری عمارتوں پر بھی حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا فضل اللہ کے زیر قیادت طالبان نے فورسز اور حکومت کے خلاف کارروائیاں

کرنے اور زیرِقبضہ علاقوں کا نظام چلانے کے لیے تربیت یافتہ کمانڈروں کی باقاعدہ ڈیوٹیاں لگا کر مختلف علاقے تقسیم کیے۔ سوات کو پچاس زون میں تقسیم کیا گیا جہاں پر 25 کے قریب عسکری کمانڈرز کو معاملات چلانے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ یوں علاقہ پر قبضہ اور نظام قائم رکھنے کا ایک کامیاب تجربہ کیا گیا۔ اندازاً ایک سو سے لے کر ایک سو پچاس تک مسلح طالبان ایک ایک کمانڈر کی قیادت میں لڑتے رہے۔ جبکہ عدالتیں چلانے اور دوسرے معاملات نمٹانے کا نظام بھی وضع کیا گیا۔ امام ڈھیری، کبل، قمبر مانڈئی، مٹہ، چارباغ، خوازہ خیلہ، پیوچار اور شکردرہ وہ مقامات تھے جہاں طالبان کمانڈرز اپنے قیام اور کمانڈ کے معاملات نمٹاتے رہے۔

جن عسکری کمانڈرز نے اکتوبر 2002ء سے لے کر فروری 2009ء تک کے تمام عرصہ کے دوران کامیاب کارروائیاں کر کے شہرت پائی ان میں کمانڈر محمود، ابن امین، اکبر حسین، ابن عقیل، قاری مشتاق، سیف الملوک، تورملا، حسینی، عثمان، عرفان، امیر کریم اور غزنوی سرفہرست ہیں۔

ان کارروائیوں کے تناظر میں ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ جب یہ کارروائیاں شروع ہوئیں تو صوبہ سرحد میں مجلس عمل کی حکومت تھی لیکن اس نے ان کارروائیوں پر توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ غیرعلانیہ اس کو سپورٹ کرتی رہی۔ مگر جب مرکزی حکومت کی طرف سے سوات کے حوالے سے تشویش کا اظہار کیا گیا تو مجلس عمل کی حکومت کی درخواست پر ہی سوات میں فوج کو بلایا گیا۔

مگر......طالبان نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا اور پھر جب 2008ء میں اپریشن کا دوسرا فیز شروع ہوا اور طالبان نے ریاستی اداروں، انتظامیہ، سرکاری اہلکاروں کے ساتھ عوامی نیشنل پارٹی کے اہم لیڈروں اور کارکنوں کو بھی نشانہ بنایا اور درجنوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن ...... جے یو آئی اور جماعت اسلامی کے کسی لیڈر یا کارکن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جو سوات میں فوج بلانے کے ذمہ دار تھے۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

باب18

فورسز کی پالیسی اور آپریشن پر تحفظات کا اظہار

وزیرستان کی طرح سوات میں بھی تقریباً دو سال تک جاری آپریشن جہاں عسکریت پسندوں کی قوت توڑنے میں ناکام رہا وہاں پاک آرمی اور دوسرے سکیورٹی اداروں کی کارکردگی اور پالیسی کے بارے میں بھی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر خدشات اور تحفظات کا ایک نیا سلسلہ شروع کر گیا۔ جولائی 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد پر کیے گئے آپریشن کے فوراً بعد تحریک نفاذ شریعت محمدی ملاکنڈ ڈویژن کے بانی مولانا صوفی محمد کے داماد اور شاگرد مولانا فضل اللہ نے اپنے ایف ایم ریڈیو پر حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور حامیوں کو سرکاری اداروں اور اہلکاروں پر حملے کرنے کا حکم جاری کیا۔ فضل اللہ کے کہنے پر 12 جولائی 2007ء کو سوات پولیس کی ایک گاڑی پر پہلا باضابطہ خودکش حملہ کر کے ایک ایسی جنگ کی ابتداء کردی گئی جس نے 2 سال تک سوات کو لہو میں ڈبو کر رکھ دیا۔ فضل اللہ کے ساتھیوں نے پولیس کے علاوہ سکولوں، این جی اوز، سیاسی کارکنوں اور پلوں کو نشانہ بنانا شروع کیا اور پے در پے حملے کر کے پولیس کو ان کے تھانوں تک محدود کردیا۔ دیکھتے دیکھتے مقامی اور غیر مقامی طالبان نے ضلعی ہیڈکوارٹر مینگورہ کے آس پاس کے علاقوں کانجو، کبل، ڈھیرئی اور بانڈئی کو قبضے میں لے لیا اور یہ لوگ رات کو باقاعدگی سے مسلح گشت کرنے لگے۔ علاقے میں حکومت کی موجودگی اور رٹ چند ہی ہفتوں میں ایک سوالیہ نشان بن کر رہ

گئی۔ وزیرستان اور باجوڑ ایجنسی سے تحریک طالبان کے کمانڈر اور مسلح کارکن سوات پہنچنا شروع ہو گئے تو پر تشدد کارروائیوں میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ اکتوبر 2007ء کے پہلے ہفتے سوات میں فوج اور دوسری پیرا ملٹری فورسز کی تعیناتی کا سلسلہ شروع ہوا تو پولیس اور فوجی دستوں پر حملوں میں مزید اضافہ دیکھنے کو ملا۔

طالبان کی پر تشدد کارروائیوں کو مدنظر رکھ کر فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جاتا رہا اور یہ تعداد پندرہ سے تیس ہزار تک پہنچا دی گئی اس کے باوجود طالبان کی قوت بڑھتی گئی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

آئی ایس پی آر کے جنوری 2008ء کے دوران جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس عرصہ کے دوران سکیورٹی فورسز کو بے پناہ جانی اور مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اس عرصہ میں پاک آرمی کے 80، پولیس کے 60، فرنٹیئر کانسٹیبلری کے 35 جبکہ فرنٹیئر کور کے 12 اہلکار مار دیئے گئے۔ غیر سرکاری اعداد و شمار اس سے کئی گنا زیادہ تھے۔ بعض ذرائع کے مطابق سوات میں جاں بحق ہونے والے فورسز اہلکاروں کی تعداد چار سو سے زائد رہی جبکہ مجموعی طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد پندرہ سے اکیس سو تک بتائی جاتی تھی اس عرصہ کے دوران فورسز اور دوسرے ریاستی اداروں کے خلاف 17 خودکش حملے کیے گئے جبکہ 150 ریموٹ کنٹرول بم دھماکے بھی ہوئے۔

ابتداء میں فورسز اور ریاستی اداروں کے خلاف مسلح کارروائیوں میں حصہ لینے والے عسکریت پسندوں کی تعداد صرف 280 تھی تاہم بعد میں یہ تعداد بڑھتے ہوئے 3000 سے 4000 تک پہنچ گئی۔ عملی کارروائیوں میں حصہ لینے والے طالبان کی تعداد کبھی بھی پندرہ سو سے زائد نہیں رہی۔ اس کے برعکس فوج اور دوسری فورسز کے اہلکاروں کی تعداد اٹھارہ سے تیس ہزار تک بتائی گئی۔ فوج کی تعداد اور چیک پوسٹوں کے قیام کے ساتھ طالبان کی قوت کم ہونے کے بجائے بڑھتی رہی۔ سوات امن معاہدے کے دوران فروری 2008ء میں فوج کے چار بڑے مراکز کے علاوہ سوات کے مختلف مقامات پر قائم کی گئی چیک پوسٹوں کی تعداد 12 سے 14 تک تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی بڑی فوجی تعداد جیٹ طیاروں، ہیلی کاپٹرز اور جدید

ترین اسلحہ کے ہوتے ہوئے بھی نہ صرف حالات بدتر ہوتے گئے بلکہ آپریشن کے دوران جاں بحق ہونے والے عسکریت پسندوں کی شرح نہ ہونے کے برابر رہی۔ حکومتی اور عسکری دعوؤں کے برعکس طالبان اور آزاد ذرائع کے مطابق اس تمام عرصہ میں سوات کے مختلف علاقوں میں جاں بحق ہونے والے طالبان کی تعداد کسی بھی طرح 100 سے زائد نہیں رہی۔ فوج کا اطلاعاتی ادارہ آئی ایس پی آر متعدد طالبان کی ہلاکت کے دعوؤں کے باوجود ان کی نعشیں دکھانے میں ہمیشہ ناکام رہا جبکہ تحریک طالبان ایسے ہر دعوے کے بعد چیلنج کرتی کہ اگر فورسز نے ان کے ساتھیوں کو مارا ہے تو وہ نعشیں میڈیا کو دکھائی جائیں جو کہ بقول آئی ایس پی آر ہلاک کیے جا چکے ہیں۔

دیکھتے دیکھتے سوات اور پورے ملک میں یہ تاثر بہت عام ہوگیا کہ جہاں طالبان ہوتے ہیں وہاں فوج ہوتی نہیں مگر جہاں فوج ہوتی ہے وہاں طالبان پہنچ جاتے ہیں۔'' اس تاثر کی ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔ بے شمار ایسے واقعات سامنے آئے جن سے ثابت ہوا کہ فوج عام لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا تو درکنار ان کے رابطے اور مطالبے پر ان کی مدد کرنے کے لیے بھی حرکت میں نہیں آتی جو لوگ طالبان کے خلاف فوج کی کھلم کھلا حمایت کر رہے تھے وہ بے یار و مددگار ہی رہے۔ فوج کے دستے محض فوجی چیک پوسٹوں تک محدود رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن شہریوں نے فوج کو ہار پہنا کر ان پر گل پاشی کی تھی وہ ایک ایک کر کے طالبان کے ہاتھوں انتقام کا نشانہ بنتے گئے۔

''مرد مزاحمت'' محمد افضل خان جیسے شخص کو بھی فوج تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ سترہ مہینوں کی مدت کے دوران افضل خان لالہ اور ان کے خاندان کے مختلف گھروں، مارکیٹوں اور حجروں پر کم از کم سولہ حملے کیے گئے جن میں متعدد افراد شہید کیے گئے تاہم ہر بار حملہ کے باوجود پلڑا خان لالہ کا بھاری رہا کہ افضل خان لالہ نے فورسز پر انحصار کرنے کے بجائے خود بھی دفاعی حکمت عملی وضع کی ہوئی تھی۔ اس صورتحال کے باعث یہ سوال وقتاً فوقتاً اٹھایا جاتا رہا کہ اگر فورسز خود کو اور حکومت کی حامی شخصیات تک کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتیں تو عام لوگوں کو کیونکر سکیورٹی فراہم کی جا سکتی ہے؟

ایک اور واقعے کے دوران اے این پی سے تعلق رکھنے والے صوبائی وزیر ایوب

خان آشاڑے کے دو نوجوان بھتیجوں اور ان کے ایک دوست کو دن کے دو بجے مٹہ تحصیل کے علاقے راحت کوٹ سے آشاڑی آتے وقت عسکریت پسندوں نے گولیاں مار کر شہید کر دیا تاہم جائے وقوعہ سے چند ہی فرلانگ پر موجود باغ ڈھیری فوجی چیک پوسٹ کے فوجی اہلکاروں نے حرکت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اسی چیک پوسٹ کی حدود میں موجود محمد افضل خان کے دوسرے رشتہ داروں خورشید خان اور اکرام خان کی رہائش گاہوں پر عسکریت پسند چار بار حملہ آور ہوئے تاہم فوج نے حرکت کرنا بھی گوارا نہیں کیا اور متاثرین کو اپنی مدد آپ کے تحت حملے پسپا کرنے پڑے۔ اس سے قبل بذاتِ خود افضل خان لالہ پر بھی براہ راست مٹہ میں حملہ کیا گیا تھا۔

طالبان نے اس دوران حکومت کے حامی معززین اور عام لوگوں کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دیں۔ ان تمام معززین کو طالبان کمانڈروں کے پاس جا کر معافیاں مانگنا پڑیں جنہوں نے فوج کی آمد کے وقت ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ ایسے لوگ مارے گئے یا علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیے گئے جنہوں نے معافیاں مانگنے سے انکار کیا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ان سترہ مہینوں میں صرف اے این پی سے تعلق رکھنے والے ان عہدیداروں اور کارکنوں کی تعداد سو سے زائد رہی جن کو ہلاک کیا گیا یا غوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جتنی تعداد میں آپریشن کے دوران طالبان کو مارا گیا اے این پی کے ہلاک شدگان کی تعداد ان سے زائد تھی۔

بے شمار ایسے واقعات مشاہدے میں آئے کہ فوجی دستوں نے رہی سہی ضلعی انتظامیہ اور طالبان مخالف معززین کے رابطے پر ان مقامات پر کارروائی سے چشم پوشی اختیار کی جہاں یا تو عسکریت پسند گروپ کی شکل میں حملہ آور ہو کر موجود تھے یا کسی کارروائی میں حصہ لے رہے تھے۔

دور دراز کے علاقے تو ایک طرف فوجی جوان وہاں بھی جانے سے گریز کی پالیسی پر عمل پیرا تھے جہاں پر ان کی چیک پوسٹوں سے چند ہی فرلانگ پر طالبان کسی گھر پر حملہ آور ہوتے۔ لوگوں کو بیچ سڑک کوڑے لگا رہے ہوتے، کسی اجلاس میں شریک ہوتے یا شرعی عدالت چلا رہے ہوتے۔

مثال کے طور پر کانجو جیسے قریبی علاقے میں تین قصابوں کو بے شمار لوگوں کی موجودگی میں دن کے گیارہ بجے سڑک پر لٹا کر کوڑے مارے جا رہے تھے تاہم چند فرلانگ کی مسافت پر موجود فورسز کے اہلکار عوام کی طرف سے اطلاع دینے پر بھی حرکت میں نہیں آئے۔ اپنے حامیوں کے تحفظ سے چشم پوشی کا یہ نتیجہ نکلا کہ عوام کا فوج پر اعتماد اٹھ گیا اور انہوں نے جان بچانے کے لیے فورسز کے بجائے طالبان کے ساتھ تعاون، خاموشی یا نقل مکانی کا راستہ اپنا لیا۔

فورسز کی ناکام حکمت عملی کا اندازہ دو اور واقعات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ سوات کے علاقہ کبل سے تعلق رکھنے والے ایم پی اے وقار احمد خان کے گھر پر بے شمار عسکریت پسند حملہ آور ہو گئے۔ انہوں نے گھر اور حجرے کا محاصرہ کیا اور بڑے آرام سے اور حجرے کو آگ لگا دی۔ اس دوران میزبانوں اور حملہ آوروں کے درمیان کافی وقت تک فائرنگ کا تبادلہ جاری رہا تاہم فورسز نے صوبائی حکومت کی طرف سے اطلاع ملنے اور سوات کے ایم پی ایز کی درخواستوں کے باوجود چیک پوسٹوں اور دوسرے ٹھکانوں سے حرکت کرنے سے انکار کیا جس کے نتیجے میں ایم پی اے کے بھائی سمیت چار رشتہ داروں کو شہید کر دیا گیا۔

دوسرے واقعہ کے دوران مٹہ تحصیل کے تین اطراف میں موجود فورسز نے نومبر 2008ء کو اس پیر سمیع اللہ کو بچانے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی جس نے اس تمام عرصہ کے دوران ساتھیوں کو اکٹھا کر کے عسکریت پسندوں کے خلاف کئی بار مزاحمت کی۔ پیر سمیع اللہ کو حکومت اور فورسز نے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی اور وہ واحد مزاحمتی گروپ کی شکل میں طالبان کے خلاف برسرپیکار تھے۔ تاہم جب وہ کئی گھنٹوں کی شدید مزاحمت اور متعدد ساتھیوں کی ہلاکت کے بعد عسکریت پسندوں کے گھیرے میں آ گئے اور انہوں نے کچھ ہی فاصلے پر موجود عسکری مرکز سے تعاون کے لیے رابطہ کیا تو کوئی بھی عملاً ان کی مدد کو نہیں پہنچا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیر سمیع اللہ کو مارا گیا اور ان کی لاش بعد ازاں قبر سے نکل کر ایک درخت پر لٹکا کر عبرت کی مثال بنا دی گئی۔ اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں جن سے یہ اشارہ وضع ہوا کہ فورسز طالبان کو محفوظ راستہ فراہم کرنے کی غیر علانیہ پالیسی پر عمل پیرا تھیں۔

فورسز اور وفاقی حکومت کی عدم دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس

تمام عرصہ کے دوران تمام ریاستی ادارے مولانا فضل اللہ کے اس ایف ایم ریڈیو کو بند کرنے میں ناکام رہے جس سے طالبان اس جنگ میں ایٹم بم سے زیادہ موثر کام لیتے رہے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ پاک فوج کے ترجمان اطہر عباس نے 22 فروری 2009ء کو اسلام آباد میں میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے پاس فضل اللہ کے ایف ایم ریڈیو کو جام کرنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔ اطہر عباس کا یہ بھی کہنا تھا کہ طالبان سے نمٹنے کے لیے فورسز کے پاس وہ سہولیات موجود نہیں ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مقامی آبادی فوج کے بجائے طالبان کے ساتھ تعاون کررہی تھی اس لیے آپریشن کے وہ نتائج برآمد نہ ہوسکے جن کی توقع کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ تعاون کیوں ہوا اس کا کوئی جواب کسی سرکاری اہلکار نے نہیں دیا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ صوبہ سرحد میں اے این پی کی حکومت کے قیام کے بعد اسفندیار ولی خان، حیدر ہوتی اور گورنر سرحد کو کئی بار فوجی سربراہان اور حکومتی حکام سے یہی شکایت کرتے پایا گیا کہ فورسز سوات میں ٹارگٹ کے بجائے عام لوگوں کو نشانہ بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ صدر مملکت آصف علی زرداری نے اس عرصہ کے دوران چار بار سرحد حکومت کے ذمہ داران، سوات کے ایم پی ایز اور سوات کے نمائندہ جرگہ سے اسلام آباد اور پشاور میں ملاقاتیں کیں تو ان کو صاف صاف کہہ دیا گیا کہ فوج کی حکمت عملی ناکام جارہی ہے اور فورسز طالبان کے خاتمے کے بجائے ان کی قوت میں اضافے کا سبب بن رہی ہیں۔ کور کمانڈر پشاور اور گورنر سرحد کے ساتھ بھی اس بنیادی ایشو پر صوبائی وزراء اور ایم پی ایز کو احتجاج کرتے پایا گیا جبکہ مشیر داخلہ رحمان ملک کو توقتاً فوقتاً سوات کے عوام، ضلعی انتظامیہ اور صوبائی حکومت کے خدشات سے آگاہ کیا جاتا رہا اس کے باوجود طالبان کی کارروائیاں بڑھتی گئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوبائی حکومت کو نہ چاہتے ہوئے فروری 2009ء میں مولانا صوفی محمد کے ذریعے مولانا فضل اللہ کی شرائط اور بالادستی مانتے ہوئے امن کا وہ عجیب وغریب معاہدہ کرنا پڑا جس پر دنیا بھر میں شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔

یہاں اس بات کی نشاندہی کرنا لازمی ہے کہ امام ڈھیری مرکز، پیوچار کیمپ اور سرہ مرکز اور قمبر وہ مقامات تھے جہاں طالبان کی مرکزی قیادت، جنگی کمانڈر اور اسلحہ کے ذخائر موجود رہا کرتے تھے۔ تاہم ان مقامات کو بھی تباہ کرنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ یہ

وہ مقامات تھے جن کو نشانہ بناتے وقت عام لوگوں کے مجموعی نقصان (Collective Dameges) کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر ان جگہوں کو سترہ مہینوں کے دوران ختم کرنے یا غیر فعال بنانے کے بجائے عملاً محفوظ رکھا گیا۔ اس تمام صورتحال پر صوبائی حکومت وقتاً فوقتاً احتجاج کرتے دکھائی دی۔ یہاں تک کہ سابق وزیر محمد افضل خان لالہ نے جنوری 2009ء کو سیدوشریف میں پاک فوج کے سربراہ اشفاق پرویز کیانی کی دعوت ا صدر آصف زرداری کے رابطوں پر کی گئی ملاقات کے دوران اعلیٰ فوجی افسران اور صوبائی ر اء کی موجودگی میں صاف صاف کہہ دیا کہ عسکری قیادت کو یہ تاثر دور کرنے کے لیے اب ٹھوس قدم اٹھانا ہی پڑے گا کہ فوج اور طالبان آپس میں اتحادی ہیں اور ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔

طالبان کے برعکس فورسز سوات کے عام شہریوں کے لیے اس پورے عرصے کے دوران رحمت کے بجائے زحمت کا سبب بنتے دکھائی دیں۔ 12 چیک پوسٹوں پر عام لوگوں کی تلاشیاں لیتے وقت کسی بھی احتجاج پر شہریوں کو بے عزت کرنا اور مارنا پیٹنا فورسز کے خلاف وہ شکایت تھی جو روزانہ کے حساب سے سامنے آتی رہیں۔ فورسز مریضوں اور زخمیوں کے علاج معالجے کے راستے میں بھی مسلسل رکاوٹ ڈالتی رہیں جبکہ سرچ آپریشن کے نام پر گھروں کے اندر گھسنے کے دوران نامناسب رویہ معمول کے واقعات بن گئے۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ فورسز نے طالبان کی موجودگی اور گرفتاری کے نام پر مختصر نوٹس پر گاؤں کے گاؤں خالی کرا دیئے تاہم بعد ازاں جب لوگ اپنے گھروں میں چلے گئے تو وہاں یا تو طالبان قابض بنے بیٹھے تھے یا ان کے گھروں کو اڑایا جا چکا تھا۔ اس تمام صورتحال نے طالبان کے بعد فورسز کے خلاف بھی پرامن شہریوں کو نہ صرف مایوس کیا بلکہ وہ ردعمل اور مجبوری کے عالم میں لاکھوں کی تعداد میں سوات سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ طالبان اور فورسز دونوں ہی ان کی تکالیف اور تباہی کے ذمہ دار ہیں۔

باب 19

2008ء سوات کی تاریخ میں بدترین تباہی کا سال

سال 2008ء سوات کے باشندوں کے لیے تاریخ کا بدترین سال ثابت ہوا۔ یہاں بدامنی کا 2007ء کے دوران اس وقت آغاز ہوا جب تحریک نفاذ شریعت محمدی کے امیر اور بانی مولانا صوفی محمد کے داماد فضل اللہ نے شریعت کے نفاذ کے لیے کروڑوں کا چندہ اکٹھا کرنے کے بعد پرتشدد کارروائیوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے اکتوبر 2007ء کو امام ڈھیری مرکز (مینگورہ) میں ایک اجتماع کے دوران پاکستان کو کافرانہ نظام اور قوانین کا ملک قرار دے کر اس کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ جنرل مشرف کی حکومت نے سیاسی اور مذاکراتی عمل کے بجائے ایم ایم اے کی صوبائی حکومت کی مشاورت سے فورسز تعینات کرنے کے احکامات جاری کیے جس کے بعد فورسز اور طالبان عسکریت پسندوں کے درمیان جھڑپوں، خودکش حملوں اور ٹارگٹ کلنگ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابتداء میں طالبان سوات کے 15 فیصد علاقوں تک محدود تھے مگر فوج آنے کے بعد سوات کے 70 فیصد علاقوں پر عملاً طالبان کا قبضہ ہو گیا۔

محتاط اندازے کے مطابق سال 2008ء کے دوران 17 لاکھ کی آبادی کے ضلع سوات میں فورسز اور طالبان کی کارروائیوں کے نتیجے میں 1310 عام لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس دوران تقریباً 480 سے زائد فوجی جوان، ایف سی اہلکار اور پولیس کے سپاہی مارے گئے۔ 4 لاکھ افراد ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے جبکہ دہشت گردوں نے اے این پی (خصوصاً) پی پی پی اور مسلم لیگ (ق) کے 125 عہدیداروں اور سیاسی کارکنوں کو ٹارگٹ کلنگ کے

ذریعے قتل کردیا۔ 18 فروری 2008ء کے الیکشن میں اے این پی نے امن کے قیام کا نعرہ لگا کر صوبائی اسمبلی کی تمام 8 نشستیں جبکہ قومی اسمبلی کی 2 میں سے ایک نشست جیت لی لیکن 2 وزراء سمیت تمام ارکان اسمبلی کو 2008ء کے دوران حکومت سازی کے بعد سوات جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ (دوسرے ایم این اے کا تعلق پی پی پی سے ہے)۔

2008ء کے دوران 5 ارب روپے کی سرکاری اور غیر سرکاری املاک تباہ کردی گئیں جبکہ اس دوران میں 188 سکولوں کو بم لگا کر یا نذر آتش کرکے تباہ کردیا گیا جن میں 85 گرلز سکولز بھی شامل تھے۔ 8 بینکوں کو نذر آتش کردیا گیا جبکہ 27 رابطہ پل اڑا دیئے گئے جس سے رابطے کا سلسلہ ہی ٹوٹ کر رہ گیا۔ سوات کے 800 بڑے چھوٹے ہوٹلوں کو تالے لگائے گئے جن میں 10 کو نذر آتش کردیا گیا۔ ہوٹل انڈسٹری کو 2 ارب کا نقصان ہوا جبکہ 25 ہزار افراد (ہوٹل انڈسٹری) روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 188 سکولوں کی تباہی سے ایک لاکھ سے زائد طلباء اور طالبات تعلیم سے محروم کردیئے گئے۔ (400 نجی سکولوں کی بندش اس کے علاوہ ہے)۔

اس دوران 34 افراد کو عسکریت پسندوں نے بے دردی سے ذبح کرکے ان کی نعشیں چوکوں پر لٹکا دیں جبکہ 5 مختلف مقامات پر طالبان نے شرعی عدالتیں قائم کردیں۔ ان عدالتوں میں 2008ء کے دوران تقریباً 35 سے زائد افراد کو کوڑوں سمیت سخت سزائیں سرعام دی گئیں۔ اس دوران مختلف کارروائیوں کے دوران 4 مقامی صحافیوں کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ ایک صحافی کو فورسز نے مینگورہ شہر میں گولی مار دی۔ دوسرا پولیس افسر کی نماز جنازہ کے دوران خودکش حملے میں مارا گیا جبکہ تیسرا گٹ پیوچار میں جیٹ طیاروں کی بمباری سے طالبان کے زیرحراست ہونے کی وجہ سے جاں بحق ہوگیا۔ اس دوران طالبان نے کیبل آپریٹرز کو نیوز اور دوسرے چینلز بند کرنے پر مجبور کیا جبکہ موسیقی، ٹی وی یہاں تک کہ ریڈیو پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ اس کے برعکس مولانا فضل اللہ کے مرکزی ایف ایم ریڈیو سمیت 5 طالبان ریڈیوز کھلے عام کام کرتے رہے اور ان ریڈیوز کے ذریعے اہم اعلانات کیے جاتے رہے۔

30 ہزار فوجی اور ایف سی جوان جدید ہتھیاروں، جہازوں اور ہیلی کاپٹرز کے ہوتے ہوئے 4000 مسلح انتہاپسندوں پر کنٹرول قائم کرنے میں ناکام رہے۔ جبکہ سرکاری ذرائع کا

کہنا تھا کہ سوات میں کل طالبان (Active) کی تعداد 10 سے 13 ہزار کے قریب ہے۔

اس دوران مقامی لوگوں کو سیاحت کی مد میں 3 ارب، جنگلات کی آمدنی کی مد میں 2 ارب، فریش فروٹ کے سڑنے کے باعث تقریباً دو ارب 50 کروڑ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جبکہ آثار قدیمہ کے پانچ مراکز (بریکوٹ، سیدو شریف، مالم جبہ، مدین، میاندم کو بھی بم لگا کر تباہ کر دیا گیا۔ ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بھی ایک ارب سے زائد کا نقصان پہنچایا گیا۔ (سوات میں 3000 کے قریب صرف ٹیکسی کاریں تھیں جو کہ نان کسٹم پیڈ تھیں۔ اس دوران 85 پولیس اہلکاروں، 35 نرسوں، 18 خواتین کونسلرز، 95 لیڈی ٹیچرز، 10 فاریسٹ افسران، اہلکاروں اور 95 ہوٹلز مینجرز نے تحریری استعفے دے کر سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کی جس سے ریاستی نظام بدترین صورتحال سے دوچار ہو کر رہ گیا۔ یہ تمام استعفے طالبان کو براہ راست دیئے گئے۔ اسی طرح اے این پی اور پی پی پی کے 60 سے زائد عہدیدار نہ صرف مستعفی ہو گئے بلکہ سرکاری ملازمین اور سیاسی عہدیداروں نے مقامی اخبارات میں اپنے استعفوں کے اشتہارات بھی چھپوا دیئے۔

طالبان سرکاری اداروں کو براہ راست نہ صرف احکامات جاری کرتے رہے بلکہ حکم نہ ماننے کی صورت میں ان کو قتل کرنے اور اغوا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا۔ 6 پولیس سٹیشنوں پر سے محکمانہ بورڈ اتار کر ان پر طالبان سٹیشن جیسے نام لکھے گئے جبکہ ان عمارتوں پر سے پاکستان کا قومی پرچم اور دفاتر سے بانی پاکستان کی تصاویر بھی اتاری گئیں۔

جنوری 2008ء سے لیکر جنوری 2009ء تک کے ایک سال کے دوران سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 18 خودکش حملے کیے گئے جبکہ 150 ریموٹ کنٹرول بم حملے اور دوسرے حملے کیے گئے۔

انٹیلی جنس ذرائع کے مطابق سوات میں تربیت یافتہ اور مسلح عسکریت پسندوں کی تعداد 4000 ہے۔ انٹیلی جنس اداروں اور سرحد حکومت کے متعلقہ محکموں کی جانب سے کیے گئے حالیہ دعوے کے مطابق 3600 مسلح لوگ وہ ہیں جن کو کئی مہینوں سے باقاعدگی سے القاعدہ، طالبان اور دوسری عسکری تنظیموں کی جانب سے ہر مہینے کے پہلے جمعہ کو تنخواہیں ادا کی جاتی رہی ہیں۔ تنخواہ وصول کرنے والے عسکریت پسندوں کو تین مختلف درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے

درجے کے لوگوں کو 12 سے لیکر 15 ہزار تک دوسرے درجے کے افراد کو سات سے 9 ہزار تک جبکہ تیسرے درجے کے لوگوں کو فکسڈ 3000 روپے تنخواہ دی جاتی رہی۔

9-2008ء کے دوران سوات میں طالبان کی جانب سے عدالتوں کے قیام اور سزاؤں پر عمل درآمد کے علاوہ اسلام کے نام پر دوسرے قوانین کے نفاذ کا سلسلہ تیز ہوتا رہا۔ طالبان نے 9 جنوری کو تمام گرلز سکولوں کی بندش کے لیے 15 جنوری کی ڈیڈلائن دے دی جس پر دنیا بھر سے شدید ردعمل سامنے آیا۔ 20 جنوری کو ایک اور حکم سامنے آیا جس میں کہا گیا کہ 25 جنوری کے بعد ہر اس شخص کو قابل سزا تصور کیا جائے گا جو کہ داڑھی نہیں رکھتا اور سر پر ٹوپی نہیں پہنتا۔ یہ اعلان تحصیل مٹہ میں کیا گیا اس سے قبل 12 سو سے زائد باربر شاپس کو بند کیا گیا تھا۔ اتنی ہی تعداد میں آڈیو، وڈیو، سی ڈی شاپس بند کی گئیں جبکہ خواتین کی شاپنگ اور گھومنے پھرنے کو بھی خلاف اسلام قرار دے کر 4 پلازوں میں بم دھماکے کروائے گئے۔ مجموعی طور پر سوات کی 4 تحصیلوں پر عملاً طالبان حاکم بن گئے۔ یہاں تک کہ ضلعی ہیڈکوارٹر مینگورہ میں بھی طالبان مختلف اوقات میں ٹولیوں کی شکل میں گشت کر کے احکامات جاری کرتے اور مخالفین کو سرعام گولیاں مارتے رہے۔

ایک اطلاع کے مطابق تحریک طالبان پاکستان کے امیر بیت اللہ محسود نے دوران مزاحمت سوات طالبان کی درخواست پر تنخواہوں کی ادائیگی اور دوسرے اخراجات چلانے کے لیے 12 جنوری 2009ء کو 20 ملین کا فنڈ جاری کر دیا تھا۔ تاہم طالبان ذرائع اس قسم کی اطلاعات کو رد کرتے رہے۔ 9-2008ء کے دوران سوات بدترین حالات سے دوچار ہو کر امن، خوشحالی، ترقی اور تعلیم کی دوڑ میں دوسرے علاقوں سے برسوں پیچھے چلا گیا۔ سیاحت، زراعت، باغبانی، دستکاری، جنگلات، ماہی گیری اور انڈسٹری کے شعبے ختم ہو کر رہ گئے۔ وزیر اطلاعات صوبہ سرحد کے مطابق 2008ء کے دوران سوات کے عوام کو 32 ارب سے زائد کا نقصان پہنچا۔ حکومت اور طالبان کے درمیان مفاہمت کے باوجود نہ تو متاثرہ افراد کی واپسی کو ممکن بنایا جا سکا اور نہ ہی ان شعبوں کی بحالی ممکن ہو سکی جو شورش کے باعث تباہ ہو گئے تھے۔

باب 20

سوات امن معاہدہ اور پارلیمینٹ کی منظوری

ایک اور تاریخی حقیقت تو یہ بھی ہے کہ تنگ نظری اور ملائیت کو کبھی بھی عوام کی مؤثر حمایت حاصل نہیں رہی۔ اس لیے وہ حکمرانوں کے قرب کو ہی اولین ترجیح بناتی ہے اور جب اس قرب سے اس کو سرپرستی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے فکری اور نظریاتی غلبے کے امکانات تلاش کرنا شروع کر کے اور اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ طاقت کے حصول کو بھی اولین مقصد بنا لیتی ہے۔ زیادہ تاریخی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ یہ گروپ امریکی ڈالروں، سعودی ریالوں اور یورپی اسلحہ کے ساتھ 'حکومت پاکستان' کی سرپرستی میں تیار ہوئے تھے اور انہیں سوویت یونین کے خلاف جنگ میں استعمال کیا گیا تھا۔ پھر ایک مرحلہ وہ بھی آیا تھا جب 'طالبان' کی کابل میں حکومت قائم ہوئی تو نظریاتی تسلط کا عمل بھی شروع ہو گیا تھا۔ یہی وہ موقع تھا کہ جب بیرون افغانستان بھی مجاہدین کی مداخلت کے چرچے ہوئے لیکن جب نائن الیون کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملے کیے تو اکثریتی گروپ پاکستانی علاقوں میں آ گئے اور کچھ دیر تک خود کو منظم اور مضبوط کرتے رہے اس دوران میں پاکستانی حکومت نے انتخابات کروائے تو صوبہ سرحد میں مخصوص مقاصد کے تحت ایم ایم اے جس کا قیام کچھ اداررول کی سرپرستی میں ہوا تھا کامیاب ٹھہری تھی۔ اس حکومت میں شامل اکثریتی گروپس طالبان کے نظریاتی حمایتی تھے انہوں نے سرحد میں بھی 'طالبانائزیشن' کرنے کے دعوے شروع کر دیئے اور کچھ ایسے اقدامات بھی کیے جو نہ تو مرکزی حکومت کو پسند تھے اور نہ ہی بین

الاقوامی سطح پر اس کو پذیرائی حاصل ہوئی چنانچہ مجلس عمل کی حکومت ایک حد سے تجاوز نہیں کر سکی لیکن اس حکومت کی موجودگی میں طالبان کے مخصوص نقطہ نظر کو تحفظ اور قوت حاصل ہوتی رہی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب شمالی اور جنوبی وزیرستان میں جنگجوؤں کے خلاف فوجی کارروائی کا آغاز ہوا تو وہ گروپ جن پر بین الاقوامی دباؤ کے تحت پابندیاں عائد کی گئیں وہ بھی ان کے ساتھ ملتے چلے گئے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں سوات گروپ سامنے آیا تھا جس کو بہت سارے گروپوں کا تعاون بھی حاصل ہوا۔ 2007ء میں ان کے خلاف پہلی کارروائی ہوئی بعض حلقوں کے خیال میں ادھر کچھ کامیابیاں حاصل ہونے لگی تھیں کہ نگران حکومت نے مصلحت سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہوئے اس آپریشن کو روک کر مذاکرات کا راستہ اپنایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی تاہم اس دوران میں جنگجو گروپ اور بھی زیادہ مضبوط اور منظم ہو گئے اور انہوں نے سوات میں طاقت کا استعمال کرتے ہوئے معاشی اور معاشرتی زندگی تباہ کرنے کے ساتھ سیاسی عمل کو بھی مفلوج کر کے رکھ دیا جس کے نتیجہ میں فوجی اپریشن ایک بار پھر ناگزیر ہو گیا لیکن ایک بار پھر ایسے مرحلے پر جب 'فوجی کارروائی' نے اپنے اہداف مقرر کر کے ان کو نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا صوبہ سرحد میں اے این پی کی حکومت نے یہ سوچ کر کہ مولانا صوفی محمد کے ذریعے ان علاقوں میں امن بحال کیا جا سکتا ہے وہ ایک ایسی متوازن شخصیت ہیں جو یہ کام کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ حکومت نے امن معاہدے پر مشروط دستخط کر دیئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس معاہدے پر مولانا صوفی محمد کے دستخط ہی نہیں اور پھر یہ کہ مذکورہ معاہدہ تو مولوی فضل اللہ اور حکومت کے درمیان ہونا چاہیے تھا۔ لیکن سرحد حکومت نے جس کے پاس یہ اطلاعات بھی موجود تھیں کہ مولانا فضل اللہ جو اگرچہ مولانا صوفی محمد کے داماد ہیں لیکن ان میں اختلافات بھی موجود ہیں اس کے باوجود سرحد حکومت نے مولانا صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی کے ساتھ معاہدہ کر لیا لیکن مولانا صوفی محمد نے معاہدے پر عملدرآمد سے پہلے ہی کچھ اور مطالبات کو سرفہرست رکھ لیا۔ جیسا کہ ہم نے ان شرائط کا پہلے بھی تذکرہ کیا ہے اور یہ بھی کہا کہ زرداری اگر معاہدے پر دستخط نہیں کرتے تو ہمیں اس کی پروا نہیں حالانکہ جب تک ان کے دستخط نہیں ہوتے تو اس معاہدے کی کوئی آئینی اور قانونی پوزیشن نہیں بنتی تھی۔

8 اپریل کو صدر آصف علی زرداری نے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں واضح طور پر کہا کہ یہ معاہدہ امن سے مشروط ہے جب تک علاقے میں امن قائم نہیں ہوتا اس معاہدے پر دستخط نہیں ہوسکتے لیکن ہمارے خیال میں انہوں نے جو بھرے بازار میں راز کی بات کہہ دی تھی وہی مولانا صوفی محمد کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے کہا کہ سرحد حکومت کے خیال میں مولانا صوفی محمد ''ری کنسائل ایبل'' (Reconciable) ہیں اور وہ حکومت کے ساتھ رابطے میں رہے ہیں۔ سرحد حکومت کا خیال ہے کہ وہ امن کی بحالی میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

گویا وہ امن بحال کرنے کے لیے حکومت کے ایجنٹ بن کر گئے ہیں اور انہیں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی بات تھی جس میں سچائی تو موجود تھی لیکن یہ مولانا کو عوامی سطح پر اور مجاہدین کی صفوں میں مشکوک بناگئی۔ چنانچہ عین اسی موقع پر ہی انہوں نے امن کیمپ ختم کرنے اور سوات چھوڑنے کا اعلان کردیا اور کہا کہ زرداری صاحب فوری طور پر معاہدے پر دستخط کریں اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو سرحد حکومت مستعفی ہوجائے۔

ادھر ایک اور اہم ڈویلپمنٹ یہ بھی ہوئی کہ طالبان نے بونیر میں داخل ہونے کی کوشش کی تو مقامی مزاحمتی گروپ کھل کر سامنے آگئے اور انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی تو طالبان کو واپس سوات میں ہی پلٹنا پڑا۔ یاد رہے کہ بونیر وہ علاقہ ہے جہاں مولانا صوفی محمد نے ''نظام عدل'' کے نفاذ کا عندیہ دیا تھا اور اس کو ان علاقوں میں شامل کیا تھا جہاں بقول ان کے شریعت محمدی کا نفاذ ہوگا حالانکہ یہ علاقہ معاہدے میں شامل نہیں تھا۔ معاہدے میں ملاکنڈ ڈویژن اور کوہستان بشمول ہزارہ کے علاقے شامل تھے۔

بہرحال.....امن کیمپ کے خاتمہ سے صوبائی حکومت پریشانی میں مبتلا ہوگئی اور اس کے خصوصی نمائندے افراسیاب خٹک اور صوبائی وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین جو اس معاہدے میں پیش پیش تھے مولانا صوفی محمد سے ملاقات کے لیے ملاکنڈ آئے جو اپنے آبائی علاقے دیر کے بجائے تحریک نفاذ شریعت محمدی کا مرکز تھا۔ لیکن ادھر مشیر داخلہ نے واضح طور پر کہہ دیا کہ معاہدہ امن کی بحالی سے مشروط تھا۔ یعنی جب تک اس علاقے میں امن بحال نہیں ہوتا اس پر صدر کی طرف سے دستخط نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ مذاکرات بار بار تعطل کا شکار ہوتے رہے۔

اس تناظر میں ایک اور تلخ حقیقت وہ ہے جو ایک تاثر میں موجود تھی کہ حکومت نے یہ معاہدہ بہ امر مجبوری کیا تھا۔ اور فوج ڈیڑھ سال کی کوششوں کے باوجود مکمل کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ اور یہ معاہدہ فاتح اور شکست خوردہ گروپ کے درمیان تھا۔ فاتح اگر چہ وقتی طور پر کچھ قبول کرنے پر تیار ہو گیا لیکن اس کی خواہش بہت کچھ کی تھی جس کا اظہار اس نے بعد میں قدم بقدم شروع کر دیا جو دوسرے فریق کے لیے ممکن نہیں تھا۔

یہ کہ جنگجوؤں نے ہتھیار نہیں پھینکے۔ امن معاہدہ کیا اور معاہدہ کرنے والوں نے ان سے ہتھیار بھی نہیں لیے یا ان کو حکومت کے حوالے کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ چنانچہ یہ کہنا کہ وہ پھر ہتھیار نہیں اٹھائیں گے قرین قیاس نہیں جبکہ وہ ایک بار پہلے بھی ایسا کر چکے ہیں بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ منظم اور مضبوط بن کر سامنے آئے تھے۔

اب کیا ہوگا؟ وہ بھی بہت جلد سامنے آجائے گا کہ فریقین کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ فورسز اگر جلد از جلد اس 'فتنہ' پر قابو پانے کی کوشش کریں گی تو مقابل فریق بھی شاید انہیں سنبھلنے کا موقع نہ دے۔

امن کیمپ ختم ہونے پر عوامی نیشنل پارٹی سب سے زیادہ خوفزدہ ہے اور تشویش میں مبتلا ہے۔ اے این پی کے سینئر رہنما اور سینیٹر حاجی عدیل نے ایک ٹی وی پروگرام میں واضح طور پر کہہ دیا کہ ہم طالبان کے ساتھ نہیں لڑ سکتے۔

ادھر صدر مملکت آصف علی زرداری نے نظام عدل ریگولیشن پارلیمنٹ سے منظوری کے لیے وزیراعظم کو بھجوا دیا جس کو تحریک نفاذ شریعت محمدی کے رہنماؤں اور خود عوامی نیشنل پارٹی نے بھی تاخیری حربوں سے تعبیر کیا اور اے این پی نے مشاورتی کمیٹی میں اس مسئلہ پر تفصیلی غور کے بعد ایک قرارداد منظور کی جس میں حکومتی اتحاد سے علیحدہ ہونے کی دھمکی بھی شامل تھی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ عوامی نیشنل پارٹی کو نظام عدل ریگولیشن پارلیمنٹ کو بھجوانے کے بارے میں وفاقی حکومت کے فیصلے پر سخت مایوسی ہوئی جو وفاقی حکومت اور ایوان صدر کے ساتھ اس کی مفاہمت کے سراسر منافی تھا۔ اس وقت فیصلہ یہ ہوا تھا کہ صدر مملکت نظام عدل ریگولیشن پر سوات میں امن کی بحالی کے بعد دستخط کر دیں گے۔ چنانچہ 16 فروری کو صوبائی حکومت اور تحریک نفاذ شریعت محمدی کے سربراہ مولانا صوفی محمد کے مابین طے پانے والے

معاہدے کے بعد ابتدائی طور پر فائر بندی کا اعلان کیا گیا اور بتدریج امن بحال ہوتا گیا۔ ہم مالاکنڈ میں امن و امان کی صورتحال میں نسبتاً بہتری پر ملاکنڈ کے عوام کی کوششوں کے مشکور ہیں۔ معاہدے کے مطابق صوبائی حکومت نے نظام عدل ریگولیشن کا مسودہ دستخط کے لیے صوبائی گورنر کی وساطت سے ایوان صدر کو کافی عرصہ پہلے بھجوایا تھا۔ ہم پاکستان پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت کی طرف سے اس بات پر بھی مایوس ہیں کہ انہوں نے اس فیصلے سے قبل اے این پی کو اعتماد میں نہیں لیا۔ ہمیں اس کا علم میڈیا کے ذریعے ہوا۔ ہم مخلوط حکومت کا حصہ ہیں اور دونوں پارٹیوں میں ایک سیاسی اتحاد بھی موجود ہے۔ صوبہ سرحد کے عوامی نمائندوں کی حیثیت سے اس اہم فیصلے میں ہمیں تاریکی میں رکھنا کسی بھی لحاظ سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نظام عدل ریگولیشن پر دستخط میں بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو چکا ہے۔ اس میں مزید تاخیر قیام امن کے عمل کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ ملاکنڈ میں تشدد کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو پورا خطہ تباہی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ ہم پارلیمینٹ کے ذریعے قانون سازی کے خلاف نہیں۔ اصولی طور پر ہم آئین میں ایسی ترامیم کے حق میں ہیں جن کے مطابق پاٹا اور فاٹا کے بارے میں قانون سازی بھی پارلیمنٹ میں کرائی جائے۔ لیکن اس موجودہ کیس میں آئین صدر پاکستان کو نظام عدل ریگولیشن پر دستخط کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ صدر پاکستان فوری طور پر نظام عدل ریگولیشن پر دستخط کریں۔ نظام عدل ریگولیشن پر دستخط میں مزید تاخیر کی صورت میں ہم اپنی پارٹی کی قیادت سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ مخلوط حکومت میں شرکت کے فیصلے کا ازسرنو جائزہ لے کیونکہ اس سے صوبے کے عوام کے عظیم مفادات وابستہ ہیں۔ ہم نے اس معاملے پر صوبے کی تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا تھا اور مستقبل قریب میں تازہ ترین صورتحال پر انہیں دوبارہ اعتماد میں لیا جائے گا۔ ہم صوبہ سرحد کے عوام کو عموماً اور ملاکنڈ ڈویژن کے عوام کو خصوصاً یقین دلاتے ہیں کہ اے این پی ان کے لیے امن اور سیاسی استحکام کے حصول کے موقف پر ڈٹی رہے گی اور وہ اس سلسلے میں ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہے۔ ہم پارٹی کے قائد اسفندیار ولی خان پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے انہیں حتمی فیصلے کرنے کا مکمل اختیار دیتے ہیں۔ اجلاس کے بعد صوبائی وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین نے کہا کہ نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ میں تاخیر

اعلان

مولانا صوفی محمد بن الخضر ت حسن اور صوبائی حکومت کے کامیاب مذاکرات کے بعد صوبائی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آج سے ملاکنڈ ڈویژن بشمول ضلع کوہستان ہزارہ کے نظام عدالت کے تعلق میں جتنے غیر شرعی قوانین یعنی قرآن اور حدیث کے خلاف ہیں وہ موقوف اور کالعدم تصور ہونگے یعنی ختم ہو گئے۔ اس نظام عدالت میں شریعت محمدی ﷺ جس کی تفصیل اسلامی فقہ کی کتابوں میں موجود ہے اور اس کے ماخذ چار دلائل ہیں کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع، قیاس وجوباً نافذ العمل ہونگے اس کے خلاف کوئی فیصلہ قبول نہیں ہوگا۔ اور اس کی نظر ثانی یعنی اپیل کی صورت میں ڈویژن کی سطح پر دارل دار القضاء یعنی شرعی عدالت بنچ قائم کر دیا جائے گا جس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

حضرت صوفی محمد بن الخضر ت حسن کے باہمی مشورے سے عدالتی شرعی نظام کے ہر نقطے پر تفصیلی غور کرنے کے بعد اس کا مکمل اطلاق ملاکنڈ ڈویژن بشمول ضلع کوہستان ہزارہ میں امن قائم کرنے کے بعد باہمی مشورے سے کیا جائے گا۔ ہماری حضرت صوفی محمد بن الخضر ت حسن سے [illegible] پر امن احتجاج ختم کر کے ملاکنڈ ڈویژن کے تمام علاقوں میں امن قائم کرنے میں حکومت کا ساتھ دیں۔

(۱) میاں افتخار حسین صاحب
صوبائی وزیر اطلاعات اور
[illegible]

(۱) [illegible] نائب امیر تحریک نفاذ شریعت محمدی
[illegible]

(۲) حاجی ہدایت اللہ خان
صوبائی وزیر [illegible]

(۵) [illegible]

(۳) [illegible] خان [illegible]
[illegible]

(۵) امیر عزت خان سربراہ تحریک نفاذ شریعت محمدی ملاکنڈ ڈویژن
عمومی [illegible] (ہزارہ)

قوم پرست بمقابلہ طالبان۔صوفی محمد کے وفد کے ہمراہ قوم پرست لیڈرشپ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سے مشکلات بڑھیں گی۔ نظام عدل ریگولیشن کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے معاملے پر سرحد حکومت کو اعتماد میں نہیں لیا گیا جبکہ معاہدے میں تاخیر ملکی مفاد میں نہیں۔

لیکن ادھر سب سے زیادہ خطرناک اور قابل توجہ باتیں کہی گئیں وہ تحریک طالبان اور مولانا صوفی محمد نے کہیں تحریک طالبان پاکستان کے ترجمان مولانا مسلم خان نے کہا کہ:

''نظام عدل ریگولیشن کی مخالفت کرنے والا 'مرتد' ہوگا۔ اگر وہ زندہ رہا تو آئندہ الیکشن میں انہیں اقلیتوں کی نشست پر الیکشن لڑنا ہوگا۔''

اب ایک بات تو واضح ہے کہ نظام عدل کی مخالفت کرنے والے فی الوقت پیپلز پارٹی کے قائدین اور جناب آصف علی زرداری ہیں.....جنہیں مرتد قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ دعویٰ بھی موجود ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے۔ گویا ان کے لیے 'سزائے موت' تجویز کردی گئی ہے اب جو بچے گا وہی انتخابات میں حصہ لے سکے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ.....فی الحال نظام عدل یا شریعت محمدی صرف سوات اور ملاکنڈ ڈویژن تک محدود ہے جہاں سے اس کے مخالفین 'ارتداد' کے مرتکب ہو چکے ہیں اس لیے وہ سزا کے بھی 'حقدار' ہیں۔ لہٰذا جو بچیں گے وہ صرف اقلیت کی حیثیت سے ہی انتخابات میں شامل ہو سکیں گے۔

اب یہاں کچھ ضمنی سوال بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

نمبر 1 طالبان کے نزدیک تو جمہوریت کفر ہے۔ تو پھر انتخابات کیسے؟ تو کیا یہ 'جرم ارتداد' اسلام آباد میں موجود اراکین پارلیمنٹ پر عائد ہوگا؟ یا پھر یہ ان کے لیے دھمکی ہے؟

نمبر 2 ملاکنڈ ڈویژن کے تمام اضلاع جن کو معاہدے میں شامل کیا گیا تھا اب وہاں 'شریعت محمدیٰ' کے مطابق تو انتخابات نہیں ہو سکتے۔ تو پھر.....یہ کن لوگوں کو 'اقلیت' قرار دیا جا رہا ہے۔ گویا وہ تمام سیاسی لیڈر اور کارکن جو اس معاہدے یا پھر 'نظام عدل' کے خلاف ہیں وہ سب قابل سزا ہیں۔۔

شاید یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر اے این پی جو پہلے ہی سینکڑوں افراد قربان کر چکی ہے وہ مستقبل کے حوالے سے خوف کا شکار ہے اور اس معاہدے پر ہر صورت میں جلد از جلد عملدرآمد کی خواہشمند ہے۔

دوسری اہم بات مولانا صوفی محمد کے ترجمان اور ٹی این ایس ایم کے ملاکنڈ ڈویژن کے امیر مولانا عزت خان نے کہی۔ ان کا کہنا تھا کہ:

شریعت کے عملی نفاذ کے بغیر امن کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ حکمرانوں نے شریعت کے نفاذ میں تاخیری حربوں کے ذریعے طالبان کو ایک بار پھر ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔

گویا وہ ایک بار پھر نئی جنگ کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مخالفت کرنے والے اراکین اسمبلی کو غیر مسلم قرار دے کر پاکستان کو 'دارالحرب' ثابت کریں گے۔ ہم اپنے فیصلوں میں خود مختار ہیں ہم کو کسی سے مشاورت کی ضرورت نہیں۔

انہوں نے پارلیمینٹ میں نظام عدل ریگولیشن بھیجے جانے پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ قانون بنانے کا اختیار تو نبیوں کو بھی حاصل نہیں تھا۔

ایک طرف تو سوات میں آگ بھڑک رہی ہوگی دوسری طرف پارلیمینٹ میں بحث مباحثہ ہو رہا ہوگا۔

انہوں نے کہا کہ 73ء کے آئین کے آرٹیکل 247 کی شق چار اور پانچ کے تحت فاٹا میں قانون کے نفاذ کے لیے کسی اسمبلی سے قانون سازی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صدر گورنر کو احکامات دے کر قوانین جاری کر سکتے ہیں۔

یعنی ...... پارلیمینٹ جو جمہوری نظام کا سب سے بڑا فورم ہے وہ ان مسائل پر بحث کر سکتا ہے اور نہ ہی ان معاملات کا مستقبل کے حوالے سے تعین کر سکتا ہے۔ لیکن ادھر کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ پارلیمینٹ کو ہر معاملے پر قانون سازی اور آئین میں ترامیم کا اختیار ہوتا ہے لیکن چونکہ یہاں تو معاملہ بندوق کے زور پر اپنے مطالبات منوانے کا ہے اس لیے وہی جائز ہے جو ہتھیاروں کی زبان میں کہا جاتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ..... آئین میں فاٹا سے متعلق کچھ چیزیں شامل ہیں لیکن پاٹا بندوبستی اضلاع کے بارے نہیں۔ بندوبستی اضلاع صوبائی حکومت کے زیر کنٹرول ہیں اور اسی بنا پر ہی دونوں فریقین کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔

بہر حال...... حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف طالبان بندوق کے زور پر اپنی باتیں منوانے پر تلے ہوئے ہیں تو دوسری طرف مرکزی حکومت اس کے مستقل حل یا پھر...... تاخیری

حربے کے لیے پارلیمنٹ کے جمہوری پلیٹ فورم کو استعمال کر رہی ہے لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ پیپلز پارٹی جو پہلے بھی بہت سارے الزامات کی زد میں رہی ہے کوئی نیا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتی۔ لیکن اے این پی جلد از جلد اس معاہدے پر دستخط چاہتی ہے۔ اور اس کے لیے راستے بھی محدود ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کی حکومت سے علیحدگی کا امکان بھی موجود ہے۔ جو صوبہ سرحد کی سیاست میں بہت سارے نئے خدشات کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

پارلیمنٹ میں قرارداد کی منظوری کے بعد صدر مملکت نے ملاکنڈ ڈویژن کے لیے نظام عدل ریگولیشن کی منظوری دے دی ہے۔ سوات میں لوگوں نے جشن منایا، مٹھائیاں تقسیم کیں، پاکستان زندہ باد اور حکومت کے حق میں نعرے بھی لگائے۔

ابھی ایک دن پہلے کی بات تھی کہ عوامی نیشنل پارٹی حکومت سے علیحدگی کی دھمکی دے رہی تھی اور ایک رپورٹ کے مطابق اسفندیار ولی اور زرداری صاحب میں تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ تحریک نفاذ شریعت محمدی کے ترجمان مولوی عزت خان اور تحریک طالبان کے ترجمان مولانا مسلم خان نظام عدل کی مخالفت کرنے والوں کو 'مرتد' قرار دے رہے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ زندہ بچ جانے والے اقلیت کی حیثیت سے ہی انتخابات میں حصہ لے سکیں گے۔ حالانکہ مولانا صوفی محمد سے لے کر اس مکتبۂ فکر کے دیگر علمائے کرام بھی جمہوریت کو کفر قرار دیتے ہیں وہ تو 'خلافت' اور شوریٰ نظام کو عین اسلام کہتے ہیں تو پھر......کیسے انتخابات اور کیسی عوام کی رائے؟

بہرحال پارلیمنٹ میں موجود تمام سیاسی جماعتوں نے اس قرارداد کی حمایت کی۔ ایم کیو ایم ظاہر ہے کہ کھلی مخالفت نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے ایوان سے 'غیر حاضری' کو ہی مناسب سمجھا۔ اس کا کہنا تھا بندوق کی نوک پر ہونے والے اس معاہدہ کو نہیں مانتے لیکن سب سے اہم بات مسلم لیگ (ن) کے ایم این اے اور معروف کالم نویس ایاز امیر نے کہی۔ ان کا کہنا تھا کہ پاک فوج کی بندوق کے مقابلے میں طالبان کی بندوقیں زیادہ طاقتور ثابت ہوئی ہیں۔

بات تو سچ ہے مگر کیا کریں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ پیپلز پارٹی یا پھر صدر زرداری نے اپنے گلے کا پھندہ تمام پارلیمانی پارٹیوں

کے گلے میں ڈال دیا۔ اب کوئی الزام اکیلے پیپلز پارٹی کے سر نہیں آئے گا۔ حالانکہ 73ء کے آئین میں فاٹا کے معاملات قومی اسمبلی میں لانے کے بجائے صدر کو ہی صوابدیدی اختیارات حاصل ہیں اس پر اے این پی نے احتجاج بھی کیا کہ جو کام صدر تنہا کر سکتے تھے وہ پارلیمنٹ میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن ظاہر ہے کہ پیپلز پارٹی تنہا یہ 'الزام' اپنے سر نہیں لینا چاہتی ... پھر اس نے ہنگامی طور پر اسے ایوان میں پیش کر کے مسلمانوں کی اسمبلی سے طالبان اور ... نیشنل پارٹی کی توقع پوری کردی۔ نہ تین دن کا نوٹس ہوا اور نہ ہی اس پر بحث مباحثہ!! گویا سب کچھ ہنگامی بنیادوں پر جلد از جلد کروایا گیا۔ تا کہ سوات میں امن کی بحالی کا راستہ ہموار کیا جائے۔ یا پھر امن کو ہر قیمت پر خریدنے کی کوشش کی جائے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ...... 'طالبان' نے اپنی مسلح طاقت اور بندوق کے زور پر اس علاقے میں اپنی مرضی کا نظام عدل حاصل کرلیا ہے اور اب وہ اعلان کے مطابق پرامن راستے اختیار کریں گے اور طالبان کو غیر مسلح کرنے میں حکومت کی مدد بھی کریں گے۔ لیکن اس وقت تک یہ طالبان اسی علاقے میں موجود رہیں گے یا پھر اگلی منزل کی طرف عازم سفر ہوں گے؟ کیونکہ یہ اطلاعات بھی موجود ہیں اور اس عزم کا خود طالبان بھی اظہار کر چکے ہیں کہ وہ ملاکنڈ ڈویژن سے باہر بھی ایسے ہی نظام عدل کے نفاذ کی جدوجہد کریں گے۔

دوسرا یہ کہ جب ایک مقام پر انہیں اپنا مقصد حاصل ہو گیا ہے یا پھر صوبائی اور مرکزی حکومت ان کا مطالبہ منظور کرنے پر مجبور ہو گئی ہے تو کیا وہ اپنی مخصوص شریعت کے ساتھ دوسرے علاقوں کی طرف پیش رفت نہیں کریں گے؟

بلکہ اس سے بھی اہم بات یہ کہ وہ غیر مسلح ہونے پر تیار ہو جائیں گے کہ یہ تو پشتون روایات کے منافی ہے۔ یا پھر یہ کہ......وہ غیر مسلح ہونے کے بجائے شمالی وزیرستان، جنوبی وزیرستان، مہمند اور باجوڑ ایجنسیوں کا رخ کر کے وہاں موجود طالبان کی مدد نہیں کریں گے؟ یاد رہے کہ جنوبی وزیرستان میں موجود بیت اللہ محسود سوات کے مقامی اور مددگار طالبان جنگجوؤں کے لیے تنخواہیں بھی بھجواتے رہے ہیں۔

لہذا کیا یہ تنخواہ دار جنگجو واپس اپنے مالکان کے پاس نہیں جائیں گے۔ ایسے بے شمار

سوالات ہیں جن کا جواب وقت کے ساتھ سامنے آئے گا۔ فی الوقت تو یہی حقیقت ہے کہ ......امن کوخریدنے کی یہ کوشش مستقبل کے حوالے سے کچھ ایسی شاندار اور قابل تقلید بھی قرار نہیں دی جاسکتی کیونکہ اس میں تقلید کا پہلو کچھ اور ہستیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، اب جو بھی، جہاں بھی چاہے گا بندوق کے زور پر اپنی بات منوانے کی کوشش کرے گا۔

✦.....✦.....✦

باب 21

جو دینی جماعتیں بھی نہ کرسکیں وہ سیکولر پارٹیوں نے کردیا

سوات میں نظام عدل اور نفاذ شریعت کی ذمہ دار سیاسی قوت اے این پی کو سوات امن معاہدے اور اس کے بعد طالبان کے پے در پے مطالبات اور برتری تسلیم کرنے پر پارٹی کے کارکنوں، عہدیداروں اور عوام کے علاوہ اس پارٹی کے حامی دانشوروں، ملکی اور عالمی میڈیا کی جانب سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اے این پی بنیادی طور پر سیکولر قوم پرست جماعت کی سیاست کرتی رہی تھی اور وہ صوبے کی حکومت میں آنے سے قبل دینی جماعتوں اور عسکری تنظیموں کی شدید مخالف رہی تھی تاہم یہ بہت عجیب بات تھی کہ ایک یا دو اضلاع میں عسکریت پسندوں کے ہاتھوں یہ پارٹی نہ صرف یرغمال بن گئی بلکہ اس پارٹی کے بنیادی نظریات اور سیاسی تاریخ کے بارے میں بھی متعدد سوالات سر اٹھانے لگے۔ ابتداء میں کہا گیا کہ چونکہ ملاکنڈ ڈویژن میں عدالتی نظام سے متعلق خلاء موجود تھا اس لیے نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ کا نفاذ شریعت کے کسی مخصوص ایجنڈے یا طالبانائزیشن سے کوئی تعلق نہیں تاہم معاہدے کے بعد واضح ہوگیا کہ طالبان محض نظام عدل ریگولیشن پر راضی نہیں تھے بلکہ افغانستان کی طرز پر طالبانائزیشن کا نفاذ چاہتے تھے۔ معاہدے کے چند روز بعد ہی عسکریت پسندوں کی جانب سے فورسز، سرکاری افسران اور سیاسی کارکنوں کے خلاف کارروائیاں شروع کی گئیں۔ متعدد کو اغوا کیا گیا جبکہ متعدد کو ہلاک کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ معاہدے کے کئی ہفتے گزرنے اور ریگولیشن کے نفاذ کی جانب محکمانہ اقدامات کی پیشرفت کے باوجود

طالبان سوات کے 80 فیصد علاقے پر نہ صرف یہ کہ قابض رہے بلکہ وہ حسب معمول گشت کے ساتھ کارروائیوں میں بھی مصروف تھے۔

وزیراعلیٰ سرحد حیدر خان ہوتی اور متعدد وزراء اعتماد کی بحالی اور متاثرین میں چیک تقسیم کرنے یکم مارچ کو مینگورہ خود گئے تاہم اس سے اگلے روز پیوچار کیمپ (مٹہ) میں بعض طالبان کمانڈروں کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ محض نظام عدل سے بات نہیں بنے گی بلکہ مکمل شریعت کے نفاذ تک جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔ اس اجلاس میں متعدد کمانڈروں نے شرکت کرتے ہوئے حکومت پر مزید دباؤ بڑھانے اور مزید شرائط منوانے پر اتفاق رائے کا اظہار کیا جبکہ انہی دنوں مولانا صوفی محمد نے مینگورہ میں میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے یکطرفہ طور پر معاہدے کی بعض خلاف ورزیوں کی ذمہ داری فورسز اور حکومت پر ڈال دی اور دھمکی دی کہ اگر حکومت نے طالبان کی شرائط نہیں مانی تو وہ (صوفی محمد) مصالحتی عمل سے الگ ہو جائیں گے حالانکہ کارروائیوں کی خلاف ورزیاں فورسز یا حکومت کے بجائے طالبان کی جانب سے کی گئی تھیں۔

چند ہی ہفتوں کے اندر ثابت ہوا کہ اے این پی کی قیادت حکومت اور سیاست میں ہوتے ہوئے بھی عملاً نہ صرف یہ کہ طالبان کے ساتھ معاملات میں مار کھا گئی تھی بلکہ اپنے سیکولر ہونے کا دعویٰ بھی ہار گئی تھی۔ معاہدے کے باوجود اے این پی کے عہدیدار، کارکن، وزراء اور ایم پی ایز سوات جانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے جبکہ دوسری طرف ان پر حملے کرنے والے گرفتار افراد کو ایک ایک کر کے جیلوں سے رہا کیا جا رہا تھا۔ طالبان کی شرائط اور ناز برداریاں بڑھتی جا رہی تھیں اور اے این پی دفاعی حکمت عملی اختیار کر کے بہت کچھ داؤ پر لگانے میں مصروف تھی۔

پیوچار اور بعض دوسرے علاقوں میں نہ صرف طالبان کی سرگرمیاں جاری تھیں بلکہ بعض ذرائع کا کہنا تھا کہ غیرملکی جنگجو بھی وہاں موجود تھے اور مزید کی آمد بھی شروع ہو گئی تھی۔

چند ہی روز کے اندر یہ بات واضح ہو گئی کہ طالبان عسکری جنگ کے بعد سیاسی لڑائی بھی جیت گئے ہیں کیونکہ ان کی شرائط بڑھتی جا رہی تھیں اور حکومت کی رٹ کے قیام اور اداروں کی بحالی کے آثار دور تک بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

مکمل طالبانائزیشن کی جانب بڑی پیشرفت 4 مارچ 2009ء کو اس وقت دیکھنے کو ملی جب طالبان نے صوفی محمد کے ذریعے اپنی سترہ شرائط پیش کیں اور ڈپٹی کمشنر محمد جاوید نے صوبائی حکومت کی اجازت سے یہ شرائط مان بھی لیں۔ ان شرائط میں میوزک سنٹرز اور موسیقی سے متعلقہ دوسری تقریبات پر پابندی، نماز کے اوقات کے دوران کاروبار اور دوسرے معمولات کی بندش، بغیر پردہ کیے خواتین کے خلاف کارروائی، منشیات فروشوں اور گراں فروشوں کے خلاف سخت اقدامات، غیراخلاقی سرگرمیوں میں ملوث خواتین کی علاقہ بدری، بدعنوان افسران کو ڈویژن سے بے دخل کرنا، عوامی شکایات پر پولیس اور افسران کے خلاف سخت ایکشن لینا، شریعت کے مطابق خواتین کو میراث میں حصہ دینا، فرقہ واریت میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کرنا اور اس کے خاتمے کے لیے شعور اجاگر کرنا اور جیلوں میں قرآنی اور دینی تعلیمات کو لازمی قرار دینے جیسے نکات شامل تھے۔

بظاہر تو ان شرائط کے ماننے میں کوئی بڑی قباحت نظر نہیں آ رہی تھی اور ملکی قوانین میں بعض شرائط پر عمل درآمد پہلے ہی سے موجود تھا تاہم یہاں یہ سوال اٹھنا فطری تھا کہ یہ تمام معاملات کس نظام کے تحت نمٹائے جائیں گے، معاملات نمٹانے میں طالبان کا کیا کردار ہوگا اور یہ کہ اس بات کی کون ضمانت دے گا کہ اتنی سخت شرائط یا سزاؤں کا ناجائز اطلاق یا استعمال نہیں ہوگا کیونکہ دوسرے معنوں میں تو یہ افغانستان اور وزیرستان کے طالبان کے نظام کا فالواپ تھا فرق صرف یہ تھا کہ وہاں پر یہ اقدامات طالبان نے کیے تھے اور ملاکنڈ ڈویژن میں اس کا نفاذ یا اطلاق اس سیکولر اور قوم پرست پارٹی کے ہاتھوں ہو رہا تھا جس کو سوات کے عوام نے قوم پرستی اور عدم تشدد کے فلسفے کی سیاست پر ووٹ دیئے تھے اور اسلامی نظام کی داعی جے یو آئی کے چھ امیدوار 18 فروری کے الیکشن میں اے این پی کے امیدواروں کے ہاتھوں شکست کھا کر عملی سیاست سے الگ ہوگئے تھے۔ یہاں یہ سوال بھی شدت سے اٹھایا گیا کہ جس اے این پی نے 2002ء کے بعد کی سرحد اسمبلی میں ایم ایم اے کی جانب سے حسبہ بل کو طالبانائزیشن کا نام دے کر آسمان سر پر اٹھایا تھا وہ عسکریت پسندوں کی وہ شرائط بھی مان گئی تھی جن کا کبھی ایم ایم اے کے اس اتحاد نے بھی تصور نہیں کیا گیا تھا جو بنیادی طور پر نفاذ اسلام کا مینڈیٹ لے کر ہی برسراقتدار آیا تھا۔

یہاں عملاً یہ ثابت ہورہا تھا کہ نظام عدل کے بعد کی دوسری شرائط اور مطالبات مان کر اے این پی اور پی پی پی کی مخلوط حکومت اور قیادت اپنے مینڈیٹ سے نہ صرف انحراف کررہی تھی بلکہ وہ پاکستان کے بندوبستی علاقوں میں بندوق اور تشدد کے بل بوتے پر چلائی جانے والی تحریک کے آگے ہار مان کر دوسروں کو بھی بندوق کے ذریعے مطالبات منوانے کا راستہ دکھا رہی تھی جو کہ انتہائی خطرناک بات تھی۔

اس صورتحال نے سیاسی کارکنوں، دانشوروں اور سرکاری حکام کو شدید قسم کے دباؤ اور مایوسی سے دوچار کرکے رکھ دیا کیونکہ اب تک کے اقدامات سے واضح ہورہا تھا کہ حکومت ملاکنڈ ڈویژن خصوصاً سوات کو قانونی اور سیاسی طور پر طالبان کے سپرد کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

دوسری طرف حالت یہ تھی کہ جماعت اسلامی اور جے یو آئی کے رہنما بھی یہ شرائط تسلیم کرنے پر نہ صرف انگشت بدنداں تھے بلکہ وہ کسی تیاری اور شعور کے بغیر اتنے سخت نظام لانے کی حامی بھرنے پر طالبان اور حکومت دونوں کو دلائل کی بنیاد پر تنقید کا نشانہ بنانے میں بھی مصروف تھے۔

اے این پی اور پی پی پی جیسی سیکولر پارٹیوں کی جانب سے تشدد بندوق اور بغاوت کے نتیجے میں شرائط منوانے والوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کے نتائج کا شاید ان پارٹیوں کی قیادت کو یا تو احساس نہیں ہورہا تھا یا وہ اتنے بے بس ہوگئے تھے کہ وہ ملکی سیاست اور ریاستی معاملات میں ایک خطرناک رجحان کو قانونی شکل دینے پر مجبور تھے۔ وجہ جو بھی تھی نتیجہ تو یہی نظر آرہا تھا کہ جمہوری قوتیں شکست کھا گئی تھیں اور عسکریت پسند اکیسویں صدی کے پاکستان میں اپنے مطالبات منوا کر ایک نئی تاریخ رقم کرنے کے کامیاب سفر پر نکل پڑے تھے۔

اگر بات محض نظام عدل ریگولیشن تک محدود رہتی اور اس کے بدلے امن قائم ہوکر حکومتی رٹ کی بحالی کا راستہ ہموار ہوتا تو شاید حکومت اور اے این پی کو کوئی کریڈٹ مل بھی جاتا تاہم یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ ریاست ملکی تاریخ میں پہلی دفعہ عسکریت پسندوں کے مطالبات تو مان رہی تھی مگر بدلے میں اس کو کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔ دوسری طرف امن پسند لوگوں کی نہ صرف تشویش میں اضافہ ہورہا تھا بلکہ سترہ نکات کے سامنے آنے اور حکومت کی

جانب سے ان کی منظوری پر رضامندی نے ان لوگوں کے اٹھتے قدم پھر سے روک دیئے جو کہ امن کے سہانے خواب اور اعلانات دیکھ اور سن کر پشاور، اسلام آباد، کراچی اور دوسرے علاقوں میں خاندانوں سمیت نقل مکانی کر چکے تھے کیونکہ اب بات نظام عدل سے آگے بڑھ کر طالبانائزیشن کی منزل کی طرف بڑھتی دکھائی دینے لگی تھی اور اس کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ اس صورتحال میں حکمران جماعت اے این پی کے مقامی ایم پی ایز، عہدیداروں اور کارکنوں میں مایوسی بڑھتی گئی۔ معاہدے کے کئی روز گزرنے کے باوجود وہ نہ صرف یہ کہ سوات جانے کے قابل نہ تھے بلکہ معاہدے کے باوجود پہلے کی طرح اے این پی کے کارکنوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں بھی جاری تھیں۔ یہاں اس حقیقت کو بھی نظرانداز کرنا ممکن نہیں رہا کہ جو شرائط اے این پی اور پی پی پی کی مخلوط حکومت مان گئی یا مان رہی تھی ان شرائط کے ماننے کا کبھی بھی جے یو آئی یا جماعت اسلامی نے وعدہ نہیں کیا تھا اگر وہ کسی اسلامی یا شرعی نظام کی بات کر بھی رہی تھیں تو ان کے لیے ان کے متعلقہ علماء نے کئی دہائیوں سے ہوم ورک کیا ہوا تھا اور ایسا کرنے کے لیے وہ پارلیمینٹ اور عوام کی حمایت کو لازمی قرار دیتی آئی تھی ورنہ ایم ایم اے صوبہ سرحد میں واحد اکثریتی حکومت کے دوران ایسے متعدد فیصلے کر لیتی۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو رہی تھی کہ جو کام ایم ایم اے کے کرنے کے نہیں تھے ان کاموں کی تکمیل کا بیڑہ سیکولر قوتوں اے این پی اور پی پی پی نے اٹھایا ہوا تھا جو حیرت کی بات بھی تھی اور ان کی سیاست کے حوالے سے عبرت کی بات بھی۔

جے یو آئی اور جماعت اسلامی دہشت گردی سے متعلق جنگ کے معاملے پر طالبان کی حمایت تو کرتی رہی تھیں مگر پاکستان کے اندر انہوں نے طالبان کو بعض رعائتیں دینے کے باوجود ان کے نظریے کے مطابق اسلام کے نفاذ کی عملی کوشش کبھی نہیں کی۔ ایم ایم اے کے پانچ سالہ دور اقتدار میں ثقافت اور بعض دوسرے شعبوں پر سخت وقت بھی آیا اور ان کی حکومت نے مقامی طالبان کے ساتھ متعدد مواقع پر تعاون بھی کیا تاہم یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ایم ایم اے کی صوبائی حکومت کو جب بھی کسی ضلع یا علاقے میں طالبان کی جانب سے حکومتی رٹ کو چیلنج کرنے کی بھنک بھی پڑی حکومت نے ایسی کسی بھی حرکت ارادے یا کارروائی کو سختی سے کچلنے کی پالیسی اپنائی یہاں تک کہ ایم ایم اے کی حکومت ٹی این ایس ایم کے لیڈر

مولانا صوفی محمد کی رہائی جیسے اقدام سے بھی گریز کرتی رہی۔

ایسی ہی مثال ہمیں جے یو آئی کے مضبوط گڑھ بلوچستان میں بھی ملتی ہے۔ بلوچستان کی پشتون بیلٹ سے جے یو آئی (ف) 1971ء سے لے کر 2008ء تک کے تمام ادوار کے دوران اکثریت سے انتخابات جیتتی رہی ہے۔اس پارٹی کے ساتھ اکثر حکومتوں کے دوران سینئر صوبائی وزارت کا عہدہ ہوتا ہے اس کے باوجود جے یو آئی نے کبھی بھی نہ تو طالبان کو بلوچستان میں حکومتی تعاون فراہم کیا اور نہ ہی ایسی کسی تحریک کو پنپنے دیا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ جب بلوچستان کے سینئر وزیر مولانا عصمت اللہ نے طالبان کو حکومتی سپورٹ فراہم کرنے کی کوشش کی تو پارٹی نے ان کو بعد میں منصب اور سیاست ہی سے آؤٹ کر دیا۔ جے یو آئی کے صوبائی امیر مولانا محمد خان شیرانی طالبان کے اتنے مخالف رہے ہیں کہ ان کو تین بار قاتلانہ حملوں میں ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی گئی جبکہ ان کے ساتھیوں پر عبداللہ محسود اور ملاداداللہ کے خلاف عملی کارروائیوں کا الزام بھی لگایا جاتا رہا ہے۔

اب ذرا اس معاہدے پر بھی غور کیجئے جو حکومت اور تحریک نفاذ شریعت محمدی کے دوران ہوا اور اس کی اخبارات میں اشاعت بھی ہوئی۔اس معاہدے میں وہ سترہ نکات موجود ہیں اور نہ ہی ان کے نفاذ کا کوئی طریقہ کار موجود ہے۔

اعلان نامہ

اس اعلان نامہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں نظام عدل کے نفاذ کا تذکرہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ شریعت کے خلاف موجود تمام قوانین ختم ہوگئے ہیں اور اب تمام فیصلے ''شریعت محمدیؐ'' کے مطابق ہوں گے۔ چنانچہ جو بھی مجوزہ ''نظام عدل'' میں فیصلے ہوں گے ان کی اپیل ڈویژن کی سطح پر قائم ہونے والے 'دارالقضاء' میں ہوگی جس کا فیصلہ حتمی ہوگا اور اس کو کہیں چیلنج نہیں کیا جائے گا۔

یہ تحریک نفاذ شریعت محمدی یا پھر تحریک طالبان کے سوات گروہ کا مؤقف ہے جس کو صوبہ سرحد کی حکومت نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔لیکن حکومت نے اس سارے مسئلے کو مولانا صوفی محمد کے 'پرامن احتجاج' کے خاتمہ اور امن کے قیام میں حکومت کے ساتھ تعاون سے مشروط کیا ہے یا پھر اس کی درخواست کی ہے اور پھر کہا ہے کہ......امن کے قیام کے بعد، مولانا صوفی

محمد کے مشورے سے 'عدالتی شرعی نظام' کے ہر نقطے پر تفصیلی غور کرنے کے بعد، اس نظام کا مالاکنڈ ڈویژن بشمول کوہستان (ہزارہ) نفاذ ہوگا۔

اس معاہدے یا اعلان نامہ پر حکومت کی طرف سے 6 افراد کے دستخط ہیں جن میں چار صوبائی وزیر اور دو اہم حکومتی افسران (سیکرٹری قانون اور سیکرٹری داخلہ) شامل ہیں۔

دستخط کرنے والے وزراء میں تین کا تعلق عوامی نیشنل پارٹی جبکہ ایک کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے جو پی پی کے صوبائی سربراہ بھی ہیں۔

حکومت کے سربراہ، وزیراعلیٰ یا پھر انتظامی سربراہ گورنر سرحد کے دستخط نہیں ہیں۔

دوسری طرف۔تحریک نفاذ شریعت مالاکنڈ ڈویژن کے نائب امیر، ترجمان اور ایک خادم تحریک کے دستخط ہیں جبکہ اعلان اخونزادہ سکندر کی طرف سے جاری ہوا ہے جس کے بارے کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی گئی۔لیکن اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اعلان نامہ پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین بہت زیادہ جلدی میں تھے۔

لیکن اس اعلان نامہ میں کسی عدالتی نظام کے طریقہ کار کی کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔تاہم جو کچھ بعد میں سامنے آیا اس میں بہت کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔قاضیوں کا تقرر مولانا صوفی محمد کی خواہش پر ہوا اور انہوں نے جس شخص کو مناسب سمجھا اس عہدے پر فائز کر دیا۔ اس اعلان کے ٹھیک ایک ماہ بعد 16 مارچ کو جب چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کی بحالی کا اعلان ہوا عین اس موقع پر مولانا صوفی محمد نے تمام سرکاری ججوں اور وکلاء حضرات کو عدالتوں میں آنے سے روک دیا۔ان کا کہنا تھا کہ جج حضرات شرعی قوانین سے نابلد ہیں اور شرعی نظام میں وکلاء کی کوئی گنجائش نہیں۔شریعت میں صرف 'عدالت اور مجرم' ہی ایک دوسرے کے روبرو ہوتے ہیں۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

باب 22

سابقہ امن معاہدوں کا انجام
اور سوات ڈیل پر ردعمل

16 فروری 2009ء کو فرنٹیئر ہاؤس پشاور میں ٹی این ایس ایم کے وفد اور اے این پی، پی پی پی کی مخلوط حکومت کے درمیان اعلان کردہ سوات معاہدے کو حکومت نے بظاہر تو اعلامیئے کا نام دیا تاہم یہ براہ راست تشدد پسند مولانا فضل اللہ اور ان کے ساتھیوں کی شرائط اور مطالبات مان کر ان کی حیثیت اور مؤقف کو ریاستی طور پر تسلیم کرنے کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔

معاہدے کے بعد فریقین کے درمیان سیز فائر کا اعلان ہوا اور صوفی محمد ایک جلوس کی شکل میں سوات روانہ ہوئے تاہم چند روز کے دوران طالبان نے خلاف ورزیاں کر کے حکومت پر جب دباؤ برقرار رکھنے کا اپنا فارمولہ کامیابی سے آزمایا تو اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ اس ڈیل کے نتیجے میں کس نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔

مولانا صوفی محمد 21 مارچ 2008ء کو رہا کر دیئے گئے تھے۔ اس سے ایک ہفتہ قبل ان کو ڈی آئی خان جیل سے پشاور کے حیات آباد میڈیکل کمپلیکس لا کر علاج کے نام پر مذاکرات کی خاطر مہمان بنایا گیا تھا۔ اس مہمانداری کے دوران حکومتی اور سرکاری حکام ان سے اس ایشو پر تبادلہ خیال کرتے رہے کہ اگر وہ مولانا فضل اللہ کو پرتشدد کارروائیوں اور مزاحمت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو ان کو نہ صرف یہ کہ باعزت طریقے سے رہا

کر دیا جائے گا بلکہ ان کے 1993ء اور 1999ء والے مطالبے کی بنیاد پر ملاکنڈ ڈویژن میں نظامِ عدل کے نفاذ کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ اس تمام عمل کے دوران صوبائی حکومت کا رویہ سنجیدگی اور نیک نیتی پر مبنی رہا جبکہ آرمڈ فورسز بھی بڑی حد تک تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا دکھائی دیں۔ فریقین کے درمیان معاملات طے پا گئے تو 22 مارچ کو صوفی محمد رہائی کے بعد تیمرگرہ چلے گئے بعدازاں جہاں انہوں نے امن کیمپ لگا کر ساتھیوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اگر حکومت پرامن طریقے سے مذاکرات کے ذریعے تمام مطالبات مانتی ہے تو جنگ اور تشدد سے گریز کا راستہ اپنانا ہی بہتر ہے۔

اس سے قبل مولانا فضل اللہ اور صوبائی حکومت کے درمیان 21 مئی 2008ء کو بھی ایک معاہدہ طے پایا تھا جس پر صوبائی وزراء اور فضل اللہ کے ساتھیوں نے دستخط کیے تھے۔ اس معاہدے کے بعد سیز فائر کا اعلان بھی ہوا تھا تاہم صورتحال نے اس وقت بہت عجیب کروٹ لی جب تحریک طالبان پاکستان کے امیر بیت اللہ محسود نے فضل اللہ کو حکم دیا کہ وہ قبائلی علاقوں میں فورسز کی کارروائیوں کے ردعمل میں معاہدہ توڑ دیں۔ اس معاہدے کے خاتمے اور حکومت کے خلاف کارروائیاں تیز کرنے کا اعلان فضل اللہ کے ترجمان کے علاوہ تحریک طالبان پاکستان کے مرکزی ترجمان مولوی عمر سے بھی کروایا گیا۔ مولوی عمر نے یہاں تک کہا کہ اگر اے این پی کی حکومت نے استعفیٰ نہیں دیا تو طالبان اس حکومت کا خود خاتمہ کر دیں گے۔ اس دھمکی اور ڈیڈلائن نے کشیدگی کی ایک نئی لہر کو جنم دیا اور سوات میں حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے۔

سوات کے 16 فروری والے معاہدے کے لیے اے این پی نے تمام سیاسی اور مذہبی قوتوں کو اعتماد میں لینے کا احسن راستہ اپنایا ہوا تھا۔ جماعت اسلامی کے بغیر تمام سیاسی قوتیں معاہدے کے دوران نہ صرف موجود رہیں بلکہ انہوں نے اس کی حمایت کا بھی اعلان کیا۔ اے این پی کی اس پالیسی نے وقتی طور پر اس کا امیج کافی بہتر بنایا تاہم جن لوگوں کو اس معاہدے کے نتائج اور دوررس اثرات کا اندازہ تھا وہ محض اس لیے خاموش رہے کہ سوات میں بحالی امن کے تمام امکانات معدوم ہو چکے تھے اور فورسز طالبان کے خاتمے میں ناکام رہی تھیں اس کے باوجود اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں ایسے بے شمار تجزیہ نگار موجود تھے جنہوں نے

میڈیا کے راستے دلائل کی بنیاد پر اس ڈیل کو پورے پاکستان میں طالبانائزیشن پھیلانے کی سیڑھی قرار دے کر اس کی مخالفت کی۔

عالمی برادری اور میڈیا نے بھی اس معاہدے پر شدید تحفظات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ پاکستان کے بعض سیاسی رہنما اور دانشور گومگو کی کیفیت سے دوچار تھے۔ مثال کے طور پر سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف نے عرصہ دراز کے بعد میڈیا سے ایک بات چیت کے دوران حکومت کی کارکردگی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ جب وہ برسر اقتدار تھے تو فضل اللہ پہاڑوں پر جبکہ صوفی محمد جیل میں تھے لیکن موجودہ حکومت نے دونوں کی حیثیت تسلیم کر لی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ فروری کو تو وہ اس معاہدے پر طنزیہ تبصرہ کر کے اس کی مخالفت کر رہے تھے تاہم 9 مارچ 2009ء کو بھارت سے واپسی پر کراچی ایئرپورٹ پر میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے یہی پرویز مشرف سوات معاہدے کا کچھ اس انداز سے دفاع کرتے دکھائی دیئے جیسا کہ یہ معاہدہ موجودہ حکومت کے بجائے پرویز مشرف ہی نے کیا ہے۔

جماعت اسلامی اس معاہدے پر وقتاً فوقتاً اعتراضات کرتی رہی اور موقف اس کا یہ رہا کہ اے این پی اور پی پی پی جیسی پارٹیوں سے اسلامی نظام سے متعلق کسی عملی اور اچھے کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

جے یو آئی کا کہنا تھا کہ اس معاہدے کے بعد تشدد اور بندوق کے ذریعے مطالبات منوانے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور ایک نئی سیاسی روایت جنم لے گی۔

پشتون قوم پرست جماعت پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی کے مرکزی اور صوبائی رہنما بظاہر تو خاموش رہے تاہم پارٹی اجلاسوں اور نجی محفلوں میں اس کے رہنما معاہدے پر کھلم کھلا اعتراض کرتے پائے گئے پارٹی کے رہنما اے این پی پر انگلیاں اٹھاتے دیکھے گئے جس کے جواب میں اے این پی کی دلیل تھی کہ پشتونخواہ میپ نے 17 مہینے کی شورش کے دوران عسکریت پسندوں کی ضد اور امن کے حق میں عملاً کوئی واضح موقف اپنانے کی جرأت بھی نہیں کی۔ پشتونخواہ میپ کو اس حوالے سے بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ اس پارٹی نے غزہ پر اسرائیلی حملے کے خلاف تو کوئٹہ میں احتجاجی جلوس نکالا تھا مگر سوات کے حالات پر یہ پارٹی خاموش رہی

کہ یہ پشتونوں کا علاقہ تھا اور پی ایم اے پی پشتون حقوق اور امن کی بات کرتی آ رہی تھی جبکہ اے این پی کے متعدد سینئر لیڈرز اس تمام عمل سے عملاً لاتعلق رہے تاہم پارٹی کے جن عہدیداروں اور وزراء نے میڈیا، سیمینارز، مباحثوں اور اجلاسوں کے دوران اپنی پارٹی کے مؤقف کا مؤثر انداز میں دفاع کیا ان میں سینیٹر زاہد خان، سینیٹر حاجی محمد عدیل، سفیر امن افراسیاب خٹک، وزیراعلیٰ سرحد حیدر خان ہوتی اور صوبائی وزراء میاں افتخار حسین، سردار حسین بابک، واجد علی خان، بیرسٹر ارشد عبداللہ اور سینئر صوبائی وزیر بشیر احمد بلور سرفہرست تھے۔

مزید بدقسمتی یہ کہ معاہدے کے بعد عالمی برادری اور میڈیا کے تحفظات کو اس طریقے سے ہینڈل نہیں کیا گیا جس کی ضرورت تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوبے کے علاوہ مرکزی حکومت کو بھی دفاعی پوزیشن پر آ کر وضاحتیں پیش کرنا پڑیں لیکن عالمی قوتیں اس پر بھی مطمئن نہیں ہوئیں۔

یہاں اس بات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ اس سے قبل امریکہ نے ان تمام معاہدوں کو سبوتاژ کر دیا تھا جو حکومت پاکستان اور مزاحمت کاروں کے درمیان مختلف اوقات میں کیے گئے یا کیے جاتے رہے تھے۔ ایسے تمام معاہدے جنرل (ر) پرویز مشرف کے دور حکومت کے دوران امریکہ کے ہاتھوں ناکام بنائے گئے۔ سوات امن معاہدہ فروری 2009ء کے انتخابات کے نتیجے میں کسی مزاحمتی گروپ اور نئی جمہوری حکومت کے قیام کے درمیان پہلا معاہدہ تھا اور شاید یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ امریکہ نے ماضی کے معاہدوں کی طرح اس معاہدے کو سبوتاژ کرنے کی اس لیے کوشش نہیں کی کہ وہ جمہوری حکومت کے معاہدے کے اثرات دیکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ حکومت نے اس معاہدے سے قبل امریکیوں کو یہ کہہ کر اعتماد میں لیا تھا کہ اگر یہ معاہدہ کامیاب ہوا تو اس کی تقلید میں قبائلی علاقوں میں بھی نئے معاہدے کیے جائیں گے جس کے بعد اس بات کو ہر صورت میں یقینی بنایا جائے گا کہ عسکریت پسند افغانستان میں مداخلت کرنے اور لڑائی لڑنے کا اپنا سلسلہ ترک کر دیں گے۔ اس دعوے کے بعد امریکیوں نے پہلے کی نسبت جارحانہ کارروائی کرنے کے بجائے دیکھو اور انتظار کرنے کی پالیسی کو اپنانے کا راستہ اپنایا۔ اسلام آباد کے باخبر حلقے کہہ رہے ہیں کہ امریکہ سمیت دنیا کی زیادہ تر متعلقہ طاقتوں کو اس معاہدے پر شدید تحفظات تھے تاہم وہ اپنی

نوعیت کے اس انوکھے معاہدے کے نتائج کا انتظار کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ وسیع تر تناظر میں عسکریت پسندوں کے ساتھ ان کی شرائط ماننے کے عمل کے نتیجے میں ہونے والا معاہدہ نہ صرف یہ کہ ناکام ہوسکتا ہے بلکہ اس کے پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بھی متعدد منفی اثرات مرتب ہونے کا خدشہ تھا۔

یہاں ان بڑے معاہدوں کا ذکر کیا جانا ضروری ہے کہ جو کہ جنرل (ر) مشرف کے دور میں قبائلی علاقوں کے عسکریت پسندوں کے درمیان ہوئے اور امریکی مداخلت کے باعث ناکامی سے دوچار ہوگئے۔

وزیرستان میں اس قسم کا ایک معاہدہ حکومت اور عسکریت پسندوں کے کمانڈر نیک محمد کے درمیان معاہدہ شکئی کے نام سے 2006ء کو ہوا مگر یہ معاہدہ نہ صرف یہ کہ ناکام ہوا بلکہ امریکہ نے براہ راست حملہ کرکے نیک محمد ہی کو راستے سے ہٹا دیا۔ ستمبر 2006ء کو ہی وزیرستان ہی میں معاہدہ ''سراروغہ'' کے نام سے حکومت اور بیت اللہ محسود کے درمیان ہوا مگر اس کو بھی امریکہ نے ناکام بنا دیا اور نتیجے کے طور پر پاکستانی فورسز اور طالبان کے درمیان پھر سے لڑائی چھڑ گئی۔ ان دو معاہدوں کی ناکامی کے بعد 30 اکتوبر 2006ء کو باجوڑا یجنسی کے طالبان اور پولیٹیکل انتظامیہ کے درمیان معاہدے پر دستخط کیے جانے والے تھے کہ امریکہ نے ایک مدرسے پر حملہ کرکے نہ صرف بے شمار لوگوں کو شہید کر دیا بلکہ اس معاہدے کو بھی سبوتاژ کر دیا۔ اس حملے میں 80 کے قریب طلباء اور دوسرے شہید ہوئے۔

باجوڑ ہی میں مارچ 2007ء کو مذاکرات اور معاہدے پر اتفاق رائے کا اظہار کیا گیا۔ تو عین دستخط کرنے کے مرحلے کے دوران نامعلوم افراد نے حساس اداروں کے افسر اور ساتھیوں کو فائرنگ کرکے شہید کر دیا جس کے باعث مذاکرات اور معاہدے کا سلسلہ ایک بار پھر ناکامی سے دوچار ہوا۔

مختصراً ان معاہدوں اور واقعات کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ اب تک عسکریت پسندوں کے ساتھ جتنے بھی حکومتی معاہدے ہوئے ان سب کو ناکام بنا دیا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سوات امن معاہدے پر امریکہ کا عملی ردعمل کس شکل میں سامنے آتا ہے اور یہ کہ کسی بھی جمہوری حکومت کے پہلے معاہدے اور اس کے ساتھ بعض یقین دہانیوں کے کیا نتائج سامنے

آ سکتے ہیں؟ سوات امن معاہدے اور اس ضمن میں کی جانے والی پیشرفت کے بعد باجوڑ اور دوسری ایجنسیوں میں اس قسم کے دوسرے معاہدوں کے امکانات، وجوہات اور پس منظر کے نتائج کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ ان معاہدوں سے پاکستان کی حکومت نے کیا فوائد حاصل کیے، امن کا قیام کتنا ممکن بنایا گیا۔ امریکی ردعمل کیا سامنے آیا اور سب سے اہم بات یہ کہ انتہاپسندی، دہشت گردی اور طالبانائزیشن سے پاکستان کو جو خطرات لاحق ہوئے ہیں ان میں کتنی کمی واقع ہوتی ہے۔

دوسری طرف بعض مبصرین کا اس ضمن میں خیال ہے کہ امریکہ قبائلی علاقوں کے بعد سوات سمیت دوسرے بندوبستی علاقوں، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے متعدد اضلاع میں بھی طالبان یا ایسی دوسری تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی پالیسی پر عمل پیرا ہے تاکہ ایک تو پاکستان کو ریاستی طور پر عدم استحکام کی انتہا پر لے جایا جائے اور دوسرا یہ کہ اس تمام صورتحال کے بعد پاکستان کو عالمی برادری کے سامنے افغانستان کی طرح عالمی امن کے لیے خطرہ قرار دے کر ایک بھرپور وار کا راستہ ہموار کیا جاسکے۔

بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ امریکہ سوات کے طالبان کی سرگرمیوں پر اس لیے خاموش رہا تھا کہ اس کے بعض پالیسی ساز چاہتے تھے کہ سنٹرل ایشین جنگجوؤں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو سوات کے راستے چین میں داخل کر کے چین کے لیے نہ صرف مشکلات پیدا کی جائیں بلکہ پاکستان اور چین کے تعلقات کو بھی خراب کیا جائے۔ دیکھا جائے تو ان دونوں دلائل کو یکسر طور پر اس عالمی گیم کے تناظر میں رد نہیں کیا جاسکتا جو کہ اس خطے میں کھیلی جارہی ہے اور ابھی اس کے متعدد اہداف حاصل کرنا باقی ہیں۔ ابن الوقتی پر مبنی امریکی پالیسیوں سے اس بات کی توقع کی بھی جاسکتی ہے کہ جو سنٹرل ایشین جنگجو امریکہ کے لیے افغانستان میں اس کے دشمن ہیں وہ سوات میں ان کے لیے چین کے حوالے سے دوست بن جائیں۔ یہاں اس بات کو بھی نظرانداز کرنا کافی مشکل ہوگا کہ فوجی آپریشن کی ابتداء میں فضل اللہ کے ساتھیوں کو یہ کہتے سنا بھی گیا کہ امریکہ ایک سازش کے تحت پاکستان اور چین کے درمیان تعلقات خراب کرنا چاہتا ہے۔ ظاہراً تو وہ اس دلیل یا الزام کا پس منظر بیان کرنے سے گریز کرتے رہے تاہم بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ ردعمل ان عناصر کے عزائم جاننے کے بعد سامنے آیا تھا جو

واقعتاً سوات کو چین کے خلاف استعمال کرنے کی خواہش رکھتے تھے تاہم سواتی طالبان کے بعض کمانڈرز اس خواہش سے متفق نہیں تھے۔ اس معاملے پر فریقین کے درمیان اختلاف بھی پیدا ہوا تھا۔ مگر بعد میں معاملے کو سلجھا دیا گیا اس کے باوجود یہ ایشو بہرحال نہ صرف یہ کہ زیر بحث رہا بلکہ کہا گیا کہ سنٹرل ایشین جنگجو ابھی تک اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ ان کے لیے سوات میں قیام کا امکان برقرار رکھتے ہوئے ان کی مدد کی جائے۔

اس پس منظر میں ایک اور نقطہ نظر تو اس سے بھی آگے کے خدشات ظاہر کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ امن معاہدے کے بعد جس قسم کی 'مذہبی جنونی ریاست' سامنے آسکتی ہے وہ امریکہ کو چین کے خلاف استعمال کرنے میں زیادہ مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اول تو یہ طاقت کے ذریعے اپنے مذہبی نظریات کا غلبہ چاہتے ہیں۔ پھر 'جہاد' کو ایمان کا حصہ بھی قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے سرحدوں کے بھی قائل نہیں۔ وہ اسلام کی بالادستی کو ایک عالمگیر تحریک کا درجہ دیتے اور پھر اس پر کھلی کمٹمنٹ کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہی وہ نظریہ اور کمٹمنٹ تھی جس کو امریکہ نے سوویت یونین کے خلاف استعمال کیا تھا اور اب اس کو ایک اور 'کافر ملک' کے خلاف بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس تمام پس منظر کو بیان کرنے کا مختصراً مقصد یہ ہے کہ القاعدہ، طالبان اور ایسی دوسری پاکستانی عسکری تنظیموں کا ایجنڈہ محض ملاکنڈ ڈویژن کے نظام عدل کے مطالبے تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ایک عالمگیر ایجنڈے پر عمل پیرا رہ کر اس قسم کے مطالبات اور مناسب حالات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہے اور ابھی انہوں نے بہت کچھ کرنا ہے۔

باب 23

افضل خان کے بارے اے این پی کا منفی رویہ

ہم نے پہلے بھی ان چند وجوہات کا ذکر کیا ہے جن کے باعث سوات میں طالبانائزیشن متعارف کروائی گئی۔ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ان تمام حقائق کے باوجود سوات کے عوام کی اکثریت انتہاپسندی اور دہشت گردی کی کھل کر مذمت اور مزاحمت بھی کرتی رہی جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک تو چار سے پانچ لاکھ تک لوگ امن کی تلاش میں نقل مکانی کر گئے اور دوسرا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عوام کی اکثریت نے طالبان کی رکاوٹوں، دھمکیوں اور حملوں کے باوجود 18 فروری کے الیکشن کے دوران اے این پی کو اس لیے ووٹ دیئے کہ اس پارٹی نے علاقے اور صوبے میں امن بحال کرنے کا نعرہ لگا کر انتخابی مہم چلائی تھی۔ اگر عوام کی اکثریت انتہاپسندی کو سپورٹ کر رہی ہوتی تو نہ اتنی تعداد میں نقل مکانی ہوتی اور نہ ہی اے این پی کو 100 فیصد کامیابی ملتی۔

ابتداء میں افغانستان اور وزیرستان کے طالبان کی پالیسی اپناتے ہوئے سواتی طالبان نے پولیس کے علاوہ ان سیاسی لیڈروں، عہدیداروں اور معززین علاقہ کو ٹارگٹ بنا کر علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ جن کا معاشرے میں مقام اور احترام تھا اور طالبان بھی ان سے مزاحمت یا مخالفت کی توقع کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے والی سوات اور ان طرح کے دوسرے خوانین اور معززین نے فرار کا راستہ اپنا کر میدان خالی چھوڑ دیا۔ جبکہ سوات کا ضلعی ناظم جمال ناصر مسلم لیگی لیڈروں اور سابق وزراء فتح محمد خان، شجاعت علی خان کے خاندان سے تعلق رکھتا

ہے۔ یہ لوگ شورش زدہ مٹہ تحصیل کے باشندے ہیں اوران کا علاقے میں کافی اثر ورسوخ تھا۔ ضلعی ناظم اوران کے مذکورہ بزرگوں نے علاقہ چھوڑ کر اسلام آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ بعد میں ان کے گھر کو بم لگا کر اڑا دیا گیا۔ والی سوات کے خاندان سے تعلق رکھنے والے سابق صوبائی وزیر میاں گل، اسفند یار، امیر زیب کو عین الیکشن مہم کے دوران ساتھیوں سمیت منگورہ میں ہلاک کردیا گیا تو ان کے خاندان کے لوگ بھی سوات چھوڑ گئے۔ وہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے سابق گورنر میاں گل اورنگزیب کے بھتیجے تھے۔ اس طرح دوسرے بے شمار بااثر سیاسی اور سماجی خاندان بھی کسی مخالفت یا مزاحمت کے بغیر علاقہ چھوڑ کر پشاور اور اسلام آباد منتقل ہوگئے تو امن کے حامی عوام اور گروپوں کے لیے نہ تو آواز اٹھانے والا کوئی رہ گیا اور نہ ہی ایسے لوگوں کو اکٹھا کرنے والی کوئی معزز شخصیت میدان میں باقی رہی اگر ابتداء میں معززین علاقہ دیر اور بونیر کی طرح متحد ہوکر متفقہ آواز اٹھاتے، مؤثر جرگوں کا انعقاد کرتے یا کوئی لشکر ترتیب دیتے تو شاید اتنی تباہی ہوتی، فوج کو بلانے کی ضرورت محسوس ہوتی اور نہ ہی اربوں کا نقصان ہوتا۔

حکومتی نااہلی کے ساتھ ساتھ یہ سوات کے عوام اور ان کے بااثر خاندانوں کی بے اتفاقی کا بھی نتیجہ تھا کہ تمام تر ریاستی معاملات طالبان کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس دوران سوات میں ایک جرگے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ تاہم اس وقت تک کافی دیر ہوچکی تھی۔ بعد میں جرگہ کے ان منتظمین اور بعض شرکاء کو چن چن کر ایک منصوبے کے تحت ان لوگوں کو بدترین انتقام اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جن سے مزاحمت کا امکان تھا۔

دوسری تنظیموں کے علاوہ پی پی پی، مسلم لیگ، جے یو آئی، جماعت اسلامی، تحریک انصاف اور پی پی پی شیرپاؤ کی ضلعی تنظیمیں علاقے میں موجود تھیں۔ مگر ان تمام قوتوں نے خوف کے باعث ابتداء میں مزاحمت کے بجائے طالبان کی حمایت کا راستہ اپنایا جبکہ دوسری سماجی تنظیمیں بھی خاموش تماشائی بنی رہیں۔

اس تمام صورتحال کے دوران جس شخصیت نے طالبان کی مخالفت کرکے علاقہ چھوڑنے سے انکار کیا وہ بزرگ قوم پرست لیڈر اور سابق وفاقی وزیر محمد افضل خان المعروف خان لالہ تھے۔

2007ء کے دوران جب مولانا فضل اللہ نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو ان کو مٹہ تحصیل کے مختلف علاقوں کے متعدد ساتھیوں کی حمایت حاصل تھی۔ مشہور زمانہ پیوچار کیمپ افضل خان لالہ کے علاقے ہی میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا اس کیمپ کا اہم کمانڈر ابن امین مٹہ تحصیل کے گاؤں نمل (Namal) کا رہنے والا تھا جبکہ طالبان کے دوسرے اہم مراکز مٹہ اور سمبٹ بھی افضل خان کے گاؤں درشخیلہ سے چند ہی کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھے۔

2007ء کو جب فضل اللہ کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہونے لگا تو وہ اپنے ایف ایم ریڈیو پر تقاریر کے دوران افضل خان اور ان جیسی دوسری شخصیات کی کھل کر مخالفت کرنے لگا۔ دوسری طرف افضل خان لالہ اور اے این پی کے ضلعی صدر اور بعد کے صوبائی وزیر ایوب خان آ شاڑے جو کہ ان کے بھتیجے تھے بھی طالبان کی مخالفت کرنے لگے۔ افضل خان لالہ اور ان کے بھتیجے عبدالجبار خان (تحصیل ناظم) پر سمبٹ اور درشخیلہ کے درمیان مٹہ چوک پر دن دہاڑے اس وقت قاتلانہ حملہ کیا گیا جب وہ شکر درہ نامی گاؤں سے اپنے رشتہ دار اور اے این پی کے تحصیل صدر مظفر علی خان کے ایک بھائی کی تعزیت کے بعد اپنے گھر آ رہے تھے۔ حملے میں افضل خان لالہ اور عبدالجبار خان کو متعدد گولیاں لگیں تاہم جوابی فائرنگ سے حملہ آور فرار ہو گئے۔ اس کے باوجود ان کے ڈرائیور اور ایک باڈی گارڈ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے اہم شخص پر یوں دن دہاڑے قاتلانہ حملہ کیا جا سکتا ہے۔ (اس وقت صوبے میں ایم ایم اے کی حکومت تھی۔)

اس واقعے نے سوات کے عوام، حکومت اور قوم پرست حلقوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اور سیاسی کارکن درشخیلہ کا رخ کرنے لگے جہاں افضل خان لالہ اپنے خاندان کے بے شمار مسلح نوجوانوں کے گھیرے میں لوگوں سے ملتے رہے اور ان کو تسلی دیتے رہے۔ اس پر قوم پرست حلقوں کا شدید ردعمل سامنے آیا تھا یوں اس واقعے سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ سوات کے طالبان کتنے طاقتور بن کر سامنے آ چکے ہیں۔

لیکن حیرت کی بات ہے کہ اے این پی کی مرکزی قیادت نے اتنے اہم لیڈر کے خلاف اس کارروائی پر اس ردعمل کا اظہار نہیں کیا جس کی توقع تھی یا جس کی ضرورت محسوس کی

جارہی تھی۔ اس واقعے کو اے این پی کی ٹاپ لیڈر شپ یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ چونکہ افضل خان لالہ علاقے کے بڑے خان ہیں اس لیے ان پر حملہ ان کی کسی ذاتی دشمنی یا مخالفت کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے حالانکہ پارٹی قیادت کو وقتاً فوقتاً پیوچار کیمپ اور طالبان کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا جاتا رہا تھا۔

افضل خان لالہ کے پاس اس واقعے کے بعد وفود آئے جن کا کہنا تھا کہ اگر ان کو اجازت دی جائے اور خان لالہ ان کی سرپرستی کریں تو وہ عسکریت پسندوں کے خلاف لشکرکشی کے لیے تیار ہیں لیکن افضل خان نے تشدد کا راستہ اپنانے سے گریز کرتے ہوئے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا جس کا بعد میں ان سمیت ان کے بے شمار ساتھیوں اور حامیوں کو بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ افضل خان کا خیال تھا کہ ایسا ہونے کی صورت میں علاقے میں خانہ جنگی کا راستہ ہموار ہوجائے گا۔

2008ء کے الیکشن شیڈول کا اعلان ہوا تو ان کے بھتیجے ایوب خان آشاڑے اور دوسرے رشتہ داروں کے گرد گھیرا تنگ ہونا شروع ہوگیا۔ ایوب آشاڑے کی رہائش گاہ کے گیٹ پر خطرناک ریموٹ کنٹرول بم نصب کیے گئے تاہم ان کی حاضر دماغی سے نہ صرف بم استعمال ہونے سے پہلے ناکارہ بنائے گئے بلکہ ایک شخص کو وائرلیس اور دوسرے سامان سمیت پکڑ کر حکام کے حوالے بھی کر دیا گیا۔ اسی گرفتار شخص کی نشاندہی پر بعد میں متعدد ان افراد کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا جو کہ ایوب آشاڑے کی انتخابی مہم اور اس شخص کے پکڑنے کے دوران موجود تھے۔

فروری 2008ء کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتے کو ایوب آشاڑے کے دو جوان سال بھتیجوں (دونوں بھائی تھے) اور ان کے ایک ساتھی کو ایوب کی رہائش گاہ سے کچھ ہی فاصلے پر قتل کر دیا گیا تو حالات اور بھی سنگین ہوگئے۔ یہی وقت تھا جب افضل خان لالہ پر ان کے ساتھیوں اور ہمدردوں نے انتہائی دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ علاقہ چھوڑ کر پشاور یا اسلام آباد منتقل ہوجائیں مگر وہ مسلسل انکار کرتے رہے اور درشخیلہ میں مقیم رہے۔ ان کا مؤقف تھا کہ اگر وہ علاقے سے نکل گئے تو طالبان ان تمام لوگوں کا صفایا کر دیں گے جو ان کی مخالفت کرسکتے ہیں۔ ان کی مزاحمت کو دیکھ کر ان پر متعدد بار حملے کیے گئے ان کے دوسرے رشتہ داروں،

حامیوں اور نوکروں کو مارا گیا ان کی مارکیٹیں تباہ کردی گئیں، گھروں کو نذرِ آتش کردیا گیا، یہاں تک کہ ان کے بھتیجے (ایوب آشاڑے۔صوبائی وزیر) کے دو گھروں کو نذرِ آتش کر کے وہاں موجود چوکیداروں کو زندہ جلا دیا گیا اس کے باوجود افضل خان لالہ درشخیلہ ہی میں قیام پذیر رہے اور حملہ آوروں کا دو سال تک انتہائی جرأتمندی اور استقامت سے مقابلہ کرتے رہے۔

یہاں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا ضروری ہے کہ افضل خان لالہ افغانستان میں 2002ء کے بعد بننے والی حکومت کی اعلیٰ شخصیات کی نظروں میں انتہائی عقیدت اور احترام سے دیکھے جاتے رہے۔ اسی عرصہ کے دوران وہ کئی بار ذاتی حیثیت سے افغان صدر حامد کرزئی کی دعوت پر کابل مدعو کیے گئے۔ کابل میں پاک افغان جرگے کا انعقاد ہوا تو اے این پی کے وفد میں وہ بھی شامل تھے۔ کہتے ہیں کہ پارٹی لیڈر اسفندیار ولی خان نہیں چاہتے تھے کہ افضل خان لالہ پارٹی کے مقررین میں شامل ہوں تاہم حامد کرزئی اور پاکستانی ٹیم کے سربراہ آفتاب خان شیر پاؤ کی خواہش اور اصرار پر جرگے کے دوسرے روز ان کو مقررین کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ اس عرصے کے دوران وہ نہ صرف ڈیورنڈ لائن کی مخالفت کرتے رہے بلکہ وہ افغان اور پاکستانی ریاستی حکام کے ساتھ اپنی ملاقاتوں میں اس بات پر بھی کھل کر تنقید کرتے رہے کہ دونوں جانب کے پشتونوں کے لیے دونوں ممالک کے درمیان آمدورفت کے لیے ویزے کی شرط انتہائی نامناسب ہے۔ ان کا یہی رویہ ان عناصر کے لیے انتہائی ناپسندیدہ عمل تھا جو کہ ڈیورنڈ لائن کے ایشو کو کسی اور تناظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ کابل جرگہ میں شرکت اور ٹھوس تقریر کے بعد ہی وہ دونوں اطراف کے عسکریت پسندوں کی نظر میں ناپسندیدہ ٹھہرے اور یہی وجہ تھی کہ ان کو راستے سے ہٹانے کی ایک مستقل پالیسی وضع کی گئی اور یوں سوات کے طالبان کے لیے ان کو راستے سے ہٹانا پہلی ترجیح بن گیا۔

اتنے بڑے سیاسی قد کاٹھ، شاندار سیاسی کیریئر اور قربانیوں کے باوجود اے این پی کی ٹاپ لیڈرشپ کا رویہ افضل خان لالہ کے ساتھ اس طرح نہیں رہا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس رویے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت کے قیام کے بعد جب اے این پی مولانا فضل اللہ کے ساتھ 21 مئی 2008ء کو امن معاہدہ کر رہی تھی تو پارٹی کی لیڈرشپ نے افضل

خان لالہ کے ساتھ مشورہ کرنا گوارا نہیں کیا حالانکہ ان کی حیثیت ایسی تھی کہ سوات تو کیا کسی بھی خطے یا ایشو سے متعلق ان کی رائے بھی پارٹی کیلئے سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ سوات کے معاملے پر ڈیل ہو رہی تھی اور سب سے متاثرہ شخص اس پراسس سے باہر تھا۔ افضل خان لالہ نے معاہدہ کے چند روز بعد پشاور میں منعقدہ امن سے متعلق ایک سیمینار کے دوران معاہدے میں اپنی عدم مشاورت کا کھل کر اظہار کرنے کے علاوہ اپنے تجربے اور معلومات کی بنیاد پر پیشگوئی کی کہ فضل اللہ اور اے این پی کے درمیان ہونے والا معاہدہ ناکامی سے دوچار ہوگا۔

بعد میں ثابت ہوگیا کہ ان کا اندازہ حرف بحرف درست تھا اور پھر وہ مرحلہ آ پہنچا جب فضل اللہ نے بیت اللہ محسود کے کہنے پر اے این پی کو پانچ روز کے اندر حکومت سے الگ ہونے کی ڈیڈ لائن دے دی۔

اے این پی کی اعلیٰ قیادت نے اسی عرصہ کے دوران اس بزرگ اور جراتمند لیڈر کے دفاع کے لیے کوئی غیر معمولی قدم نہیں اٹھایا حالانکہ صوبے میں اسی پارٹی کی حکومت تھی اور سوات سے آٹھ ایم پی ایز کی کامیابی میں بھی افضل خان لالہ کی مزاحمت، جرأت اور استقامت کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس تمام گیم میں جس شخص کو سب سے زیادہ جانی اور مالی اور ذہنی نقصان پہنچا وہ افضل خان لالہ ہی تھے۔ اگر ایک طرف افضل خان کو راستے سے ہٹانا یا دوسروں کی طرح علاقے سے نکالنا عسکریت پسندوں کے لیے ایک ناممکن ٹاسک ثابت ہوا تو دوسری طرف ان کی پارٹی کا رویہ بھی افسوسناک رہا۔

جب ان کے خلاف حملے بڑھتے گئے تو ان کے قریبی دوست اور فرنٹیئر پوسٹ کے ایڈیٹر انچیف رحمت شاہ آفریدی نے صدر آصف علی زرداری سے براہ راست رابطہ کر کے ان کو سوات کے حالات اور افضل خان لالہ کو درپیش سنگین خطرات سے آگاہ کر کے مداخلت کرنے کا مطالبہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر زرداری نے نہ صرف افضل خان لالہ کو متعدد بار فون کر کے بھرپور تعاون کا یقین دلایا بلکہ چیف آف آرمی سٹاف اشفاق پرویز کیانی کو سوات بھیج کر افضل خان سے ان کی خصوصی ملاقات بھی کرائی۔

افضل خان لالہ نے ایک ایسے وقت میں مزاحمت کی شاندار مثال قائم کر کے اپنے

سیاسی قد کاٹھ میں مزید اضافہ کردیا جبکہ ان کی پارٹی کے لیڈر سمیت دوسرے بہت سے جرأتمند لوگ ایک ہی حملے کے بعد اپنے گھر اور علاقے چھوڑ کر محفوظ مقامات پر منتقل ہونے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور عسکریت پسندوں کی مخالفت اور مزاحمت عملاً ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔

فروری 2009ء کو جب صوفی محمد کے ذریعے سرحد حکومت کا عسکریت پسندوں کے ساتھ معاملہ طے ہورہا تھا تو اس موقع پر بھی افضل خان لالہ سے مشاورت نہیں کی گئی۔

باب 24

امریکہ کی نئی افغان پالیسی اور پاکستان

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ افغانستان اور اس سے ملحقہ پشتون علاقے بین الاقوامی سیاسی اور اقتصادی ضرورت کا حصہ بن چکے ہیں اور یہاں مختلف ملکوں کے مفادات کا ٹکراؤ بھی موجود ہے۔ خصوصاً ایران، روس، چین اور امریکہ کی کم یا زیادہ ان علاقوں میں دلچسپی واضح ہے کیونکہ یہی وہ علاقے ہیں جو وسطی اور جنوبی ایشیا یا پھر وسطی ایشیا اور بحیرۂ عرب کے ساحلوں تک رسائی کا ذریعہ ہیں اور وہ راستے بھی انہی علاقوں سے ہوکر گزرتے ہیں جو وسطی ایشیا میں موجود تیل، گیس اور معدنیات کے ذخائر کی بین الاقوامی ترسیل میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس تناظر میں اگر شورش زدہ علاقوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ افغانستان میں بھی وہی علاقے سب سے زیادہ متاثر ہیں جو ان راستوں میں آتے ہیں مثلاً جنوبی افغانستان میں قندھار جو طالبان کا مرکز ہے اور قندھار سے ہی گوادر تک مجوزہ روٹ ہے جو سب سے کم فاصلہ ہے دوسرا کابل سے پشاور اور کراچی تک ہے جو نسبتاً زیادہ فاصلہ ہے تیسرا وسطی ایشیا سے جنوب کی طرف آنے کے لیے ایرانی بندرگاہ چہار باغ تک آنے کا ہے حالانکہ ایران نے اس کی تیاری بھی کر رکھی ہے مگر یہ سب سے زیادہ طویل ہے اس کے امکانات کم ہیں کیونکہ اول تو امریکہ اور ایران کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں دوسرا اس بندرگاہ کی تعمیر اور نگرانی کا کام روسی ماہرین کے سپرد ہے۔ افغانستان میں اگر قندھار میں بدامنی موجود ہے تو ادھر پاکستان میں بلوچستان کے حالات بھی کچھ ایسے خوش کن نہیں۔ جبکہ

دوسرے ممکنہ روٹ کابل اور پشاور کے درمیان خیبر ایجنسی میں بھی صورتحال ٹھیک نہیں۔ یہاں اگر مختلف جنگجو گروپ برسرپیکار ہیں تو ان گروپوں کی طرف سے نیٹو افواج کی سپلائی پر کئی بار حملے ہو چکے ہیں چنانچہ ہم اس تناظر میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں القاعدہ اور طالبان کا ایک گروپ امریکی اور مغربی مفادات کو ہی نشانہ بناتا ہے اور خود امریکہ بھی انہی کو اپنا دشمن نمبر ایک قرار دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ......افغانستان پر امریکی قبضہ کا بنیادی مقصد وسطی ایشیائی ریاستوں میں موجود تیل اور گیس کے وسیع ذخائر میں سے تیل کو گوادر کے راستے عالمی مارکیٹ تک لے جانا ہے تو دوسری طرف گیس کے ذخائر کو ہندوستان تک پہنچانا ہے جس کے لیے ممکنہ روٹ افغانستان سے وانا، ڈیرہ اسماعیل خان، ملتان اور نئی دہلی ہے۔ چنانچہ اگر اس تناظر میں جنوبی وزیرستان میں ہونے والی شورش کو دیکھا جائے تو بہت سارے دیگر عوامل ومحرکات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کیونکہ یہ لڑائی محض وسیع تر اسلامی ریاست یا پھر ان علاقوں میں نفاذ شریعت کی نہیں۔ اور اگر ہم اس لڑائی میں استعمال ہونے والے جدید ترین اسلحہ اور دولت کے استعمال کو بھی سامنے رکھیں تو کچھ اور ملکوں کی مداخلت بھی ناگزیر سطح پر سامنے آتی ہے۔ تحریک طالبان کے پاس باقاعدہ تنخواہ دار جنگجو ہیں اور خودکش حملہ آوروں کو نقد رقوم کے ساتھ ان کے خاندانوں کو مالی اور جانی تحفظ بھی فراہم کیا جاتا ہے اور یہ کام بیت اللہ محسود جو ایک مسجد کے پیش امام کے بیٹے ہیں وہ اپنے ذاتی وسائل سے نہیں کر سکتے یا پھر وہ جواز بک، تاجک اور عرب کمانڈرز ہیں آخر انہیں بھی تو کہیں سے اسلحہ اور دولت حاصل ہوتی ہے جسے وہ استعمال کرتے ہیں۔

اگر اس مفاداتی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تو دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں:

اول یہ کہ امریکہ پچھلے تیس سال سے اس خطے میں انوسٹمنٹ کرتا چلا آ رہا ہے اور اب یہ محض دولت اور اسلحہ تک ہی محدود نہیں رہی اسے جانی اور فوجی نقصان کا بھی سامنا ہے۔

سوویت یونین کے انتشار کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور بن کر آیا تھا اور اس نے اپنے خودساختہ نیو ورلڈ آرڈر پر کام شروع کر کے پوری دنیا کو اپنی اقتصادی ترجیحات میں بھی ڈھالنے کی کوشش کی تھی لیکن عراق اور افغانستان کی جنگوں نے اس کو مشکلات میں مبتلا

کر دیا۔ اور اب اس کی ساکھ شدید خطرے میں ہے۔

امریکہ نے ہر خطے کے لیے نئے سٹریٹجک زون بھی بنائے اور اس میں مختلف بالا دستیاں بھی بنائیں۔ مشرق وسطیٰ میں اگر اس نے یہ ذمہ داری اسرائیل کے سپرد کی تو جنوبی ایشیا میں یہ عہدہ بھارت کے سپرد کیا اور اس کو اپنا علاقائی پارٹنر بھی بنایا۔

یہ وہ اہم نکات ہیں جس پر امریکی خارجہ پالیسی حرکت کرتی ہے۔ جارج ڈبلیو بش جنھوں نے عراق اور افغانستان پر براہ راست حملہ آور ہو کر امریکی قبضے کی راہیں ہموار کیں اور اب ڈیموکریٹک صدر براک اوباما اپنی پالیسیوں کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں یہ کچھ لوگوں کی محض خوش گمانی تھی کہ اوباما کے آنے سے امریکن پالیسیوں میں جوہری تبدیلیاں رونما ہوں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اوباما نے عراق سے فوجوں کے انخلاء کا عندیہ تو دیا مگر افغانستان سے نہیں۔ بلکہ افغانستان اور پاکستان کے معاملات کو سدھارنے کے لیے رچرڈ ہالبروک کو خصوصی نمائندہ بھی مقرر کر دیا۔ یاد رہے کہ پہلے اس کی ذمہ داری میں بھارت کو بھی شامل کیا گیا تھا تاکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود تنازعات کو بھی ختم کیا جائے مگر بھارت کے دباؤ اور ایک سینئر پارٹنر کی حیثیت سے بھارت کو ہالبروک کی ذمہ داریوں سے نکال دیا۔ اب وہ پاکستان اور افغانستان کے معاملات کی ڈپلومیٹک نگرانی کرتے ہیں۔

براک اوباما جس اقتصادی اور سیاسی دباؤ میں امریکہ کے صدر منتخب ہوئے تھے ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ افغانستان کے مسئلہ پر فوری توجہ مرکوز کریں اور اس علاقے میں امن کی بحالی کے اقدامات میں تیزی لائیں اور بش انتظامیہ کی بعض ترجیحات پر نظر ثانی کریں۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اوباما نے:

☆ پاکستان پر دباؤ میں اضافہ کیا اور ''ڈومور'' کا مطالبہ بڑھایا۔

☆ پاکستانی خفیہ اداروں خصوصاً آئی ایس آئی کے کردار پر نظر ثانی کے لیے کہا۔

کیونکہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ اس ادارے کے دوہرے کردار پر شدید تنقید کرتے چلے آئے تھے۔ جس کی نشاندہی آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل احمد شجاع پاشا اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی کے دورۂ پینٹاگون کے دوران بھی کی گئی تو اپریل 2009ء کے پہلے ہفتہ میں جب امریکی کمانڈر مائیکل مولن اور رچرڈ ہالبروک خصوصی دورے پر اسلام آباد

آئے تو اس معاملے پر خصوصی گفتگو کی تھی۔

☆ افغانستان میں مزید فوجیں بڑھانے کا عندیہ دیا اور کہا کہ یہ تازہ دم افواج جنوب میں قندھار جو طالبان کا گڑھ ہے وہاں تعینات کی جائیں گی۔

☆ گڈ اور بیڈ طالبان کی تخصیص کر کے گڈ طالبان کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے مفاہمت کا راستہ تلاش کیا جائے گا۔ یہ مبینہ طور پر پاکستان کی ہی تجویز تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مقامی طالبان اور القاعدہ جس میں اکثریت غیرملکیوں کی ہے انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھا جانا چاہیے۔ جس پر بھارت نے شدید احتجاج کیا تھا۔

☆ امریکہ جلد از جلد اس شورش کو ختم کرنا چاہتا تھا اور اسی پس منظر میں ہی اس نے ڈرون حملوں میں اضافہ کیا اور اس کو بلوچستان کے پشتون علاقوں تک بھی بڑھانے کا عندیہ دیا تھا۔ کیونکہ بعض اطلاعات کے مطابق جنوبی اور شمالی وزیرستان میں موجود شدت پسند گروہ اور ان کے افراد اس طرف بھی نقل و حرکت کرتے رہتے تھے۔ جبکہ طالبان نے بھی اس علاقہ میں سوات تجربہ دہرانے کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔

☆ امریکہ 2009ء میں اس مسئلہ پر ہر صورت میں قابو پانا چاہتا تھا۔

چنانچہ براک اوباما نے نئی افغان پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے جہاں پاکستان کو بلینک چیک نہ دینے اور باقاعدہ حساب کتاب لینے کی بات کی تو وہاں اس بات کی نشاندہی بھی کی کہ وہ پاکستان کے موجودہ کردار سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا افغانستان میں مزید سترہ ہزار فوجی بھیجے جائیں گے۔ پاکستان کو وعدے پورے کرنا ہوں گے۔ پاکستان نے دہشت گردوں کے ٹھکانے ختم نہ کیے تو ہم کریں گے۔ القاعدہ بینظیر بھٹو سمیت ہزاروں پاکستانیوں کی ہلاکت میں ملوث ہے۔ القاعدہ نے پاکستانیوں کو تباہی کے سوا کچھ نہیں دیا۔

افغانستان کی صورتحال امریکہ کے لیے مزید خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ افغانستان میں نیٹو امریکی افواج اور افغان حکومت پر حملے ہو رہے ہیں۔ القاعدہ پاکستان کے قبائلی علاقے میں موجود محفوظ پناہ گاہوں سے امریکہ پر حملوں کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ اسامہ بن لادن لوگوں کو دہشت گردی کے لیے بھرتی کر رہے ہیں۔ اور خود تا حال روپوش ہیں۔ امریکیوں کی حفاظت ان کی ذمہ داری ہے اور وہ اس کو پورا کریں گے۔ پاکستان کو القاعدہ کے خلاف

اپنے وعدے پورا کرنا ہوں گے ماضی کی طرح پاکستان کو بلینک چیک نہیں دے سکتے۔ قانون کی حکمرانی سے ہی پاکستانی عوام کے مسائل حل ہوں گے۔

افغانستان میں تربیت یافتہ فوج کی تعداد ایک لاکھ چونتیس ہزار جبکہ پولیس کی تعداد بیاسی ہزار کی جائے گی اس کام میں نیٹو امریکہ کی مدد کرے گا۔

انہوں نے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور القاعدہ کے محفوظ ٹھکانوں کو تباہ کرنے کے لیے پاکستان کو مضبوط اتحادی بننا ہوگا اور اسے القاعدہ کے لیے تمام وعدے لازمی پورے کرنا ہوں گے۔ دہشت گردی کے خلاف پاکستان کو امریکہ کی ضرورت ہے۔ دہشت گرد پاکستان اور افغانستان میں نائن الیون جیسے حملوں کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقے دنیا کے خطرناک ترین سرحدی علاقے بن چکے ہیں، پاکستان اور افغانستان کا مستقبل ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ امریکی فوج افغانستان کو کنٹرول کرنے کے لیے نہیں بلکہ القاعدہ کو تباہ کرنے کے لیے وہاں موجود ہے۔

جن دہشت گردوں نے نائن الیون کی منصوبہ بندی کی تھی وہ پاکستان اور افغانستان میں موجود ہیں اگر افغانستان پر طالبان قبضہ کر لیتے ہیں یا القاعدہ کو روکا نہیں جاتا تو یہ ملک ایک بار پھر دہشت گردوں کا گڑھ بن جائے گا جو لامحدود تعداد میں ہمارے عوام کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر امریکہ نے پاکستان اور افغانستان کی مدد نہ کی تو ہم دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ ہار سکتے ہیں۔ القاعدہ اور اس کے اتحادی کینسر ہیں اور ان سے لڑنے کے لیے پاکستان حکومت کی مدد ضروری ہے انہوں نے عالمی برادری سے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں امریکہ کی مدد کرے۔ القاعدہ کو ختم کرنے کے لیے پاکستان کو مضبوط کرنا ہوگا۔ پاکستان کے عوام بھی وہی چاہتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں۔

صدر اوباما نے کہا کہ امریکہ افغان حکومت کی کرپشن پر آنکھیں بند نہیں کرے گا۔ ہم دہشت گردوں کو شکست دیں گے اور پاکستان کی محفوظ پناہ گاہوں سے دہشت گردوں کا صفایا کریں گے۔ دہشت گردوں کے ٹھکانوں کی اطلاعات پر اگر پاکستان کارروائی نہیں کرے گا تو ہم خود کریں گے۔ پاکستان کو دہشت گردوں کے ٹھکانے ختم کرنے ہوں گے۔ اسامہ بن لادن پاک افغان سرحدی علاقے کو استعمال کر رہے ہیں۔ چار ہزار امریکی فوجی افغان فوج

کی تربیت کے لیے بھیجے جائیں گے۔ پاکستانی فوج کی تربیت اور امداد کی بھی ضرورت ہے۔ افغانستان میں منشیات کا کاروبار بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور اس کی وجہ سے انتہاپسندوں کو سرمایہ فراہم ہوا ہے۔

افغانستان میں ہمیں زیادہ بااصلاحیت حکومت کی ضرورت ہے۔ افغانستان کے ہر صوبے میں مفاہمت کا عمل شروع کرنا ہوگا۔ قبائلی علاقوں میں تعمیر نو زون بنایا جائے گا، امریکہ اقوام متحدہ کے تعاون سے پاکستان اور افغانستان کے لیے نیا رابطہ گروپ قائم کرے گا جس میں نہ صرف نیٹو اور دیگر اتحادی ممالک شامل ہوں گے۔ بلکہ وسطی ایشیائی ممالک، خلیجی ممالک، ایران، چین اور روس کو بھی اس میں شامل کیا جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ ہم اس مرتبہ سویلین ماہرین بھی افغانستان بھجوار ہے ہیں جن میں زرعی ماہرین، انجینئرز اور ماہرین تعلیم بھی شامل ہوں گے جو افغان عوام کے بہتر مستقبل کے لیے کام کریں گے اور اعتدال پسند طالبان کو ہتھیار پھینکنے کی ترغیب دی جائے گی۔ انہوں نے پاکستان کے لیے ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ کی امداد کا بھی اعلان کیا تا کہ پاکستان کو بحران سے نکالا جائے۔ امریکہ کے صدر براک اوباما کے اس پالیسی بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے افغانستان کے صدر حامد کرزئی نے کہا کہ اس منصوبہ سازی سے طالبان اور القاعدہ جنگجوؤں سے کامیابی کے ساتھ نمٹا جائے گا۔ افغان سکیورٹی فورسز کی تربیت کے لیے چار ہزار فوجیوں کے آنے سے ملک اور خطے کو فائدہ ہوگا۔

عین اس موقع پر جب براک اوباما نئی افغان پالیسی کا اعلان کررہے تھے خیبر ایجنسی میں نیٹو کی سپلائی لائن پر جمرود میں ایک مسجد میں خودکش حملہ ہوا جس میں ستر افراد شہید اور ڈیڑھ سو سے زائد زخمی ہوگئے۔ نیویارک ٹائمز نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ افغانی اور پاکستانی طالبان نے اپنے باہمی اختلافات ختم کردیئے ہیں اور وہ امریکی فوج کے خلاف کارروائی کے لیے تیار ہیں۔ پاک افغان سرحد پر متعدد شدت پسند طالبان نے بتایا کہ امریکی فوجیوں کا استقبال خودکش حملوں، بارودی سرنگوں اور حملوں سے کیا جائے گا جس کے لیے نوجوان کمانڈرز اور مجاہد بھرتی کر کے تربیت دی گئی ہے۔

ادھر پاکستانی حکمران خوش تھے کہ امریکہ نے ان کی باتیں مان لی ہیں اور اب

اعتدال پسند اور شدت پسند طالبان کو علیحدہ کر دیا جائے گا اور وہ طالبان جو پاکستان کے خیر خواہ ہیں مگر امریکہ کے مخالف ہیں انہیں سمجھا بجھا کر اپنے مؤقف پر قائل کیا جاسکے گا اور وہ جو امریکہ کے ساتھ پاکستان کے بھی دشمن بن چکے ہیں ان کو نشانہ بنانا آسان ہوگا۔ لیکن دوسری طرف امریکی صدر نے یہ پیغام بھی واضح کر دیا تھا کہ اب پاکستان کو ہر حال میں دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کرنا ہوگی اور اگر پاکستان نے کہیں بھی غ؛ات کہ مظاہرہ کیا یا پھر......ماضی کی روایات کو دہرانے کی کوشش کی تو امریکہ یہ کام اپنی مر ') کے مطابق خود کرے گا جس پر پاکستان احتجاج بھی نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف یہ سوال ا زیر بحث آسکتا ہے کہ جب تک قبائلی علاقوں میں امن نہیں ہوگا، تعمیر نو کا کام کیسے شروع ہوگا اور یہ تعمیر نو زون کہاں بنائے جائیں گے؟

اور پھر......دلچسپ بات تو یہ بھی ہے کہ ایک طرف امریکہ کے صدر براک اوباما نئی افغان پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے یہ انتباہ کر رہے تھے کہ پاکستان کو نہ تو بلینک چیک دیں گے اور نہ ہی اس کو آنکھ سے اوجھل کریں گے تو دوسری طرف امریکہ کے چیئرمین جائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی ایڈمرل مائیک مولن یہ کہہ رہے تھے کہ آئی ایس آئی کے مشرقی اور مغربی افغانستان اور بھارت کی سرحد کے ساتھ عسکریت پسندوں سے رابطے ہیں۔ امریکہ کو آئی ایس آئی کے ساتھ سٹرٹیجک اور عسکریت پسندوں کے خلاف اس کی اپروچ کو بنیادی طور پر تبدیل کرنا ہوگا۔ جبکہ امریکی مرکزی کمانڈ کے سربراہ جنرل پیٹریس نے کہا کہ آئی ایس آئی القاعدہ اور طالبان کی مدد کر رہی ہے۔

انہوں نے کہا کہ آئی ایس آئی نے 1980ء میں سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے امریکی فنڈز کے ذریعے کچھ عسکریت پسند خود بنوائے تھے جس سے اس کے عسکریت پسندوں سے تعلقات بڑے مضبوط ہوگئے تھے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ تعلقات اب بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تعلقات کس سطح پر موجود ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعض اوقات یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ آئی ایس آئی نے عسکریت پسندوں کی لوکیشن واضح ہونے پر انہیں اطلاع کر دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات اہم ہے کہ اگر عسکریت پسندوں کے ساتھ آئی ایس آئی کے رابطے رہے اور ان عسکریت پسندوں کے خلاف آپریشن ناکام ہوتے رہے

تو اعتماد کی فضا کو نقصان پہنچے گا۔ ایسی ہی بات افغانستان اور پاکستان کے لیے امریکہ کے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک نے کہی۔ آئی ایس آئی کی جانب سے القاعدہ اور طالبان کی مدد کرنے سے متعلق اطلاعات پریشان کن ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں ایک دوسرے پر اعتماد نہ کریں ایک دوسرے کے خلاف کام کریں تو دہشت گردی کے خلاف جنگ کامیاب نہیں ہوسکتی۔

پاکستان نے اس پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے اخلاص کا اندازہ اس کی سکیورٹی فورسز اور خفیہ اداروں کی قربانیوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے غیر مصدقہ اور بے بنیاد الزامات مذموم سازش کا حصہ ہیں جن کا مقصد ہمارے اداروں کو بدنام کرنا ہے۔

لیکن........ پاکستان کے اس مؤقف کو امریکہ نے تسلیم نہیں کیا تاہم ڈرون حملوں اور 'گرم تعاقب' کی پالیسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے امریکہ کے صدر براک اوباما نے جو کچھ کہا وہ کسی حد تک پہلے سے مختلف بھی تھا کیونکہ ایک تلخ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ افغانستان کی جنگ یا پھر وسطی ایشیا کے وسائل پر قبضہ کرنے اور اس کی بین الاقوامی ترسیل کے لیے اسے پاکستان کی اشد ضرورت ہے اور یہی وہ ضرورت ہے جس کو پاکستان کی اسٹبلشمنٹ اور پالیسی ساز ادارے ایکس پلائٹ بھی کرتے رہے ہیں بلکہ ایک ایسی دوہری پالیسی پر گامزن رہے ہیں جو ایک طرف تو مذہبی قوتوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کا باعث بنتی رہی۔ اور اس میں آئی ایس آئی کے کردار کو مشکوک سمجھا گیا۔

جس پر پاکستان نے احتجاج بھی کیا۔ اور سفارتی کوششوں سے امریکہ کو یہ باور کرانے میں بھی کامیاب ہوگئی کہ ڈرون حملوں اور سرحدی خلاف ورزی کے باعث عوامی ردعمل کے ساتھ حکومت کے لیے بھی پریشانی ہوتی ہے اور امریکہ کے خلاف نفرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں ہی امریکہ کے صدر براک اوباما کو کچھ اور وضاحتیں بھی کرنا پڑیں۔

یہی وہ پس منظر تھا جس میں امریکی کمانڈر مائیک مولن اور پاکستان اور افغانستان کے لیے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک اپریل کے پہلے ہفتہ میں اسلام آباد آئے اور پاکستانی

حکام سے نئی امریکی ترجیحات اور ان پر فوری عملدرآمد کے لیے طویل مذاکرات کیے۔ جو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ امریکہ بھارتی افواج کو بھی افغانستان میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ پاکستان کے بھارت کے حوالے سے شدید تحفظات تھے اور اس کے قبائلی علاقوں میں ملوث ہونے کے شواہد بھی اس کے پاس موجود تھے جو بعد میں اس نے امریکہ کے حوالے بھی کیے۔

پاکستان کا مؤقف تھا کہ ڈرون حملے بند کیے جائیں۔ ڈرون طیارے پاکستان کو دیئے جائیں پاکستانی افواج دہشت گردوں کے خلاف خود کارروائی کریں گی۔ لیکن امریکہ کی طرف سے رضامندی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ تو پاکستان کے وزیرخارجہ شاہ محمود قریشی نے رچرڈ ہالبروک کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس میں واضح طور پر کہا کہ پاکستان امریکہ کو بلینک چیک نہیں دے سکتا۔ یاد رہے کہ رچرڈ ہالبروک کا یہ مشترکہ پریس کانفرنس نہیں کرنا چاہتے تھے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ نئی امریکی ترجیحات پر دونوں ملکوں کے درمیان شدید اختلافات موجود ہیں۔ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے بی بی سی نے کہا تھا کہ:

''پاکستان اب پرانی تنخواہ پر کام نہیں کرنا چاہتا۔''

بہرحال..... صاحب علم لوگوں نے اس انکار کو جمہوری اور غیر جمہوری حکومت کا فرق قرار دیتے ہوئے کہا کہ جمہوری حکومت ایک تو ہر حال میں عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے ڈرون حملوں میں بلوچستان کو علیحدہ رکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی تو دوسرا یہ کہ جمہوری اور منتخب حکومت زیادہ بہتر انداز میں سودے بازی کر سکتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کو ڈیڑھ ارب ڈالر کی سابقہ امداد جس میں فوجی تعاون بھی شامل ہے نظرثانی کرنا پڑے گی کیونکہ افغانستان اور قبائلی علاقوں میں امن کی جلد از جلد بحالی امریکی اقتصادیات کے لیے ناگزیر ہوتی جاتی ہے اور اس کے لیے وقت تیزی سے کم ہو رہا ہے۔

آخر میں ذرا اس حکمت عملی کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ کریں جو ایک پاکستانی دانشور کی رائے ہے اس میں ان مثبت باتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے جو نئی امریکی پالیسی میں شامل کی گئی ہیں۔

افغان پاک حکمت عملی جس کا اعلان صدر باراک اوباما نے کیا افغان عوام کے لیے

نوید مسرت ثابت ہوسکتی ہے لیکن اس کے برعکس افغان حکومت کے رہنماؤں کے لیے انتہائی مایوس کن ہوگی جب کہ صدر اوباما کی اعلان کردہ نئی حکمت عملی میں پاکستانی حکمرانوں کے لیے خوشی کے شادیانے بجانے کے کئی مواقع ہیں تو اس میں پاکستان کے غریب عوام کی مایوسیوں اور نامرادیوں کے کئی پہلو نمایاں ہیں۔

حال ہی میں امریکہ نے اس پالیسی کی تیاری کے دوران جب ایک نئی اصطلاح الیف۔ پاک (AF-PAK) یا افغان پاک ایجاد کی تو بہت سارے اہل نظر لوگ یہ سمجھے کہ شاید نئی امریکی پالیسی میں افغانستان اور پاکستان میں جاری دہشت گردی اور بدامنی کو ایک ہی مسئلہ قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے یہ گمان کیا جانے لگا کہ افغانستان اور پاکستان کے مسئلے کو یکساں طور پر حل کرنے کے لیے کوئی راہ نکالی جائے گی لیکن اس خیال کے برعکس اوباما انتظامیہ نے اپنی نئی حکمت عملی اوباما اوورسیز کنٹی جینسی آپریشن (Obama over seas contigencey operation) میں افغانستان کے مسائل کے حل کے لیے علیحدہ اور پاکستان کے مسائل کے حل کے لیے علیحدہ حکمت عملی اپنانے کا اعلان کیا ہے۔

افغان پاک نئی حکمت عملی کے اعلان کے بعد جنوبی ایشیائی امور کے لیے امریکی خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک نے امریکی ٹیلی ویژن چینل بی بی ایس کو انٹرویو دیتے ہوئے اس پالیسی کی سرکاری وضاحت کرتے ہوئے اس امر کو پہلی بار تسلیم کیا کہ افغانستان میں ستر فیصد جنگجوؤں کے امریکہ کے خلاف کوئی دہشت گردانہ عزائم نہیں ہیں اور وہ صرف غیرملکی افواج کو اپنے ملک سے نکالنے کے لیے لڑ رہے ہیں رچرڈ ہالبروک نے امریکہ کی غلطی کو افغان جنگجوؤں کے سر ڈالتے ہوئے کہا کہ انہیں دراصل یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ امریکہ افغانستان میں ایک طویل عرصے تک موجود رہے گا افغان جنگجوؤں کو یہ بات باور کرائی جائے گی کہ امریکہ افغانستان کو القاعدہ سے چھٹکارا دلانے کے بعد وہاں سے نکل جائے گا۔

ہالبروک نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ واشنگٹن اس بات کو بخوبی سمجھ چکا ہے کہ القاعدہ کے ارکان اب پاکستان منتقل ہوچکے ہیں جہاں وہ محفوظ پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ اب افغانستان کی تعمیر و ترقی کو اولیت دے گا۔ واشنگٹن افغانستان کی تعمیر و ترقی کے عمل کے دوران اس بات کو ملحوظ رکھے گا کہ افغانستان دراصل مختلف

ٹکڑوں میں تقسیم عوام کا ایک مجموعہ ہے اس لیے ترقی کے عمل میں حکومت کا مرکزی ڈھانچہ تعمیر کرنے پر زور نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس عمل میں افغانستان کی سابقہ حکمران پارٹی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان (پی ڈی پی اے) سوویت یونین، طالبان انتظامیہ اور بش ایڈمنسٹریشن چاروں ناکام ہو چکے ہیں۔ نئی حکمت عملی کے تحت افغانستان کے مختلف صوبے اور مختلف نسلی گروہ اپنے نمائندوں کا انتخاب اپنی مرضی سے کریں گے اور یہ وعدہ کریں گے کہ اپنی صفوں میں کسی دہشت گرد کو نہیں گھسنے دیں گے اور نہ ہی خواتین اور بچیوں کے حقوق کو پامال کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ افغان پاک نئی حکمت عملی کی ایک اور نمایاں بات یہ ہوگی کہ اب ترقی و استحکام کے عمل میں کرزئی انتظامیہ پر زیادہ انحصار نہیں کیا جائے گا۔ ملک کے انتظامی امور کی نگرانی سویلین مشیروں جنہیں انسپکٹر جنرل کا نام دیا گیا کے سپرد ہوگی کثیر تعداد میں مامور ہونے والے انسپکٹر جنرلز کا بنیادی فرض یہ ہوگا کہ وہ بیرون ملک سے ملنے والی امداد کے صحیح استعمال کی نگرانی کریں گے۔ اس حکمت عملی کے تحت ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ باغی جنگجوؤں میں صرف کٹر مخالفین سے مذاکرات سے اجتناب کیا جائے گا ورنہ سب کو مذاکرات کے لیے راضی کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔

دوسری طرف پاکستان کے لیے اس حکمت عملی کے جو خدوخال وضع کیے گئے ہیں ان میں ساری توجہ دہشت گردی اور جنگجو عناصر پر دی گئی ہے اس پالیسی میں جنگجوؤں سے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ تہذیب کو تباہ کرنے کے درپے ہیں اس لیے جنگجوؤں کا خاتمہ ضروری ہے۔ افغانستان میں اگرچہ بیرونی امداد کے صحیح استعمال سے متعلق ایک واضح میکنزم اختیار کیا گیا ہے لیکن پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف ملنے والی امداد کے صحیح استعمال کی نگرانی کرنے کا کوئی عندیہ نہیں دیا گیا پاکستان میں موجودہ پی پی پی کی حکومت کو دہشت گردی کے خاتمے کے لیے امداد دی جائے گی جو حکومت پاکستان خود مناسب طریقے سے خرچ کرے گی تاہم ایک خیال یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ملنے والی امداد کا صحیح استعمال یقینی نہ بنانے کی صورت میں یہ رقم غلط ہاتھوں میں بھی جا سکتی ہے۔

افغانستان میں امریکہ کی نئی پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماضی کے برعکس امریکہ

اب افغانستان کی تقسیم کا خواہاں نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ امریکی حکمت عملی میں تبدیلی کی اصل وجہ روس کی جانب سے وسطی ایشیائی ریاستوں اور یوریشن ملکوں میں توانائی کے ذخائر اور راستوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنا ہو امریکہ کا خیال ہے کہ افغانستان کی تقسیم کے عمل کے دوران شمالی افغانستان میں قائم کی جانے والی نئی ریاست باآسانی کریملن کے کنٹرول میں چلی جائے گی۔ تاہم نئی امریکی حکمت عملی کی جوبھی وجوہات ہوں افغان عوام کے لیے یہ ایک مژدہ جاں فزاء سے کم نہیں کہ اب ان کا ملک بڑی طاقتوں کی دست برد سے بچ جائے گا۔

+ ..... + ... +

باب 25

ڈرون حملے اور اہم افراد کی ہلاکتیں

دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ میں طالبان، بعض سیاسی قوتوں اور پاکستانی اداروں نے جس امریکی جنگی حکمت عملی کے خلاف مسلسل آواز اٹھا رکھی ہے وہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکی جاسوس طیاروں کی بمباری ہے۔ پاکستان کی جانب سے مختلف فورمز پر احتجاج کیے جانے کے باوجود جاسوس طیاروں کی ٹارگٹ بمباری کا سلسلہ چلتا رہا اور نئے امریکی صدر باراک اوبامہ نے ان حملوں میں اضافہ کر کے پاکستانی حکمرانوں اور تجزیہ نگاروں کی اس خوش فہمی کو خاک میں ملا دیا کہ اوبامہ انتظامیہ نہ صرف یہ کہ پاکستان کو بعض رعایتیں دے گی بلکہ ڈرون حملے بھی بند کر دے گی۔

2004ء سے جاری ڈرون حملوں میں ایک محتاط اندازے کے مطابق 2009ء تک ساڑھے چھ سو افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ ان میں القاعدہ کے ایک درجن اہم افراد کے علاوہ غیر ملکیوں کی بڑی تعداد بھی شامل ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کے مختلف علاقوں جنوبی، شمالی وزیرستان، ایف آر بنوں، مہمند ایجنسی، خیبر ایجنسی، کرم ایجنسی، اورکزئی ایجنسی اور باجوڑ ایجنسی میں اب تک 52 کے قریب ڈرون حملے کیے گئے جبکہ اسی عرصہ کے دوران مجموعی طور پر 118 سے زائد بار پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزیاں کی جا چکی ہیں۔ (یہ اعداد و شمار اپریل 2009ء تک کے ہیں)۔ اعداد و شمار کے مطابق اوبامہ انتظامیہ کے چارج سنبھالنے کے بعد پہلے ڈھائی

مہینوں کے دوران 12 حملے کیے گئے جن کے نتیجے میں 165 افراد جاں بحق ہوئے۔ جن میں حسب معمول غیرملکیوں کے علاوہ 13 سکیورٹی اہلکار بھی شامل تھے۔

ڈرون حملوں کے نتیجے میں سب سے زیادہ جانی نقصان باجوڑ ایجنسی کے علاقے ڈماڈولہ کے ایک مدرسے پر میزائل پھینکنے سے ہوا جس میں بچوں سمیت 85 افراد جاں بحق ہوئے۔ یہ حملہ 13 جنوری 2005ء کو کیا گیا تھا۔ جن دوسرے علاقوں کو ان حملوں کے ذریعے نشانہ بنایا گیا ان میں میرعلی، سیدگے، ورسک، مہمند ایجنسی، انگوراڈہ، باغڑ، زیڑی نور، میران شاہ، لدھا، جانی خیل، دتہ خیل، ایف آر بنوں، بکین، ڈانڈے، ڈماڈولہ (تین حملے ہوئے) اور باڑہ خیبرایجنسی قابل ذکر ہیں۔ پاکستان کی تقریباً سات قبائلی ایجنسیوں میں حملے کیے جاچکے ہیں۔ ان حملوں میں غیرملکیوں اور مقامی طالبان کے علاوہ وہ عام شہری بھی بڑی تعداد میں جاں بحق ہوئے جنہوں نے یا تو القاعدہ، طالبان کمانڈروں کو ٹھکانے فراہم کرکے اپنے ہاں ٹھہرایا ہوا تھا یا وہ حملے والی جگہوں کے قریب رہائش پذیر تھے۔ اس تمام عرصہ میں پاکستانی فضائیہ یا دوسری فورسز نے ایک بار بھی ان جاسوس طیاروں کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جن دوسرے علاقوں میں جاسوس طیارے حملہ کیے بغیر پرواز کرتے دیکھے گئے ان میں ضلع بنوں، ہنگو، سرائے نورنگ، ڈیرہ اسماعیل خان، ٹانک (تقریباً تمام جنوبی اضلاع) اور سوات شامل ہیں۔

غیرملکیوں اور نیک محمد کے علاوہ جس اہم کمانڈر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی وہ جلال الدین حقانی تھے۔ ان کے ایک مدرسے پر میران شاہ (شمالی وزیرستان) میں 8 ستمبر 2008ء کو میزائل پھینکے گئے جس میں بچوں سمیت 21 افراد جاں بحق ہوئے تاہم جلال الدین حقانی بچ گئے۔

امریکی حکام ڈرون حملوں کو اپنی جنگی حکمت عملی کا سب سے مؤثر ہتھیار قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں ان حملوں کے ذریعے امریکہ القاعدہ کے کئی اہم لیڈروں کے علاوہ غیرملکی جنگجوؤں کی بڑی تعداد کو کامیابی سے نشانہ بنا کر بہتر نتائج حاصل کرچکا ہے۔

طالبان کی حکمت عملی ان حملوں کے دوران یہ رہی ہے کہ وہ حملے کے فوراً بعد جائے حادثہ پر پہنچ کر نعشیں اپنی تحویل میں لے کر اپنے ٹھکانوں میں منتقل کردیتے جس کے باعث

امریکی یا پاکستانی حکام کو مصدقہ طور پر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ جاں بحق ہونے والوں میں کون کون سے اہم لوگ شامل ہیں۔

بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ ایسے ہی ایک حملے کے دوران وزیرستان میں القاعدہ نمبر دو ڈاکٹر ایمن الظواہری کو نشانہ بنا کر زخمی کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ نومبر 2008ء کو ہوا تھا۔ انہی دنوں ایک امریکی ٹی وی سی بی ایس نے دعویٰ کیا کہ پاکستان کے انٹیلی جنس اداروں کے کہنے پر پشاور سے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم وزیرستان بھیج کر ایمن الظواہری کا علاج کرایا گیا اس ضمن میں مذکورہ ٹی وی نے بیت اللہ محسود کا پشتو میں لکھا ایک خط بھی دکھایا تھا جس میں انہوں نے پشاور کے ملٹری حکام سے ڈاکٹروں کی ٹیم وزیرستان بھیجنے کے لیے کہا تھا۔

ڈرون حملوں نے نہ صرف یہ کہ پاکستانی حکومت، انٹیلی جنس اداروں اور فوج کی مشکلات میں اضافہ کر کے پاکستان کی خودمختاری اور سلامتی کو سوالیہ نشان بنایا بلکہ ان حملوں نے القاعدہ اور طالبان کمانڈروں کے کسی ایک جگہ پر قیام اور نقل و حرکت کے نظام کو بھی بری طرح متاثر کیا۔

اکتوبر 2008ء کے دوران کرم ایجنسی میں ڈرون حملوں کے خوف نے لوگوں کو اتنا پریشان کر دیا کہ انہوں نے بعض سرحدی گاؤں کے گھروں پر امریکی جھنڈے لگانے جیسا غیر معمولی اقدام بھی اٹھایا بعدازاں پولیٹیکل اور فوجی حکام کی مداخلت پر یہ جھنڈے اتار لیے گئے۔ بعض گھروں پر افغانستان کے پرچم لگانے کی اطلاعات بھی موصول ہوئی تھیں۔

امریکی ڈرون حملوں کا سب سے بڑا ٹارگٹ شمالی وزیرستان رہا جہاں پر سب سے زیادہ حملے کیے گئے۔ 2008ء تک جنوبی وزیرستان کو اس سلسلے میں بڑی حد تک نظرانداز کیا جاتا رہا۔ اس ایجنسی میں ان حملوں میں اس وقت شدت آئی جب تحریک طالبان پاکستان کے امیر بیت اللہ محسود نے غیرملکی سفارتخانوں، شخصیات اور شہروں کو نشانہ بنانے کی نہ صرف دھمکیاں دیں بلکہ بعض بڑے واقعات کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستانی اور امریکی فورسز 2008ء تک بیت اللہ محسود کے خلاف کسی بڑی کارروائی سے گریز کی پالیسی پر عمل پیرا تھیں۔ وہ اس سے قبل نہ صرف یہ کہ وزیرستان کے علاوہ ٹانک، ڈی آئی خان اور ایف آر بنوں کے بعض علاقوں میں آزادانہ نقل و حرکت کرتے دیکھے گئے بلکہ وہ پشاور کے

صحافیوں کے ساتھ چار مختلف مواقع پر پریس کانفرنس کے ذریعے کئی کئی گھنٹوں تک ملتے بھی رہے۔ ان ملاقاتوں نے امریکہ کے ذہن میں یہ سوال پیدا کیا کہ اگر پشاور کے درجنوں صحافی بیت اللہ محسود سے ملاقاتیں کر سکتے ہیں تو پاکستانی خفیہ اداروں اور فورسز نے ان کو گرفتار یا ہلاک کیوں نہیں کیا؟ اس صورتحال نے پاکستان کو دفاعی پوزیشن پر لاکھڑا کردیا۔ اس تمام عرصہ کے دوران بیت اللہ محسود نہ صرف علاقے میں موجود رہے بلکہ وہ وزیرستان میں اپنی سرگرمیوں کے علاوہ غمی شادی کی تقریبات خصوصاً جنازوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔

2008ء کے آخری مہینوں میں ہی ڈرون حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس دوران پاکستان کے خفیہ اداروں کی جانب سے میڈیا کو متعدد القاعدہ، طالبان کمانڈروں کی ہلاکت کی اطلاعات فراہم کرنے کا سلسلہ بھی عروج پر پہنچا۔ جن کمانڈروں کے نام وقتاً فوقتاً لیے جاتے رہے ان میں ڈاکٹر ایمن الظواہری، بیت اللہ محسود، مولانا فضل اللہ اور مولوی عمر سرفہرست تھے۔

2009ء کے دوران امریکہ نے مدارس، کیمپوں اور دوسرے ٹھکانوں کے علاوہ طالبان اور القاعدہ کے مبینہ کمانڈروں کو دوران سفر نشانہ بنانے کے کامیاب تجربے کا آغاز کیا۔ اس سلسلے نے ان لوگوں کی نقل وحرکت کو شدید خطرات سے دوچار کر کے ان کی بے چینی میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ مارچ 2008ء کے بعد طالبان کے علاوہ ان کی ہم خیال مذہبی، سیاسی جماعتوں نے نہ صرف یہ کہ ڈرون حملوں کے خلاف مہم تیز کردی بلکہ بیت اللہ محسود اور دوسروں کی دھمکیوں میں بھی اضافہ کردیا۔

ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ کی طرف سے پاکستان کی سرزمین پر پہلا حملہ 18 جون 2004ء کو ہوا جس میں طالبان کمانڈر مولوی نیک محمد جاں بحق ہوگئے۔ 14 مئی 2005ء کو حملے میں ہاشم الیمنی، یکم دسمبر 2005ء کو شمالی وزیرستان کے صدر مقام میرعلی پر حملے میں مصری نژاد ابوحمزہ ربیعہ، 13 جنوری کو باجوڑ میں ڈاماڈولا میں مدرسے پر میزائل حملے میں 86 افراد جن میں زیادہ تر بچے شامل تھے شہید ہوگئے جبکہ دسمبر میں ڈاماڈولا پر دوسرا حملہ کیا گیا لیکن اس میں جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔

2006ء میں شمالی وزیرستان میں حملے میں افریقہ میں امریکی سفارت خانہ کے بم

دھماکوں میں ملوث محسن موسیٰ متولی عطوہ مارا گیا۔ 26 اپریل کو شمالی وزیرستان کے علاقے سید گے میں حملے میں چار افراد۔ 19 جون 2007ء کو شمالی وزیرستان میں مدرسے پر میزائل حملے میں 30۔2 نومبر کو اسی ایجنسی میں طالبان کے مشتبہ تربیتی مرکز پر حملے میں 10 افراد، 29 جنوری 2008ء کو شمالی وزیرستان میں القاعدہ رہنما اور اسامہ کے نمبر تین ابولیث الکسیبی، 26 فروری 2008ء کو جنوبی وزیرستان کے علاقے اعظم ورسک میں ایک گھر پر جاسوس طیاروں کی بمباری سے 13 مشتبہ جنگجو، 18 مارچ کو جنوبی وزیرستان میں 16 افراد، 14 مئی کو باجوڑ میں ڈاما ڈولا پر تیسرے حملے میں ابوسلیمان الجزیری سمیت 14 افراد، دو جون کو شمالی وزیرستان میں ایک میزائل حملہ کیا گیا لیکن کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، 4 جون 2008ء کو مہمند ایجنسی میں میزائل حملہ میں 10 افراد شہید ہوئے جن میں ایک میجر سمیت 13 فوجی اہلکار شہید ہوئے۔ 11 جولائی کو جنوبی وزیرستان میں انگور اڈہ کے قریب امریکی اور اتحادی افواج کی فائرنگ سے آٹھ پاکستانی فوجی زخمی ہوئے۔

28 جولائی کو جنوبی وزیرستان میں ایک حملے میں القاعدہ کے سرگرم اور کیمیائی ہتھیار بنانے کے ماہر مصری نژاد ابوخباب مصری سمیت سات افراد۔ 13 اگست کو جنوبی وزیرستان کے علاقے وانا سے تیس کلومیٹر دور پاک افغان سرحد کے قریب باغڑ نامی گاؤں میں ملا نذیر گروپ کے ایک ٹھکانے پر چار میزائل گرائے گئے جس میں ایک درجن سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔ 18 اگست کو جنوبی وزیرستان میں انگور اڈہ کے مقام پر سرحد کے اس پار سے داغے گئے میزائل جو ایک گھر پر گرے میں ایک پانچ سالہ بچے کے ساتھ ایک خاتون جاں بحق ہوئی، باڑہ خیبر ایجنسی میں برسرپیکار شدت پسند گروہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مرکزی دفتر پر سرحد پار سے میزائل حملہ کیا گیا جس میں تنظیم کے آٹھ لوگ مارے گئے لیکن ان کا مرکزی امیر بچ گیا جو بعد میں ایک نوعمر کے ہاتھوں مارا گیا۔

20 اگست کو وانا کے نزدیک زیڑی نور کے علاقے میں افغان صوبہ پکتیکا سے فائر کیے گئے میزائل حملے میں 6 افراد مارے گئے جن میں پہلی مرتبہ پنجابی طالبان کے مارے جانے کی اطلاع آئی اور اس کے دس دن بعد اسی علاقے میں دوبارہ افغانستان کے علاقے سے میزائل فائر کیے گئے جس میں مقامی لوگوں کے مطابق دو عرب باشندوں سمیت چار افراد شہید

ہوئے۔ 31 اگست کو شمالی وزیرستان کے صدر مقام میران شاہ سے پندرہ کلومیٹر دور تپی کے مقام پر ایک اور میزائل حملہ ہوا جس میں چار افراد شہید ہوئے تاہم اس بارے میں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مرنے والوں میں کوئی غیر ملکی بھی شامل تھا، تین ستمبر کو جنوبی وزیرستان کے علاقے انگور اڈہ کے دو گاؤں لال خیل اور توجے خیل میں اتحادی افواج پہلی مرتبہ پاکستان کی حدود میں گھس آئیں اور رات کے وقت ہیلی کاپٹروں کے ذریعے بمباری کی جبکہ ایک ہیلی کاپٹر میں سوار فوجی موسیٰ نیکہ کے علاقے میں اتر گئے اور ایک شخص پاؤ جان کے گھر پر اندھادھند فائرنگ کی جس سے تین بچوں اور دو خواتین سمیت (20) افراد جاں بحق ہو گئے۔

اس واقعے کے خلاف قومی اسمبلی نے ایک متفقہ قرارداد بھی منظور کی لیکن اس کے اگلے روز 4 ستمبر کو شمالی وزیرستان کے صدر مقام میران شاہ کے علاقے چار خیل میں افغانستان سے میزائل داغا گیا جس میں پانچ افراد جاں بحق ہوگئے۔

8 ستمبر کو شمالی وزیرستان میں میران شاہ سے چار کلومیٹر دور طالبان کمانڈر مولوی جلال الدین حقانی کے گھر پر حملہ کیا گیا لیکن میزائل ان کے گھر سے قریب ایک مدرسے پر گرا جس میں جلال الدین محفوظ رہے لیکن اس میں تقریباً 20 افراد مارے گئے جن میں مدرسے میں پڑھنے والی بچیاں بھی شامل تھیں۔ 12 ستمبر کو میران شاہ میں 12 افراد، 30 ستمبر کو میر علی میں 6 افراد، 16 اکتوبر کو حملے میں غیر ملکی جنگجو خالد حبیب ابوسلیمان الجزیری، 22 اکتوبر کو میران شاہ کے نزدیک ایک گاؤں میں میزائل داغنے سے 4 عام لوگ، 26 اکتوبر کو جنوبی وزیرستان میں 20 افراد، 31 اکتوبر کو جنوبی وزیرستان میں چار میزائل داغے گئے جس میں القاعدہ کے اہم رہنما ابوعکاش اور خالد حبیب، 14 نومبر کو میران شاہ میں 12 افراد، 22 نومبر کو شمالی وزیرستان میں ایک حملے میں برطانیہ میں حملوں میں ملوث راشد رؤف، القاعدہ کے رہنما ابوزبیر المصری سمیت چار افراد، 22 دسمبر کو جنوبی وزیرستان میں میزائل حملے میں 8 افراد، یکم جنوری کو جنوبی وزیرستان کے علاقے کڑی کوٹ میں حملے میں 4 افراد، 2 جنوری کو مذکورہ علاقے لدھا کے حملے میں بھی چار افراد، 23 جنوری کو شمالی وزیرستان کے علاقے زیرا کی اور جنوبی وزیرستان میں وانا کے قریب دو حملوں میں 20 افراد، 14 فروری کو جنوبی وزیرستان کے علاقے لدھا سے کچھ فاصلے پر ملک خیل میں میزائل حملے میں بعض ازبک جنگجو سمیت 32 عام شہری مارے گئے۔

16 فروری کو کرم ایجنسی میں میزائل داغے گئے جس میں 30 مقامی لوگ، یکم مارچ کو جنوبی وزیرستان میں حملے میں گیارہ افراد جاں بحق ہوگئے۔ 12 مارچ کو کرم ایجنسی میں برجو کے مقام پر مقامی طالبان کے ایک کیمپ پر چند میزائل داغے گئے جس میں چوبیس، پندرہ مارچ کو بندوبستی علاقے بنوں میں جانی خیل کے مقام پر حملے میں چار افراد، 25 مارچ کو جنوبی وزیرستان میں ہونے والے حملے میں سات، 26 مارچ کو شمالی وزیرستان کی تحصیل مکین سے دو کلومیٹر دور مولانا نور محمد کے گھر پر داغے گئے میزائل حملے میں چار۔ جن میں مبینہ طور پر بعض عرب بھی شامل تھے مارے گئے۔ یکم اپریل کو اورکزئی ایجنسی میں پہلا حملہ کیا گیا جس میں 10 افراد، چار اپریل کو شمالی وزیرستان کی تحصیل دتہ خیل کے علاقے ڈانڈا میں مقامی شخص طارق خان کے گھر پر حملے میں 13 افراد جبکہ 8 اپریل کو ہونے والے حملے میں چار افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

باب 26

پاکستان کو میدان جنگ بنانے کی تیاری

حرف آخر میں یہ سوال بے معنی ہوگیا ہے کہ......یہ زہر کس نے پاکستان کی سرزمین پر بویا تھا اور وہ کون لوگ تھے جو سٹریٹیجک ڈیپتھ کے نام پر امریکی مفادات کے لیے سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے'جہاد' کا فلسفہ لے کر میدان جنگ میں اترے اور پھر پوری دنیا کے مجاہدین کو افغانستان اور اس سے ملحقہ پاکستانی علاقوں میں پناہ گاہیں فراہم کرتے رہے......یا پھر......وہ کون لوگ ہیں جو اب ابھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ انگریزوں اور روسیوں کی طرح اپنی مزاحمتی کارروائیوں سے امریکہ اور نیٹو افواج کو بھی افغانستان سے بھاگنے پر مجبور کردیں گے اور وہاں ایک بار پھر''اسلامی حکومت'' قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

اب سوال تو یہ ہے کہ......تیس سال کے عرصہ میں جو کانٹوں بھری جھاڑیاں اور ببول کے درخت اس سرزمین پر پل بڑھ کر جوان ہوگئے ہیں اور انہوں نے مستقبل کا سفر بھی آبلہ پائی سے مشروط کردیا ہے۔ان کا کیا ہوگا؟ کیا وہ روشن مستقبل کے مسافروں کو آگے بڑھنے کا راستہ دیں گے؟؟

کیونکہ......اب بات صرف قبائلی علاقہ جات یا صوبہ سرحد کے بندوبستی اضلاع تک محدود نہیں رہی وہ اپنی نظریاتی طاقت اور ہتھیاروں سے پورے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اپنے اگلے اہداف بھی مقرر کرلیے ہیں کیونکہ چھ سال کی اس جنگ نے ان

کے حوصلے بڑھائے ہیں تو سوات امن معاہدے نے انہیں اخلاقی اور سیاسی قوت بھی فراہم کی ہے تو اس کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ بھی کیا ہے۔

وزیرستان، کرم ایجنسی، باجوڑ اور ملاکنڈ ڈویژن میں طالبان نے اپنی پے در پے کامیابیوں سے جہاں سیاسی قوتوں اور ریاستی اداروں کو مشکلات سے دوچار کرنے کے بعد جس طرح اپنے اہداف کی طرف پیشقدمی کی ہے۔ اس نے القاعدہ اور دوسری بڑی اسلامی تنظیموں پر بھی واضح کر دیا ہے کہ پاکستان میں برسرپیکار طالبان پر اس خطے میں اسلامائزیشن کے حوالے سے میں بڑی حد تک انحصار کیا جا سکتا ہے کیونکہ سوات کے طالبان نے سترہ مہینوں تک علاقے کو اپنے قبضے میں رکھا اور ریاستی ادارے ان کا عملاً کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ قبائلی علاقوں میں برسرپیکار طالبان کے تین گروپوں کے نئے اتحاد کو اسی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے اور طالبان اور اس کی ہم خیال دوسری عسکری تنظیموں کی نئی حکمت عملی اور صف بندی جلد سامنے آنے والی ہے۔ اس ضمن میں معلومات کے مطابق طالبان اس حکمت عملی کا جائزہ لے رہے ہیں کہ عسکری تنظیموں کے مؤثر اتحاد کے بعد ان کی سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک گروپ افغانستان کے طالبان کے ساتھ مل کر امریکہ اور نیٹو کے خلاف کارروائیوں میں حصہ لے گا جبکہ دوسرے پروگرام کے تحت پاکستان کے قبائلی علاقہ جات، ملاکنڈ ڈویژن اور جنوبی اضلاع میں اپنی قوت کو مضبوط کر کے اپنے اثرورسوخ اور دباؤ کو پنجاب، بلوچستان اور سندھ کے مختلف اضلاع تک بڑھایا جائے گا۔

سوات معاہدے کے بعد اچانک بلوچستان کی پشتون بیلٹ میں طالبان کے ہاتھوں مخالفین کو ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے نشانہ بنانے کا سلسلہ تیز ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کامیاب تجربے کے بعد طالبان نے بلوچستان کے پشتون علاقوں میں کارروائیاں شروع کر کے نیا محاذ کھول دیا ہے۔ اسی دباؤ کا نتیجہ ہے کہ جب مارچ کے ابتدائی دنوں میں جے یو آئی (ف) کے صوبائی امیر سینیٹر محمد خان شیرانی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تو کوئٹہ سمیت بلوچستان کے متعدد اضلاع میں ہڑتالیں کی گئیں۔ طالبان کے داخلے ہی کی اطلاعات کا نتیجہ تھا کہ اس ہڑتال میں پشتون قوم پرست پارٹیوں پشتونخوا میپ اور اے این پی کے علاوہ بلوچ قوم پرستوں نے بھی حصہ لیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ بلوچستان کی لیڈرشپ کو معاملات

خراب ہونے کا اندازہ ہوگیا ہے اس لیے وہ متحد ہونے لگے۔

یاد رہے کہ طالبان نے اکتوبر 2008ء کے دوران اے این پی کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر صوبائی حکومت پنجاب کی جانب جنوبی اضلاع اور وادی پشاور کی سرحدوں کو طالبان کی نقل و حرکت کے لیے نرم کردے تو نہ صرف یہ کہ وہ صوبہ سرحد میں جاری اپنی کارروائیاں روک کر پنجاب پر فوکس کردیں گے بلکہ اے این پی کے خلاف کی جانے والی کارروائیاں بھی روک دی جائیں گی تاہم اے این پی نے اس قسم کی کوئی بھی رعایت یا نرمی دینے سے انکار کردیا تھا جس کے بعد صوبہ سرحد کے حالات مزید ابتر بنا دیئے گئے اور اب پنجاب، بلوچستان کو ٹارگٹ بنانے کی تیاری کی جارہی ہے۔

طالبان اور ان کی اتحادی عسکری اور جہادی تنظیموں کی ماضی کی کامیابیاں، نیٹ ورکس، عزائم اور بعض واضح اہداف سے پاکستانی طالبان کے مستقبل کی حکمت عملی اور منزل کا تعین کرنا مشکل نہیں رہا اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ طالبان کی جو تحریک قندھار سے اٹھی تھی اس نے ابھی کئی منازل طے کرنی ہیں۔

القاعدہ، اسلامک موومنٹ آف ازبکستان، تحریک طالبان، کشمیری گروپس اور تورابورا گروپ کے درمیان جن اہم نکات پر مکمل اتفاق اور ہم آہنگی ہے ان میں امریکہ اور اس کے حامیوں کی شدید مزاحمت، امریکہ نواز قوتوں کے خلاف سخت ترین کارروائیاں، خلافت کے فلسفے کی بنیاد پر ایک اسلامی نظام کا قیام اور دیوبندی مسلک کے سوا ہر دوسرے مسالک اور فرقوں کی مخالفت کرنا سرفہرست ہے۔

ان حقائق کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کا مقصد فاٹا یا صرف مالاکنڈ ڈویژن میں کوئی تبدیلی لانے تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی جدوجہد ایک درجن کے قریب ممالک میں اپنے طے کردہ مقاصد کا حصول ہے۔ جن ممالک کو یہ گروپس ہدف بنائے ہوئے ہیں ان میں امریکہ، افغانستان، پاکستان، عراق، سعودی عرب، بھارت تاجکستان، ازبکستان، چیچنیا، بوسنیا اور چین شامل ہیں۔ یہ وہ پس منظر ہے جس کو ذہن میں رکھ کر ہی مالاکنڈ ڈویژن اور صوبہ سرحد کے دوسرے اضلاع میں طالبانائزیشن کی حالیہ لہر کے مقاصد اور نتائج کا تجزیہ کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے محض اس اختلاف کی بنیاد پر اپنی اپنی پاکستان نواز تنظیموں سے ناطے توڑ کر بغاوت کا راستہ اپنایا ہے۔ ان کے لیڈر امریکہ کی مخالفت میں پاکستانی فورسز اور اداروں کو نشانہ بنانے کی مخالفت اور (ان کی نظر میں) جو بھی ریاست، تحریک یا شخصیت امریکہ کے حامیوں اور اتحادیوں کے ساتھ معاونت کرتی تھی ان کے خلاف اسلام سے بغاوت، جاسوسی اور غداری کے قوانین کے تحت کارروائیاں کی جاتی تھیں۔

دیکھا جائے تو ان ہم خیال گروپوں کی نظر میں اعتدال پسندی یا درمیانی راستہ قبول کرنے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ایسے میں یہ کہنا کہ ان کی سرگرمیاں محدود رہیں گی یا لوگ محض نظام عدل کے نفاذ سے مطمئن ہو جائیں گے درست نہیں ہوگا۔ جو لوگ اپنے سخت گیر فلسفے کی بنیاد پر مولوی نذیر، فضل الرحمان خلیل، بخت زمین اور مسعود اظہر جیسی جہادی شخصیات سے اصولوں پر اپنے راستے الگ کر کے اپنی جدوجہد کے لیے ایک اور وژن اپنا لیتے ہیں۔ وہ مولانا صوفی محمد جیسے مقامی لیڈروں پر کیونکر انحصار یا اعتماد کر سکتے ہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب ہی سے ان کے اہداف کا تعین کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔

ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ عالمی جہادی تنظیموں کے ساتھ مشترکہ اہداف اور جدوجہد پر اتفاق کیا ہوا ہے بلکہ ان کے تنظیمی اور عسکری ڈھانچے بھی القاعدہ کی تقلید میں وضع کیے ہیں۔ مثال کے طور پر القاعدہ کے شوریٰ ارکان کی تعداد 12 ہے تو افغانستان اور وزیرستان کے طالبان کی شوریٰ کی تعداد بھی اتنی ہے جبکہ سوات کے طالبان کے شوریٰ کے ارکان بھی 12 ہے۔ دوسرا یہ کہ جہادی تنظیموں کے مقابلے میں اس طبقہ فکر کے جہادیوں کی پالیسی کی بنیاد تشدد کے اصول پر نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ وہ اپنی دلیل منوانے کی بھرپور صلاحیت سے بھی مالا مال ہیں۔

دیوبندی مسلک کے علمبردار ان لوگوں کی نظر میں دوسرے مسلک کے گروپوں کے خلاف بعض اسلامی معاملات پر سخت ترین کارروائیاں نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ لازمی ہوتی ہیں۔ جہاد مخالفین اور امریکہ نواز لوگوں کو ٹھکانے لگانا ان کی ترجیحات میں سرفہرست ہے۔ یہ لوگ تبلیغ سمیت تعویذ گنڈا کے علاوہ پیر پرستی اور مردہ پرستی کے بھی سخت خلاف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ

جاسوسی کے الزام میں ہلاک کیے جانے والوں کے علاوہ تعویذ گنڈا کے عمل میں شامل متعدد لوگوں کو نہ صرف ہلاک کر دیا گیا بلکہ ان مزاروں کو بھی پچھلے کچھ عرصہ کے دوران بموں سے اڑایا گیا جہاں پر معتقدین دعا کرنے آیا کرتے تھے یادرہے کہ 9-2008 کے دوران تعویذ گنڈا کے عمل میں مصروف ایک درجن کے قریب لوگوں کو ہلاک کیا گیا جبکہ چار سے زائد مزاروں کو بھی نشانہ بنایا گیا جن میں رحمٰن بابا اور خوشحال خان خٹک کے مزار بھی شامل ہیں

☆..............☆..............☆

بہرحال اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ انتہا پسندوں کو ریاستی سرپرستی نے اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ اب وہ اپنی آئیڈلوجی کی بنیاد پر ایران کی طرز پر جہاں شیعہ مکتبہ فکر غالب ہے اپنی علیحدہ ریاست کے قیام کی خواہش کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ امریکی اور پاکستانی اداروں نے 1980ء کے دوران پاکستان کے سات ٹریننگ سنٹرز میں جن ایک لاکھ جہادیوں کو تربیت دیکر افغانستان بھیجا تھا انہوں نے گزشتہ تین دہائیوں کے دوران مزید کئی لاکھ جہادی پیدا کیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ جہاد نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ امریکہ کی شکل میں ایک دشمن کی علاقے میں موجودگی نے جہادیوں کا کام اور بھی آسان کر دیا تھا لیکن اب ان جہادیوں کی توجہ کا مرکز افغانستان کے بجائے پاکستان بنتا جا رہا ہے۔ اگر افغانستان کے طالبان امریکا اور نیٹو کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں تو اس کا ایک جواز بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ امریکا نے نہ صرف ان کی حکومت ختم کی بلکہ وہ افغانستان پر قبضے کا ارادہ بھی لے کر آیا ہے۔ تاہم پاکستان کے طالبان کا اس سے زیادہ اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا کہ علاقائی سیاسی عدم استحکام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف دنیا بھر کے عسکریت پسندوں کو محفوظ ٹھکانے فراہم کیے جائیں بلکہ ممکنہ حد تک پاکستانی ریاست میں اپنے شیئرز کو بھی یقینی بنایا جائے۔ اگر ان کے دباؤ اور کامیابیوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور تمام سیاسی، عسکری اور ریاستی قوتیں ان کے خلاف متحد نہ ہوئیں تو پہلے ہی سے توڑ پھوڑ کا شکار پاکستان اپنی سلامتی کے حوالے سے بدترین حالات سے دوچار ہو کر رہ جائے گا۔ سوات معاہدے کے باوجود فاٹا اور صوبہ سرحد کے متعدد اضلاع میں طالبان گروپوں کے مسلسل حملے اور فورسز کے خلاف غیر علانیہ کارروائیوں سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ طالبان نہ صرف یہ کہ پوری قوت سے ریاست کے خلاف کمربستہ ہیں

بلکہ ان کی پرتشدد پالیسیوں اور عملی کارروائیوں میں کوئی کمی واقع ہونے کا امکان بھی فی الحال نظرنہیں آ رہا۔

اس ایشو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ امریکا اس سے پہلے عملاً طالبان کے خلاف کارروائی سے گریز کرتا آیا ہے اور اس سُپر پاور کی تمام توجہ القاعدہ کوختم کرنے پر مرکوز رہی ہے اس کا واضح مطلب ایک نقطہ نظر میں یہی بنتا ہے کہ امریکہ، پاکستان کو طالبان کے ذریعے عدم استحکام سے دوچار کر کے خانہ جنگی یا بغاوت جیسی صورتحال کا راستہ ہموار کرنے کی غیرعلانیہ پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ امریکا جیسے جیسے افغانستان کے طالبان کو کمزور کرتا جائے گا پاکستانی طالبان کی طرف آتا جائے گا اور ان کی سرگرمیاں بڑھتی جائیں گی۔ افغانستان میں امریکی موجودگی کے جواز کے لیے بھی لازم ہے کہ افغانستان اور پاکستان میں طالبان نہ صرف یہ کہ موجود رہیں بلکہ ان کی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ امریکہ کی یہ پالیسی پاکستان کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل کام نہیں۔ جس نئے علاقائی نقشے پر امریکہ اور دوسرے اہم ممالک میں کئی برسوں سے کام جاری ہے اس میں رنگ بھرنے کے لیے پاکستان کو انتہائی حد تک کمزور کرنا اور نان سٹیٹ ایکٹرز کو اور فعال بنانا لازمی ہے اور امریکہ کسی نہ کسی حد تک بظاہر انتہاپسندوں کا دشمن ہوکر بھی اندرون خانہ ان کے لیے پاکستان میں مستقبل کی حکمت عملی کے حوالے سے نرم گوشہ رکھتا آیا ہے۔ امریکہ کی پالیسیوں کو سامنے رکھ کر یہ کوئی انہونی بات نہیں کہ جو طالبان افغانستان میں ان کے دشمن ہیں، ان طالبان کو وہ پاکستان میں کسی اور نظر سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہو۔

معتدل اور تشدد پسند طالبان کی درجہ بندی سے متعلق امریکہ اور پاکستان کی پالیسیوں کا بھی ابھی تک کوئی مثبت اور عملی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں طالبان کی قیادت عملاً تشدد پسند لیڈروں اور کمانڈروں کے ہاتھ ہی میں رہے گی۔ ملاکنڈ، جنوبی اضلاع، قبائلی ایجنسیوں اور بلوچستان میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ کر طالبان کی جانب سے ثابت کیا جارہا ہے کہ ان کا نیٹ ورک بہت فعال اور مضبوط ہے جبکہ ریاستی ادارے عملاً ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

جمہوری حکومت کے قیام اور طالبان کو رعائتیں دینے کے باوجود مارچ 2008ء سے

مارچ 2009ء تک کے عرصے میں پاکستان میں ایک سو بیس سے زائد خودکش اور بم حملے کیے گئے جن میں سینکڑوں لوگ جاں بحق ہوئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حملوں کا سلسلہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا رہا۔ چنانچہ طالبان اور پاکستان کی ریاست کے درمیان جاری کشیدگی کے نتائج کو القاعدہ اور امریکہ کے تعلقات کی نوعیت اور ترجیحات کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان دونوں بڑی قوتوں نے پاکستان ہی کی سرزمین کو اپنی افرادی، ریاستی اور نظریاتی قوت کے آزمانے کے لیے منتخب کیا ہوا ہے۔ پاکستان سے موزوں میدان جنگ ان متحارب قوتوں کے لیے دوسرا کوئی ہے ہی نہیں اور اسی چیز سے وہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔ ڈرون حملوں کے سلسلے کو بلوچستان تک بڑھانے کی امریکی حکمت عملی اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے فاٹا، سرحد اور بلوچستان کو القاعدہ اور دوسری عسکریت پسندوں کے محفوظ ٹھکانوں کا نام دینا اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ پاکستان کے اندر آئندہ چند برسوں میں ایک بڑی جنگ لڑنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس جنگ کے دوران بیرونی قوتوں کے درمیان براہ راست ٹکراؤ کے علاوہ ملک کے اندر انتہاپسندوں اور امن پسندوں کے درمیان خانہ جنگی کی صورت میں تصادم کا خطرناک خدشہ بھی یقینی ہے۔

اس صورتحال کو معروف دانشور اور کالم نویس نذیر ناجی نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''پاکستان کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں مدرسے موجود نہ ہوں اور کوئی مدرسہ ایسا نہیں جہاں کے طلبہ کو طالبان اپنا حامی نہ بنا سکتے ہوں کیونکہ مدرسوں میں جس مسلک کی تعلیم وہ حاصل کرتے ہیں وہ طالبان کے مسلک کے زیادہ قریب ہے۔ نظریاتی اعتبار سے یہ ایک دوسرے کے اتحادی ہیں۔ صرف دہشت گردی کے سوال پر ان میں کچھ فرق ہے۔ مدرسوں کے بیشتر طلبہ دہشت گردی پر یقین نہیں رکھتے لیکن ایسے طلبہ کی بھی کمی نہیں جو آسانی سے طالبان کی حمایت میں نکل سکتے ہیں۔ دہشت گردوں کو اپنے امکانی حامیوں کے ان مراکز کا اچھی طرح علم ہے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے اس سلسلے میں رابطے بھی قائم کر رکھے ہوں۔ ہمیں ایک طویل جنگ کا سامنا ہے۔ یہ بہت خون ریز اور وسیع جنگ ہوگی۔''

22 مارچ کو افغانستان اور پاکستان کے لیے امریکہ کے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک نے کہا کہ پاکستان میں عسکریت پسندوں کی بڑھتی ہوئی قوت امریکہ سمیت پوری دنیا کے لیے بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔ برسلز میں ایک فورم سے خطاب میں ان کا کہنا تھا کہ انتہاپسند افغانستان میں نہیں بلکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو نائن الیون، بے نظیر بھٹو کے قتل، ممبئی حملے اور سوات کے حالات خراب کرنے کے ذمہ دار ہیں اور اب امریکہ اور یورپ پر حملوں کی نئی پلاننگ میں مصروف ہیں۔

22 مارچ ہی کو برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن نے ایک مضمون میں لکھا کہ القاعدہ کا نیٹ ورک افغانستان سے پاکستان منتقل ہوگیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ شمالی پاکستان میں موجود القاعدہ کا مرکز برطانیہ پر حملے کی تیاری میں مصروف ہے اور یہ کہ پاکستان القاعدہ کے علاوہ اس قسم کی دوسری انتہاپسند قوتوں کا بڑا مرکز بن گیا ہے۔ 23 مارچ کو سراج الدین حقانی (ٹی ٹی پی) کا ایک بیان سامنے آیا جس میں کہا گیا کہ امریکہ اور پاکستان مذاکرات کے نام پر طالبان کو تقسیم کرنے کی سازش کررہے ہیں۔ تاہم ایسا ہونے نہیں دیا جائے گا۔

ان دو روز کے دوران امریکہ، برطانیہ اور طالبان کی جانب سے اس قسم کے دعوؤں اور الزامات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مستقبل قریب میں عالمی اور علاقائی متحارب گروپوں کے عزائم کیا ہیں اور اس تمام صورتحال میں پاکستان کے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے اس کا محض تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال یہ بھی لگتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شامل اتحادی ممالک خصوصاً امریکہ اور برطانیہ کے رویے میں نئے امریکی صدر براک حسین اوباما کے حلف اٹھانے کے بعد پاکستان کے طالبان اور القاعدہ سے متعلق پالیسی میں جارحانہ تبدیلی سے ثابت ہورہا ہے کہ دونوں بڑے ممالک اب نہ تو طالبان، القاعدہ کے ساتھ کوئی رعایت برتنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ ہی پاکستان میں بڑھتی ہوئی طالبانائزیشن پر مصلحت یا خاموشی کے کسی آپشن کو افورڈ کرسکتے ہیں۔ مارچ کے آخری ہفتے کے دوران تو یوں محسوس ہوا جیسے یہ دونوں ممالک پاکستانی طالبان اور یہاں موجود القاعدہ ہی کو دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ اور سنگین خطرہ قرار

دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کرنے اور پاکستانی قیادت کے درمیان اس مسئلے پر اتفاق رائے کے فقدان سے ان سنگین خطرات کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے جو اپریل 2009ء کے بعد پاکستان پر منڈلاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں کے بعد بعض بندوبستی اضلاع پر امریکی ڈرون طیاروں کی مسلسل پروازیں، پاک افغان سرحد کی جانب امریکی اور اتحادی فورسز کی پیش قدمی اور بلوچستان میں ڈرون حملوں کی اطلاعات کے زیراثر علاقوں میں مکمل رٹ قائم کرنے کے علاوہ طالبان کو دی جانے والی رعائتوں سے ہاتھ نہیں کھینچے تو امریکہ افغانستان کی طرح پاکستان کو ٹارگٹ بنانے سے گریز نہیں کرے گا۔

برطانیہ کی اس تکرار کو قطعاً نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں برطانیہ اور دوسرے ممالک پر مزید حملوں کی منصوبہ بندیاں کی جارہی ہیں۔ برطانیہ کی جانب سے نواز شریف اور دوسرے لیڈروں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنا کردار ادا کریں۔ پاکستانی قیادت کو مشورے سے زیادہ دھمکی کا تاثر ہے۔ اسی دباؤ کا نتیجہ ہے کہ صدر آصف زرداری نے 23 مارچ 2009ء کو ایک غیر ملکی خبر رساں ادارے کو انٹرویو دیتے ہوئے واضح کیا کہ انہوں نے ابھی تک ملاکنڈ ڈویژن میں نظام عدل ریگولیشن کے مسودے پر دستخط نہیں کیے ہیں ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پاکستان کے کسی علاقے پر طالبان کا کنٹرول نہیں ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

سوات، وزیرستان، درہ آدم خیل اور متعدد دوسرے علاقوں پر عملاً طالبان کا نہ صرف قبضہ تھا بلکہ صوبائی حکومت عسکریت پسندوں کو شیئرز کی بنیاد پر فریق بھی مان چکی تھی۔ لہٰذا عالمی دباؤ، تشویش اور دھمکیوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ سال 2009ء پاکستان کے لیے نئے قسم کے خطرناک چیلنج اور عالمی مزاحمت کے امکانات لے کر پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے بدترین سال ثابت ہو سکتا ہے۔ یاد رہے کہ ادھر اوباما بھی 2009ء کے دوران ہی افغان مسئلہ حل کرنے کا عندیہ دے چکے ہیں۔

حرف آخر میں طالبانائزیشن کے اس طوفان کی تندی اور تیزی کا شمار ان اعداد وشمار سے لگاتے ہوئے ہم اس کے پاکستان کی طرف بڑھنے کی رفتار کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں۔

یکم جنوری 2009ء سے 10 اپریل تک کے 100 دنوں میں خودکش حملوں کے دوران میں 332 افراد لقمہ اجل بنے جن میں سکیورٹی فورسز کے 30 اہلکار تھے جبکہ 302 بے گناہ پاکستانی شہری تھے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں 20 خودکش حملے ہوئے جن میں اوسطاً ہر مہینے 84 افراد موت کی بھینٹ چڑھے یا پھر ہر ہفتے میں 24 افراد کو موت کے حوالے کر دیا گیا جبکہ زخمی ہونے والوں کی تعداد 421 تھی جن میں اکثریت عام شہریوں کی تھی۔

یکم جنوری کے بعد جاں بحق ہونے والے سکیورٹی اہلکاروں میں 18 کا تعلق پاک فوج اور فرنٹیئر کور اور 12 کا تعلق پولیس سے تھا۔ جبکہ جنوری 2009ء میں چار خودکش حملے ہوئے جن میں 21 افراد ہلاک اور 52 زخمی ہوئے۔

فروری کے دوران 7 خودکش دھماکوں میں 118 افراد ہلاک اور 152 زخمی ہوئے۔ مارچ سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ اس مہینے 6 خودکش حملوں میں 130 افراد موت کے گھاٹ اتر گئے اور 147 زخمی ہوئے۔

2009ء کے پہلے 100 دنوں میں سب سے زیادہ خوفناک حملہ جمرود میں نماز جمعہ کے دوران مسجد میں ہوا جس میں درجن بھر سکیورٹی اہلکاروں سمیت 85 نمازی جام شہادت نوش کر گئے۔ اپریل کے پہلے 10 دنوں میں تین خودکش حملے ہوئے جن میں 63 افراد ہلاک اور 64 زخمی ہوئے۔

خودکش حملوں کا سب سے بڑا ہدف صوبہ سرحد رہا۔ جہاں ڈیرہ اسماعیل خان، ہنگورہ، بنوں اور پشاور میں 38 خودکش حملے ہوئے جبکہ فاٹا کے علاقوں میں 6 دھماکے ہوئے۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان اور خیبرایجنسی میں مختلف مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ پنجاب میں 5 خودکش حملے ہوئے جن میں چکوال، راولپنڈی اور ڈیرہ غازی خان میں ایک ایک جبکہ دو دھماکے اسلام آباد میں ہوئے۔ جن میں پہلا حملہ 23 مارچ کو ستارہ مارکیٹ میں سپیشل برانچ ہیڈکوارٹر پر ہوا جبکہ دوسرا حملہ فرنٹیئر کانسٹیبلری کے حفاظتی کیمپ پر ہوا تھا۔

سندھ میں اسی دوران کوئی واقعہ نہیں ہوا جبکہ بلوچستان میں صرف ایک خودکش حملہ ہوا جو جے یو آئی کے زیر اہتمام چلنے والے مدرسہ میں ہوا تھا اس میں چھ افراد مارے گئے تھے۔

تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ.....خودکش حملہ آوروں کا تعلق جنوبی وزیرستان کے محسود قبیلہ سے تھا جس کی قیادت تحریک طالبان پاکستان کے امیر بیت اللہ محسود کے پاس ہے اوران حملوں میں اکثر کی ذمہ داری بیت اللہ محسود نے قبول کی ہے۔

یہ اعداد وشمار کا وہ منظرنامہ ہے جس میں مستقبل کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ کیا چاہتے ہیں اور اپنے مقصد کے لیے کیا کچھ کرسکتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی اب کچھ ایسا مشکل نہیں رہا۔ خدائے بزرگ و برتر پاکستان کواپنی امان میں رکھے۔

باب 27

کاؤنٹر پالیسی ۔ اسباب، کردار اور نتائج

پاکستان نے جہادی عناصر کی تربیت، فنڈنگ اور انہیں استعمال کرنے کی جو پالیسی 80ء کی دہائی میں اپنائی، وہ وقت گزرنے کے ساتھ اس ملک کے لیے فائدے کے بجائے نقصان کا سبب بنتی گئی۔ افغانستان کے جن مجاہد لیڈروں کو پاکستان نے متعارف کروا کے روسی اور اس کے حامی افغان حکمرانوں کے خلاف جنگ میں مکمل تعاون فراہم کیا ان میں سے آج کوئی بھی پاکستان کا کھل کر ساتھ نہیں دے رہا۔ پاکستان کی ناکام افغان پالیسی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ پشتون لیڈر گلبدین حکمت یار کو نائن الیون کے بعد شمالی اتحاد کے سب سے بڑے سپانسر ایران جا کر پناہ لینی پڑی۔ پاکستان کے بجائے ایران اور بھارت کی افغان پالیسی زیادہ سودمند اور پائیدار نظر آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان نے افغان عوام اور سیاسی لیڈرشپ کے بجائے وارلارڈز اٹھانے اور بٹھانے کی پالیسی اپنا کر افغان عوام کو دور رکھا۔ بھارت وہ واحد ملک ہے جس کو افغان عوام ہر دور میں سراہتے آئے ہیں اور اس نے نائن الیون کے بعد افغانستان کی تعمیر نو پر توجہ دیتے ہوئے ایک کھرب روپے کی خطیر سرمایہ کاری کر کے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی پالیسی اپنائی۔ ایران کے بارے میں افغانستان کی پشتون آبادی میں ہر دور میں خدشات کا اظہار کیا جاتا رہا۔ تاہم شمالی اتحاد اور شیعہ آبادی کی صورت میں اس کا ایک مضبوط حلقہ افغانستان میں مستقل طور پر موجود ہے۔

پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا کہ اس کو حقیقی معنوں میں افغانستان کی پشتون

لیڈر شپ کی حمایت بوجوہ میسر نہ آ سکی۔ پاکستانی حکمرانوں نے ڈیورنڈ لائن اور انقلاب ثور کے مسئلے کو اپنے خلاف سخت خطروں کی حیثیت دے کر پشتون لیڈر شپ کے ساتھ معاملات بگاڑنے کی مستقل پالیسی اپنائی حالانکہ افغانستان کی پشتون آبادی ابتداء سے پاکستان کی حامی چلی آ رہی تھی۔

یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ نائن الیون کے بعد افغان عوام کھلے عام کہتے رہے کہ اگر آئی ایس آئی ہی نے افغانستان کو اپنا پانچواں صوبہ بنانے کی حکمت عملی اور خواہش کو پورا کرنا ہے اور افغانستان میں مداخلت کا پاکستانی سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تو اس سے بہتر ہے کہ افغان عوام آئی ایس آئی کے بجائے سی آئی اے کے ساتھ تعاون کر کے پاکستان کی مداخلت سے ممکنہ چھٹکارا پانے کی کوشش کریں۔

پاکستانی علاقوں میں انتہاپسندی اور عسکریت پسندی کے فروغ کو بعض زیرک تجزیہ نگار افغانستان کی جانب سے کاؤنٹر پالیسی کا نام دے کر یہ مؤقف بھی اختیار کیے ہوئے ہیں کہ افغانستان اپنے مستقل اتحادی بھارت کے ساتھ مل کر انتہاپسندی اور طالبانائزیشن کا رخ پاکستان کی طرف موڑنے کی خفیہ حکمت عملی پر عمل پیرا ہو کر آگے بڑھ رہا ہے اور اس ضمن میں وہ پاکستانی طالبان کے بعض اہم کمانڈروں کو کسی تیسرے فریق کے ذریعے معاونت فراہم کر رہا ہے۔

کابل میں یہ تاثر بہت پہلے سے موجود تھا کہ پاکستان کو کاؤنٹر کرنے کے لیے صرف دفاعی حکمت عملی سے کام نہیں چلے گا بلکہ اسکے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے اس پڑوسی ملک کو اندرونی کشمکش سے دوچار کیا جائے۔ اس پالیسی پر کابل میں مختلف اوقات کے دوران کئی بار محتاط انداز میں بحث کی جاتی رہی تاہم اس پر سنجیدگی سے غور کا آغاز اس وقت ہوا جب نائن الیون کے بعد امریکہ نواز افغان حلقوں نے افغانی طالبان اور القاعدہ کو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ٹھکانے فراہم کرنے کے معاملے پر احتجاج کرنا شروع کیا اور پاکستان کے خلاف شکایات بڑھتی گئیں۔ مبصرین کا خیال ہے کہ افغانستان نے پاکستان کی مداخلت کی پالیسی کو خود اس کے خلاف استعمال کرنے کا راستہ اپنا کر کاؤنٹر اٹیک کی حکمت عملی کے تحت پاکستان کی سرزمین پر بعض قوتوں کو سپورٹ فراہم کر کے

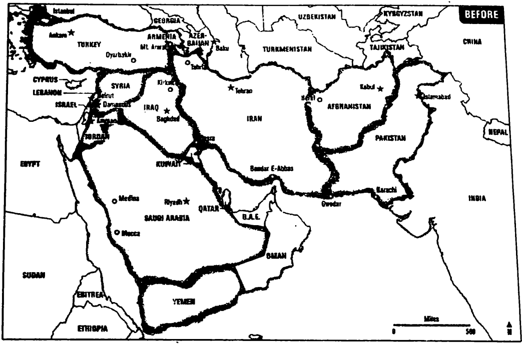

خطے کا موجودہ نقشہ۔

پشتونستان کے پرچم کا عکس۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

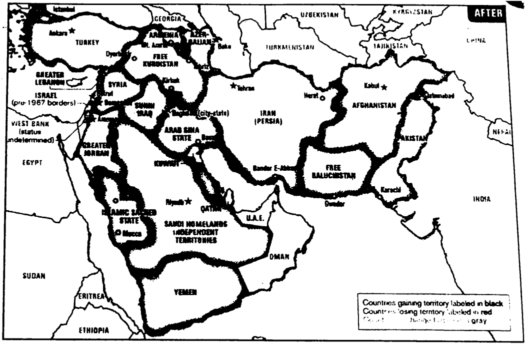

وہ نقشہ جس پر عالمی سطح پر کام جاری ہے

مزاحمتی جنگ کو پاکستانی سرزمین پر لڑنے کا سلسلہ شروع کررکھا ہے اور اس پالیسی کو امریکہ، بھارت اور کسی حد تک ایران کی حمایت بھی حاصل ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افغان طالبان کے ساتھ افغانستان کی بعض سیاسی پارٹیوں کے وہ لوگ بھی شامل ہوگئے تھے جو پشتون نیشنلزم کے علمبردار تھے اور پشتو زبان کے ساتھ روا رکھے گئے منفی رویے کے خلاف طالبان دورِ حکومت سے قبل وقتاً فوقتاً اپنی حکومتوں کے خلاف احتجاج بھی ریکارڈ کراتے تھے۔ یہ لوگ حال ہی میں اعتدال پسند طالبان اور امریکہ کو قریب لانے میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ کابل میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس گروپ کے لوگ پشتونستان کے حامی اور ڈیورنڈ لائن کے سخت مخالف سمجھے جاتے ہیں اور طالبان تحریک کو پشتون نیشنلزم کا ایک ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کو شمالی اتحاد کے مخالفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ طالبان کے حامی بن گئے۔ پاکستان کے خلاف کاؤنٹر پالیسی کی وکالت میں یہ لوگ ہمیشہ سے پیش پیش رہے ہیں۔ اس گروپ کے مؤقف کو طالبان لیڈرشپ کے ان لوگوں کی حمایت حاصل ہے جو پاکستان کے سخت مخالف سمجھے جاتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس ملک نے امریکہ کا ساتھ دے کر طالبان کے ساتھ بے وفائی اور غداری کا ارتکاب کیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ بیت اللہ محسود نے 2008ء کے آخر میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر اے این پی ان کے ساتھ مذاکرات کرکے پنجاب کی جانب ان کی نقل و حرکت میں نرمی کا راستہ اپنائے تو وہ اس پارٹی کے ساتھ معاملات بہتر بنائیں گے۔ اس رابطے اور پیشکش کو اگر کابل کی کاؤنٹر پالیسی کے تناظر میں دیکھا جائے تو بہت سی چیزیں خود بخود واضح ہوجاتی ہیں۔ پنجاب اور سندھ کو طالبان کی جانب سے فوکس کرنے اور ٹارگٹ بنانے کے عمل کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ کابل کا واضح موقف ہے کہ آئی ایس آئی اور پاکستان آرمی مجموعی طور پر پورے ملک نہیں بلکہ پنجاب کے مفادات کا تحفظ کرتی آرہی ہیں۔

بلوچستان میں کابل، دہلی، تہران اور واشنگٹن اپنے اپنے مقاصد کے حصول اور بیجنگ کا راستہ روکنے کے لیے مذہبی حلقوں کے بجائے بلوچ قوم پرستوں کے ساتھ اپنے

معاملات چلاتے آرہے ہیں چونکہ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد میں بلوچستان جیسا آپشن ان ممالک کے پاس موجود نہیں اس لیے اس بات کو قطعی طور پر خارج از امکان نہیں قرار دیا جاسکتا کہ ان ممالک نے متبادل آپشن کے طو پر بعض طالبان گروپوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہوں۔ سوات کے معاملے کو بھی سنجیدہ حلقے گوادر پورٹ کے عالمی ایشو سے منسلک کر کے چین کے خلاف بعض دوسری قوتوں کی حکمت عملی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ایم۔ اے این پی کے مشکوک اور پراسرار کردار کو بھی از سرِ نو سمجھنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بعض حلقے یہ بھی کہتے ہیں کہ افغانی طالبان میں متعدد ایسے رہنما موجود ہیں جو پشتونستان کے قیام کی کھلم کھلا حمایت کر رہے ہیں اور وہ پاکستان کی پشتون آبادی کے حقوق اور مسائل پر بات بھی کرتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو شمالی اتحاد اور ایران کے سخت مخالف سمجھے جاتے تھے۔ اس تمام صورتحال اور کڑیوں کی پیچیدگیاں اپنی جگہ تاہم ان کے اسباب، پس منظر اور حقیقتوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

کرزئی حکومت کے ایک اہم عہدیدار نے 2008ء کو کابل کی ایک نشست کے دوران مصنف کو خود بتایا کہ اب پاکستان کو ہر ممکن طریقے سے اس کے اندرونی معاملات میں الجھا کر افغانستان کی گلوخلاصی کو ممکن بنانے کا وقت آگیا ہے۔ ''ہر ممکن طریقے'' میں طالبان کو استعمال کرنے کے آپشن کے خدوخال کسی نہ کسی حد تک خود بخود واضح ہوجاتے ہیں۔ مذکورہ عہدیدار نے دعویٰ کیا تھا کہ آئی ایس آئی نے افغانستان میں پاکستانی مداخلت کا فارمولہ مرہٹوں کی ایک حکمت عملی سے اخذ کیا ہوا تھا۔ اس فارمولے کے تحت قندھار اور کابل کی مہم جوئی سے برصغیر کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ ان دوشہروں کو اندرونی معاملات میں اس طرح الجھایا جائے کہ وہ ہندوستان (اس وقت) پر چڑھائی کا اپنا روائتی سلسلہ ترک کردیں۔

مذکورہ حکومتی عہدیدار نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ احمد شاہ ابدالی نے جب مرہٹوں پر حملوں کا سلسلہ تیز کیا تو مرہٹوں کے چند زیرک اور ذہین افراد نے اپنے سرداروں کو مشورہ دیا کہ اگر وہ افغانیوں کے حملوں اور خوف سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ افغانوں کو لشکرکشی سے قبل قندھار کی سرحد پر روک دیا جائے اور ان کو ان کی تیاری سے قبل سرحد کے اندر جاکر پریشان کیا جائے۔ عہدیدار کے مطابق یہی پالیسی بعد میں سکھوں،

انگریزوں اور دوسری عسکری قوتوں نے بھی اپنائے رکھی اور اسی پالیسی کی بنیاد پر آئی ایس آئی نے پاکستان کی حکمت عملی کو آگے بڑھایا۔ اس عہدیدار کے علاوہ افغانستان میں ایسے بے شمار صاحب الرائے لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ پاکستان کی دخل اندازی اور مبینہ گڑبڑ کا راستہ روکنے کے لیے ایسی قوتوں کو پاکستان کے خلاف استعمال کیا جائے جو کہ پاکستانی ریاستی، اداروں خصوصاً سکیورٹی فورسز کو الجھائے رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔

افغانستان نے سردار داؤد خان سے لے کر ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومتوں کے ادوار پر مشتمل لمبے عرصے کے دوران پاکستان کے پشتون اور بلوچ قوم پرستوں کے ذریعے اس ریاست پر دباؤ ڈالنے کے لیے متعدد بار کوششیں کیں مگر اس کے وہ نتائج برآمد نہ ہو سکے جن کی توقع تھی۔ پشتون قوم پرست عملاً افغانستان کے بجائے پاکستان کے زیادہ وفادار ثابت ہوئے حالانکہ زبانی کلامی طور پر وہ ڈیورنڈ لائن کو مستقل سرحد نہ ماننے کا تاثر دیکر لڑاؤ بریو افغان کا نعرہ لگاتے رہے اور پشتونستان کے قیام کی خواہش کا اظہار بھی کرتے رہے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ظاہر شاہ، سردار داؤد خان، نور محمد ترہ کئی، ببرک کارمل اور ڈاکٹر نجیب اللہ جیسے افغان حکمران ایک مستقل پالیسی کے تحت پاکستان کے پشتونوں اور بلوچوں کے حقوق کے حوالے سے وقتاً فوقتاً آواز اٹھاتے رہے۔ سردار داؤد نے تو ڈیورنڈ لائن پر انتہائی سخت رویہ اپناتے ہوئے متعدد بار یہاں تک کہا کہ پاکستان نے جہلم تک کے علاقے پر قابض رہ کر پشتونوں کے استحصال کا راستہ اپنایا ہوا ہے۔ بھٹو دور حکومت میں سردار داؤد کے دورہ اسلام آباد کے دوران جب گرمی کے موسم کے باعث کابل کو یہ اطلاع دے دی گئی کہ دونوں سربراہوں کی ملاقات ہزارہ ڈویژن کی نتھیا گلی میں ہوگی تو سردار داؤد نے ایک نجی محفل میں یہ کہہ کر سب کو حیران کردیا کہ میں پاکستانی وزیراعظم کے ساتھ افغانستان کے ایک صوبے میں ملاقات کیسے کرسکتا ہوں؟

ڈیورنڈ لائن کے مسئلے، پاکستانی پشتونوں کے معاملات میں افغانوں کی غیر معمولی دلچسپی اور پاک فوج خصوصاً آئی ایس آئی سے متعلق افغانستان کے خدشات جیسے ایشوز کو بار بار دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ مجموعی طور پر ان ایشوز پر ہی پر پاک افغان تعلقات کا انحصار رہا ہے اور موجودہ حالات اور کشیدگی پر بحث کرتے وقت بھی ان تین بنیادی ایشوز کو نظرانداز

کر کے مستقبل کے تعلقات، تبدیلیوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

کاؤنٹر پالیسی پر عمل درآمد امریکی آمد سے قبل اس لیے ممکن نہیں تھا کہ افغانستان 1980ء کے بعد براہ راست جنگوں کی زد میں چلا آ رہا تھا۔ افغان حکمرانوں اور سیاستدانوں کو پاکستان کے جمہوری حکمرانوں سے مثبت تبدیلی کی امید بھی اس راستے کی رکاوٹ تھی اور ان کو یہ بھی توقع تھی کہ امریکہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پاکستان کو اس کی یکطرفہ افغان پالیسی پر نظر ثانی کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس ضمن میں شہید محترمہ بے نظیر بھٹو، حامد کرزئی، اسفندیار ولی خان اور محمود خان اچکزئی کے درمیان بعد از مشرف دور کی ایک پالیسی پر کام بھی ہو چکا تھا۔ بی بی کی شہادت نے اس پالیسی یا اتفاق رائے کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اسی اتفاق رائے کا نتیجہ تھا کہ نومنتخب پاکستانی صدر آصف علی زرداری نے حامد کرزئی کو اپنی تقریب حلف برداری میں مدعو کر کے جہاں ایک اچھا پیغام دینا چاہا وہاں پاکستان کے جہادی عناصر اور تجزیہ نگاروں کی مخالفت بھی مول لی۔ اے این پی اور پی پی پی کی انڈرسٹینڈنگ اور حکومتی اتحاد کو بھی اسی انڈرسٹینڈنگ کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس تمام پیشرفت کے باوجود جب اے این پی اور پی پی پی کی قیادت خارجہ پالیسی کی تبدیلی لانے میں ناکام رہی اور عملاً پرانی پالیسیاں چلتی رہیں تو افغان سیاستدانوں اور حکمرانوں کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی اور انہوں نے امریکہ کے ساتھ مل کر دوسرے امکانات پر عمل درآمد کرنا شروع کیا۔

پشاور میں موجود ایک افغان سفارتکار سے آف دی ریکارڈ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ ان کو اے این پی کے سربراہ اسفندیار ولی خان کا وہ ٹی وی انٹرویو سن کر اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آئی ایس آئی نہ تو افغان معاملات میں مداخلت کر رہی ہے اور نہ ہی یہ ایجنسی طالبان کو سپورٹ کر رہی ہے۔ مذکورہ شخص کے مطابق اسفندیار سمیت بہت سے قوم پرستوں کا رویہ منافقانہ اور تضادات پر مبنی رہا ہے۔ اس قسم کے خدشات کے اظہار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ کاؤنٹر پالیسی کو عملی بنانے کا آغاز کیا جا چکا ہے اور اس کھیل میں سی آئی اے براہ راست ملوث ہے۔ اس پالیسی کے آغاز اور کامیابی میں ان کابل بیسڈ طالبان کا بڑا ہاتھ ہے جو ماضی میں افغانستان کی تین بڑی سیاسی پارٹیوں خلق، پرچم اور افغان ملت کے ساتھ وابستہ تھے۔

افغان مجاہدین کے بعد طالبان کا بھی اثر سے نکلنے اور امریکی دباؤ نے پاکستان کو شدید مشکلات اور پیچیدگیوں سے جس انداز میں دوچار کیا ہے اس کا اندازہ پاکستانی حکومت اور عسکری قیادت کی قلابازیوں اور بے چینی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک افغان پارلیمنٹیرین نے مارچ 2009ء کے آخری ہفتے میں اسلام آباد میں ہونے والی ایک ملاقات کے دوران مصنف کے سامنے انکشاف کیا کہ ان کو یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ پاکستانی صدر کو ان کے وفد کے دوسرے ارکان نے ایک ملاقات کے دوران (اسلام آباد میں) جب وہ لاپتہ افغان سفیر عبدالخالق فراحی کے سراغ لگانے کی درخواست کی تو صدر موصوف نے اتنے بڑے واقعے کی تفصیلات اور حکومتی اقدامات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لازمی بات ہے کہ جب اے این پی اور پی پی پی کی حکومت تین، چار مہینے گزرنے کے باوجود افغانستان کے سفیر کا سراغ نہیں لگا سکتی تو افغان عوام ان پارٹیوں اور ان کی حکومت سے کسی اور پیشرفت کی توقع کیونکر کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کے لیے مواد اور معلومات اکٹھے کرنے کے دوران ٹانک کا دورہ کرتے وقت ایک طالبان کمانڈر سے بات چیت کا موقع ملا تو اس کا کہنا تھا کہ طالبان کے کئی اہم رہنما پشتون نیشنلزم کے حامی ہیں اور ان کو افغانستان اور پاکستان دونوں ممالک میں پشتونوں کے ساتھ ہونے والی سیاسی اور اقتصادی زیادتیوں پر تشویش لاحق ہے۔

مذکورہ کمانڈر کا کہنا تھا کہ ماضی میں آزادی اور حقوق کی جتنی جدوجہد ہوئی اور جتنی لڑائیاں لڑی گئیں ان سب میں مذہبی اور قوم پرست حلقے ایک دوسرے کے ساتھ مذہب اور قوم پرستی کے فارمولے پر اتحاد کر کے جدوجہد کرتے رہے تاہم یہ سلسلہ قوم پرستوں کے عدم تعاون اور مخالفت کے باعث جاری نہیں رہ سکا۔ اس سلسلے میں انہوں نے خوشحال خٹک، فقیر آف اپی، حاجی صاحب ترنگزئی، باچاخان، سرنور فقیر اور دوسرے اہم رہنماؤں کی مثالیں دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ 1947ء کی قرارداد بنوں کے محرک کسی قوم پرست لیڈر کے بجائے فقیر آف اپی ہی تھے جس میں آزاد پشتونستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس موقع پر بتایا کہ افغانستان اور پاکستان کے پشتونوں کو متحد کرنا امریکی ایجنٹوں اور نام نہاد قوم پرستوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام ہم ہی پورا کریں گے۔

ان تمام واقعات، تاثرات اور اسباب سے جہاں موجودہ طالبانائزیشن سے متعلق

بعض دیگر پہلوؤں پر سے پردہ اٹھ سکتا ہے وہاں یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ طالبان سمیت بعض عالمی اور علاقائی قوتیں اس پیچیدہ صورتحال میں اندرون خانہ متعدد دوسرے امکانات پر بھی تیزی سے کام کرتے دکھائی دے رہی ہیں۔سوال یہ ہے کہ اگر پیپلز پارٹی اور اے این پی جیسی سیکولر اور ڈیموکریٹک پارٹیوں نے افغان اور قبائلی عوام کا اعتماد کھو دیا اور طالبان نے اپنی سخت گیر پالیسی پر نظرثانی کر کے پشتون قوم پرستی سے متعلق ایشوز کو اپنی تحریک کے اندر جذب کر لیا تو اس سے پیدا شدہ صورتحال کیا رخ اختیار کرے گی اور یہ پارٹیاں کہاں کھڑی نظر آئیں گی؟ موجودہ تناظر میں اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز کرنا یقیناً حماقت ہوگی۔

دیکھا جائے تو پاکستان کے تجزیہ نگار، سیاسی رہنما اور ریاستی حکام امریکہ کے حامی اور مخالف دونوں افغان فریقین کو ان کی رائے اور پالیسی کے بجائے اپنے مخصوص چشمے سے ہی دیکھنے کے رویے پر عمل پیرا ہیں۔ یہاں یا تو طالبان کے حامی پائے جاتے ہیں یا مخالف۔ کسی نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ افغان عوام، ان کے دوسرے نمائندوں اور دانشوروں سے ان کی رائے معلوم کی جائے اور ان ایشوز پر بات کی جائے جن پر طالبان، ان کے مخالفین اور سب سے بڑھ کر افغان عوام دیگر اختلافات کے برعکس متفق ہیں۔ پاکستانیوں نے یہی رویہ سقوط ڈھاکہ کے وقت بھی اپنایا ہوا تھا۔ یکطرفہ تجزیوں اور پراپیگنڈے کے دوران عوامی لیگ اور بھارت کی مخالفت میں بنگالی عوام کی رائے اور خواہش کو نظر انداز کرنے کی وہی پالیسی افغانستان اور فاٹا میں بھی دہرائی جا رہی ہے۔ ہم ان افغان عوام کو کیسے بھول سکتے ہیں جنہوں نے انتہائی پرامن اور آزادانہ ماحول میں افغانستان کی تاریخ کے پہلے پارلیمانی انتخابات کے دوران امریکہ کی موجودگی کے باوجود اپنے ووٹ پول کیے اور پارلیمینٹ قائم کی۔ ایک ایسی پارلیمینٹ جس میں امریکہ کے حامی بھی موجود ہیں۔ طالبان کے ساتھی بھی اور افغان مجاہدین کے نمائندے بھی۔ ہم ابھی تک روس اور امریکہ کے درمیان فرق، ماحول کی تبدیلی اور واقعات کے تجربات کا بھی درست تجزیہ کرنے میں ناکام ہیں۔ پاکستانی صحافیوں اور تجزیہ نگاروں کی واضح اکثریت افغانستان اور فاٹا کو دیکھے بغیر یہاں کے عوام کی ترجمانی کی اپنے انداز اور فکر کے مطابق تشریح کر کے اپنے ملک کے ساتھ بھی زیادتی کا ارتکاب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب تک ہم حقیقت کا سامنا کر[illegible]نے کے بجا[illegible] اطلاعات، تجزیوں اور سب

سے بڑھ کر اپنی نظریاتی اور شخصی خواہشات کی بنیاد پر افغانستان، فاٹا اور صوبہ سرحد سے متعلق امور پر غیر فطری رویہ اپنائے رکھیں گے اپنے ملک کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچانے کا راستہ ہموار کرتے رہیں گے۔

ہم نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ فریقین کے علاوہ اس شورش زدہ خطے کے عوام کی اکثریت کیا چاہتی ہے؟ ہم افغانیوں کے بارے میں یہ حقیقت بھی بھول رہے ہیں کہ روسی افواج کی مکمل واپسی کے بعد ڈاکٹر نجیب اللہ اور ان کی فورسز نے عوام کے ساتھ مل کر گلبدین حکمت یار اور جنرل حمید گل کے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیا تھا کہ مجاہدین روس کی واپسی کے بعد ستر گھنٹوں کے اندر کابل کے حکمرانوں کو بھگا دیں گے۔ اس ضمن میں ہم ثمرخیل (جلال آباد) میں نجیب اللہ اور مجاہدین کے درمیان لڑی جانے والی اس جنگ کی حقیقت بھی بھول رہے ہیں جس کے دوران مجاہدین کے چھ ہزار جنگجوؤں کو مارا گیا اور عالمی میڈیا کے سامنے پاکستانی فوجیوں اور افسران کی وردیاں بھی دکھائی گئیں۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ پاکستان نے افغانستان اور فاٹا کے عوام کے ساتھ سیاسی عمل اور قوتوں کے بجائے خفیہ اداروں اور عسکری قیادت پر انحصار کر کے 1980ء سے لے کر اب تک کے تمام عرصہ کے دوران اس پالیسی پر عملاً کوئی نظر ثانی نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ افغانستان اور قبائلی علاقوں کے عوام کے علاوہ وہ قوتیں بھی پاکستان سے دور ہوتی گئیں جو کسی زمانے میں پاکستان کی زبردست حامی تھیں۔ اس ضمن میں اگر بار بار افغان مجاہدین اور طالبان کا ذکر کیا جائے تو یہ تکرار نہیں بلکہ حقیقت ہوگی۔

✦ ...... ✦ ...... ✦

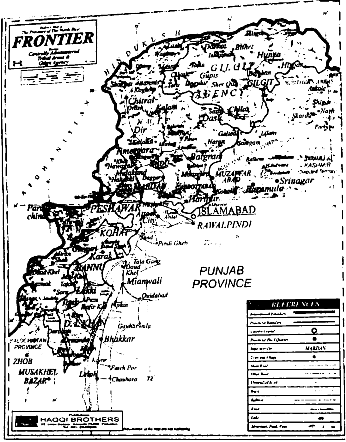
FRONTIER
HINDU KUSH
AFGHANISTAN
Hunza
GILGIT
AGENCY
Chitral
Dir
Balgran
MUZAFFAR ABAD
Srinagar
KASHMIR
PESHAWAR
ISLAMABAD
RAWALPINDI
KOHAT
Karak
BANNU
Mianwali
PUNJAB
PROVINCE
D.I.KHAN
Bhakkar
ZHOB
MUSAKHEL BAZAR
Layyah
Chavhara
REFERENCES
MARDAN
HAQQI BROTHERS

ماہنامہ لیکوال عکس۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دہلی: راجیو گاندھی باچا خان کی گود میں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حامد کرزائی، اسفندیار ولی، اجمل خٹک، نسیم ولی خان، عبداللہ عبداللہ اور دوسرے

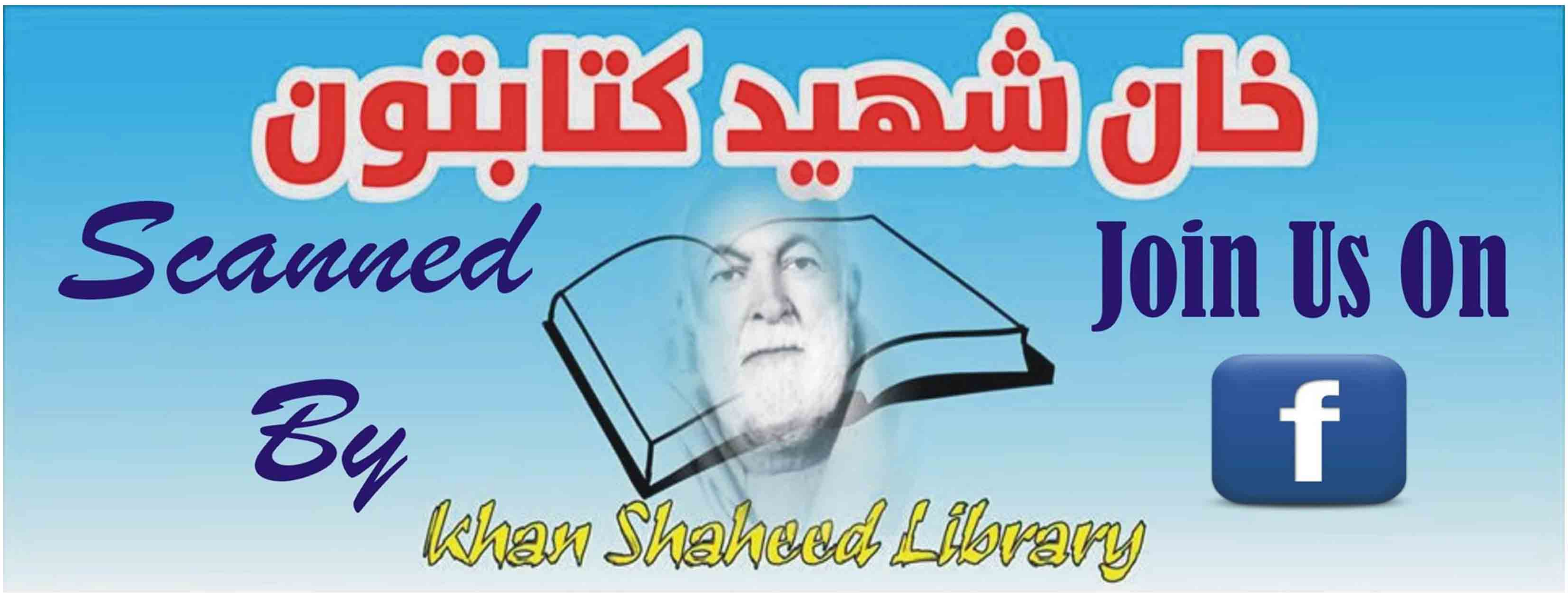

Blog:
www.kitaboona.blogspot.com

Twitter:
https://twitter.com/Kitaboona

Facebook Group:
/Kitaboona-1563796700518091

Facebook Page:
/groups/khanshaheedlibrary

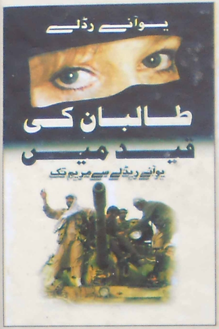

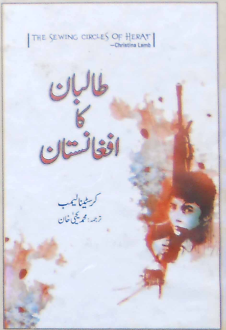

نگارشات پبلشرز
24 مزنگ روڈ، لاہور پاکستان | الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
Ph: 0092-42-7322892 Fax: 7354205 | Ph: 0092-42-5014066 Fax: 7354205
E-mail: nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com